قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

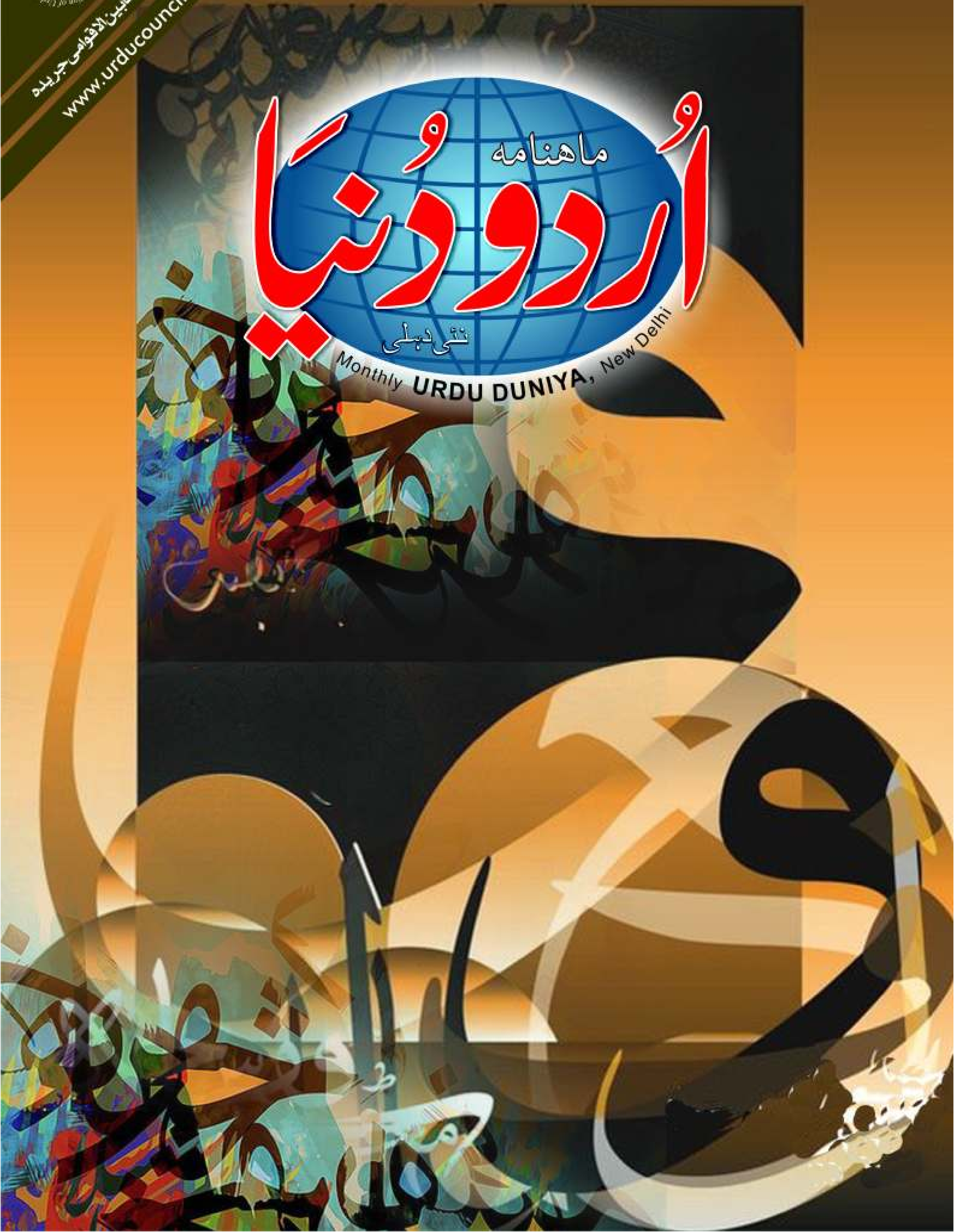

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

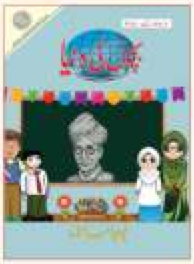

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

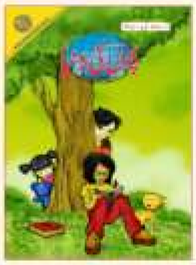

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

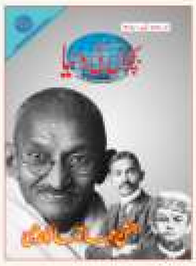

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ
اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21،شمارہ:04،اپریل 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل،محکمہ اعلیٰ تعلیم،حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II،نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبہ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22،تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

تعمیریت اور زبان کی تدریس محمد قمر سلیم 7

نقد و نگاہ

دکنی شاعری میں تلمیحات محمد نذیر احمد 9
اردو رباعی،اخلاقی قدریں اور ان کی عصری معنویت محمد اسلم فاروقی 12
علامہ شبلی اور جدید عربی زبان قمر اقبال 16
اردو املا اور زبان وقواعد کی اصلاح میں رشید حسن خاں کا کردار محمد خالد ظہیر 19

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا حصہ پی کے عبدالحمید 23
لسان القوم صفی لکھنوی فوزیہ خانم 25
امیر خسرو کے ہندوی کلام کی معنویت ذاکر حسین ذاکر 27
شکیب جلالی کی غزلوں میں عصری حسیت سلیم انور 30

زبان اور زمینی صورت حال

ہر محلے میں اردو کی تعلیم کا نظم کیا جائے ناظم علی 33

ادب اطفال

ادب اطفال ایک دشت امکاں سلیم محی الدین 35
عصر حاضر میں بچوں کی کہانیاں اسرار الحق سبیلی 38

یاد رفتگاں

پروفیسر ظہورالدین ایک ہمہ جہت شخصیت محمد زبیر 42

شخصیت

شان الحق حقی محمد فرحان دیوان 45

ہم نے جنھیں بھلا دیا

عمر قریشی شمشاد احمد 49

عالمی ادبیات

ارنسٹ ہیمنگوے اقبال برکی 51

سلسلۂ صحافت

سوشل میڈیا اور اردو زبان حسام الدین فاروقی 53

نیا آسماں، نئے ستارے

رپورتاژ نگاری محمد رضا 55

سائنس

آبی جانوروں کی دلچسپ دنیا رفیع الدین ناصر 58
مصنوعی ذہانت اور اس کے استعمالات نسیم سعید 60

کوئز

ادبی کوئز محمد اسماعیل 63

کمپیوٹر

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا 65

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ ادارہ 69

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 78

ہماری بات

دنیا کی ہر زبان خوبصورت ہے اور ایک دوسرے کے جذبات و احساسات، تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کا ذریعہ بھی۔ دنیا کی تمام زبانوں کے درمیان کچھ چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، تمام زبانوں کی روح ایک جیسی ہوتی ہے اور زبانیں توڑنے کے بجائے جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ افراد و اقوام میں رابطے کا ذریعہ یہی زبان ہوتی ہے اور زبان ہی کسی ملک کی تہذیب اور ثقافت کی سفیر ہوتی ہے۔ اردو بھی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی تہذیبی روح کو پوری دنیا میں پھیلا رہی ہے۔ اس زبان میں ہندوستانی اساطیر، علامات، استعارے ہیں اور وہ سارے عناصر بھی جو ہندوستانیت سے مربوط ہیں۔

اردو زبان کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی پرورش و پرداخت میں ہندوستان کے تمام طبقات کا لہو شامل رہا ہے اور فطری طور پر یہ عوامی اور جمہوری زبان ہے۔ اس زبان کی تشکیل میں عوامی بولیوں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ یہ مختلف زبانوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے اردو زبان میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں کی اصطلاحات اور الفاظ بھی ملتے ہیں اور یہی اس زبان کا حسن ہے۔ اس زبان پر کسی قوم یا مذہب کی اجارہ داری نہیں ہے کہ اس کے بنیاد گزاروں میں وہ نام بھی شامل رہے ہیں جن کا تعلق غیر مسلم طبقے سے ہے اور یوں بھی ماضی میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک ہی رہی ہیں۔ دونوں کی قواعد مشترک ہے، شبداولی ایک ہے اور دو تہائی سے زیادہ الفاظ اردو میں ہندی اور سنسکرت کے ہیں۔ اردو کسی خاص مذہب یا قوم کی زبان نہیں ہے۔ یہ اگر صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی جیسا کہ ان دنوں تصور عام ہے تو بنگلہ دیش اور دیگر مسلم ممالک کے لوگ بھی اردو زبان میں ہی بات کرتے۔ خود ہندوستان میں بہت سے علاقے ہیں جہاں کے مسلمان اردو سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس لیے اردو کو کسی مذہب، قوم یا جغرافیے میں قید نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی زبان اور ہماری مشترکہ وراثت ہے۔ زبانوں کا تعلق مذہب سے نہیں کلچر سے ہوتا ہے اور ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو کثیر تہذیبی ملک کی حیثیت سے پوری دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔

اردو زبان نے ہندوستان سے لے کر پوری دنیا تک کا سفر اپنی داخلی قوت کی بنیاد پر کیا ہے۔ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری دنیا میں اردو زبان کی دھوم ہے اور مختلف ملکوں میں اس زبان کی تعلیم و تدریس اور تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ اردو زبان کے شعرا اور ادبا کے حوالے سے تحقیقات ہو رہی ہیں اور نئے نئے زاویے بھی تلاش کیے جا رہے ہیں اور یقینی طور پر اردو کا جو فکری، علمی اور تہذیبی سرمایہ ہے وہ دوسری زبانوں کے دانش وروں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ دوسری زبانوں کے ذریعے بھی اس زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، فارسی، عربی اور دیگر عالمی زبانوں میں اردو کی شاہکار تخلیقات کے ترجمے ہو رہے ہیں اور اردو میں بھی ان زبانوں کا سرمایہ منتقل ہو رہا ہے۔ یہ اردو کے لیے خوش آئند بات ہے۔

اردو یقینی طور پر پوری دنیا میں پھل پھول رہی ہے اور اردو کی نئی بستیاں بھی آباد ہو رہی ہیں۔ مگر ڈیجیٹل ایج میں جہاں دوسری زبانوں کے ساتھ بہت ساری دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں وہیں ٹیکنالوجی کے عہد میں اردو کا تحفظ بھی ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ چونکہ مستقبل کا ترسیلی میڈیم اب ڈیجیٹل ہوتا جا رہا ہے اور انسانی آبادی کا ایک بڑا حصہ ڈیجیٹل میڈیا سے جڑ گیا ہے۔ ایسے میں اردو کو ڈیجیٹل میڈیا سے جوڑنا بہت ضروری ہے اور بہت حد تک اردو اس میڈیا سے جڑ بھی گئی ہے مگر رسم الخط کی سطح پر ابھی بھی اس کے ساتھ کچھ دقتیں ہیں کیونکہ ڈیجیٹل میں خط نسخ کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے اردو کا وہ حسن نکھر کر سامنے نہیں آتا ہے جو نستعلیق میں ہے۔ اسی لیے اس وقت ضرورت ہے کہ ڈیجیٹل عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس پر بھی توجہ دی جائے اور ڈیجیٹل سے اردو کو جوڑنے کے جتنے بھی ذرائع ہو سکتے ہیں انھیں استعمال کیا جائے۔ اس طرح ہماری زبان جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوگی تو ہمارا دائرہ اور بھی وسیع ہو سکتا ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद
National Council for Promotion of Urdu Language

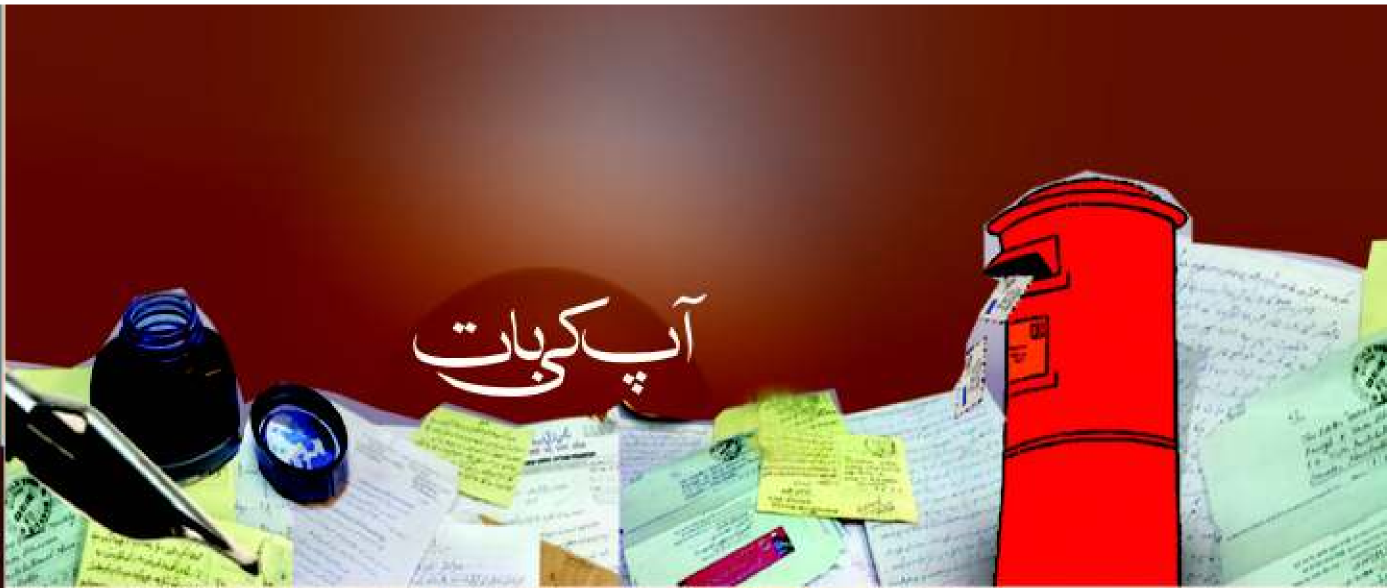

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2019 کا شمارہ اپنی روایتی خوبصورتی کے ساتھ ہمدست ہوا۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی تبھی سے انسان مسلسل اسے خوبصورت بنانے کی جدوجہد کر رہا ہے اور انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ رہا ہے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے مثبت پہلو اتنے ہیں کہ اس کے منفی پہلو کو درگزر کیا جاسکتا ہے۔ اداریہ میں آپ نے بجا فرمایا ہے کہ سائنسی ترقیات اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہمیں بہت سی سہولیات میسر ہیں۔ لسانیات پر اردو ادب میں خاصا کام ہوا ہے ڈاکٹر عبدالحی صاحب کا مرزا خلیل بیگ سے انٹرویو پڑھ کر اس کا پتہ چلا۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب انٹرویو لینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کا کوئی بھی گوشہ چھوڑا نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہی آدمی اچھے سوال کرسکتا ہے جس نے اس موضوع پر مہارت حاصل کی ہوگی۔ یہ انٹرویو قابل ستائش ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ شاذلی حسن خان کا مضمون 'اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط اکتساب' بھی تعلیمی اداروں میں طلبا اور اساتذہ کو تعلیم حاصل کرنے کے نئے در کھولنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اشفاق حسین صدیقی نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی اور ان کے کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، بقیہ مضامین بھی نایاب اور دستاویزی ہیں۔ کمپیوٹر کورس کے تحت بھی اردو زبان کو کمپیوٹر کی تعلیم سے مالا مال کر رہے ہیں یہ اردو کی بڑی خدمت ہے۔ آخری صفحوں پر بولتی ہوئی تصویریں عالمی اردو نامہ اور قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں سے روشناس کراتی ہیں۔

عبدالحی انصاری: پیر ولی بازار، ضلع گورکھپوری، یوپی

'اردو دنیا' فروری کا شمارہ، بالخصوص، سرورق اردو رسم الخط کے نمونے اور معیاری مشمولات کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا ہے۔ آغاز میں ہی نائب مدیر ڈاکٹر

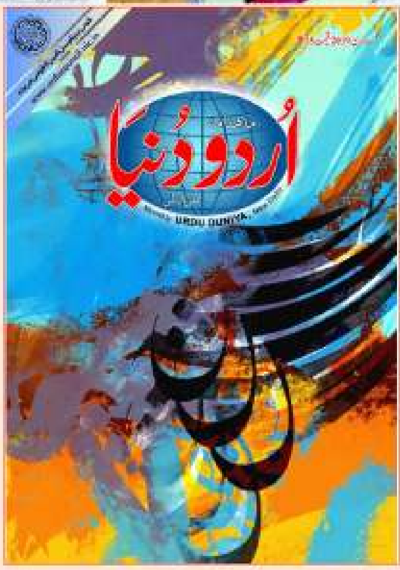

عبدالحی صاحب کے مرزا خلیل احمد بیگ کے ساتھ مصاحبے نے تو گویا سماں ہی باندھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے جناب مسعود حسین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اردو زبان کے لسانی و تاریخی تجزیوں پر کتب کی اشاعت قابلِ ستائش ہیں۔ سوالات جتنے مناسب ہیں، ان کے جوابات بھی اتنے ہی معقول ہیں۔ معدودے چند فاضل اشخاص ہی ایسا معرکتہ الآرا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس مصاحبے میں نوجوانوں کو اردو رسم الخط سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے جو تلقین کی گئی ہے، اسے نوئیڈا کے ہندی مجلّے 'لفظ' کے مدیر و شاعر جناب طفیل چترویدی کے اس شعر کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے

> ہم کہ ناواقف تھے اردو خط سے لیکن
> موم کی بیساکھیوں سے دوڑ میں حصہ لیا

شریف احمد قریشی کے مضمون سے شمارے کی وقعت بڑھ گئی۔

جگر مرادآبادی کی شاعری میں تغزل پر مسعود عالم کی تحریر بہت خوب ہے۔ مصنف نے شاعر کی ریاضت پر زور دیا ہے، اس سے یہ یاد آیا کہ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو اپنا استاد بنانے کے باوصف شعر میں ریاضت کی جو اہمیت قرار دی ہے، وہ تمام شعرا کے لیے باعثِ رہنمائی تسلیم کی جائے گی۔

"ظفر اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو، نہ تو بل
پیر کا کام آئے نہ استاد کا بل۔"

صفحہ 20 پر 'پہنچانا' املا کی جگہ 'پہچانا' املا چاہیے تھا۔

اسلم جمشید پوری کا مضمون از حد عرق ریزی کا غماز ہے۔ کمپیوٹر سے وابستہ اردو زبان کی ٹائپنگ اور دستاویز کی فارمیٹنگ وغیرہ پر مبنی مضامین از حد مفید ہیں۔

کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک، پٹیالہ، پنجاب

فروری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مشمولات میں رنگا رنگی اس بار زیادہ ہے۔ مجھے خاص طور سے آپ کا اداریہ پسند آیا کیونکہ اس میں آپ نے موجودہ دور میں جدید تکنالوجی کے زبان کے فروغ میں کردار سے بحث کی ہے۔ یقیناً ہمیں نئی تکنالوجی کی مدد سے اپنی زبان اور ادب کو نہ صرف وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے بلکہ اسے عالمی طور پر فروغ دینے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا ادب عالمی ادب کے مقابلے میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ 2012 میں امریکہ کی ایک سرکاری انجمن نے دنیا بھر سے منتخب کیے گئے سولہ ناولوں میں ہندوستان سے ایک ہی ناول کا انتخاب کیا تھا اور وہ تھا پیغام آفاقی کا ناول 'مکان'۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا تھا۔ اس ناول کا ترجمہ وہ بنگلہ زبان میں کروانا چاہتے تھے اور انہوں نے اس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا تھا مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کا ادب دنیا کی کسی زبان کے ادب سے کم تر نہیں ہے۔ لہٰذا، اردو زبان کو جدید تکنالوجی سے جوڑ کر

اسے عالمی طور پر مزید فروغ دیا جاسکتا ہے۔

'اردو کے معاصر غیر مسلم شعرا و ادبا' بھی ایک دلچسپ مضمون ہے۔اردو ہمیشہ سے ہی مسلموں اور غیر مسلموں دونوں فرقوں کی زبان رہی ہے اور اس کے فروغ میں دونوں فرقوں نے اپنا خون جگر دیا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اردو کو ایک مخصوص طبقے سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ بہر حال گزشتہ چند برسوں میں اردو میں غیر مسلم ادیبوں کی نئی کھیپ سامنے آئی ہے۔ غیر مسلموں کی نئی نسل اردو نہ صرف پڑھ رہی ہے بلکہ اسے اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بھی بنا رہی ہے۔ آلوک یادو، کرشن بھاؤک، جسپال کور اور استوتی اگروال چند ایسے ہی نام ہیں جو ان دنوں اردو رسائل میں تواتر سے نظر آرہے ہیں۔

❖ **سہیل ارشد**: راجہ باندھ، رانی گنج، مغربی بردھمان، ویسٹ بنگال

'اردو دنیا' کے تازہ شمارے میں مرزا خلیل احمد بیگ سے انٹرویو بہت اچھا ہے۔ اس انٹرویو سے مجھے کافی معلومات فراہم ہوئی۔ شمارے کے دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔

❖ **ذبیح اللہ عامر**: ایم اے سال دوم، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

جنوری 2019 کا شمارہ اردو دنیا موصول ہوا۔ دسمبر کا حاصل نہیں ہو پایا۔ بڑے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ علی گڑھ جیسے علم وادب کے گہوارے میں رسالہ اردو دنیا ناپید ہے اور کوئی صورت مقامی سطح پر خریدنے کی یہاں نظر نہیں آتی۔ جبکہ دوسرے کئی رسالے ملک بھر کے یہاں موجود ہیں۔ اب چونکہ میں اس کا خوگر ہوں تو تلاش اسی کی رہتی ہے۔ بہر حال جنوری کا شمارہ اپنی آب و تاب پر ہے۔ انور ادیب صاحب نے بابائے اردو کو بہت سہل اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے، جو قابل تحسین ہے۔ جناب احمد علی جوہر کا مضمون اردو کے ارتقا سے متعلق بہت معیاری ہے اور داد کے قابل ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے رشتے کو جس خوبصورتی سے پرونے کی کوشش کی ہے وہ معلوماتی ہے، جو اختصار کے ساتھ ادوار کو نظر میں رکھتے ہوئے قلم بند کیے گئے ہیں۔ قمر جمالی نے داغ دہلوی پر اچھا مقالہ لکھا ہے اور ان کے کرب اور تشنگی کو ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اردو کے خدمت گار بیرون ممالک میں بھی مختلف عمل و پیشے سے جڑے ہونے کے بعد بھی خدمت انجام دے رہے ہیں اور ان کی تخلیقات منظر عام پر آرہی ہیں یہ بڑے فخر کی بات ہے جس پر رکن الدین نے اچھا مقالہ تحریر کیا ہے۔

نگہت امین کا مضمون سائنسی تجربات اور علوم پر معلوماتی ہے۔ فہمیدہ ریاض پر محمد اکبر کی شعر فہمی قاری کو باندھے رکھتی ہے اور شاعرہ کے فن میں جس حسن اسلوبی سے خواتین کے مسائل کو اپنی نظموں میں پرویا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ مرشد آباد اردو کے ایک دبستان کی حیثیت رکھتا ہے یہ معلوماتی ہے۔

ترنم جبیں کا سارا شگفتہ پر لکھا ہوا مقالہ ان کی المیہ زندگی کو کر بیان کر رہا ہے اور سارا کی موت سے جو اسے تخلیقی زندگی ملی وہ اسے لافانی بنا رہی ہے۔ انگریزی فن پارے سے اردو ادب پر پڑے اثرات سے انکار کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جن کی پکڑ دونوں فن پاروں پر یکساں ہے وہ بہتر سمجھ رکھنے والے ادیب و قاری ہو سکتے ہیں ذاکر صاحب کا یہ مقالہ قابل تعریف ہے۔

❖ **محمد پرویز عالم**: دہلی پبلک اسکول، علی گڑھ، یوپی

'اردو دنیا' کے ستمبر 2018 کے شمارے میں ایک اچھا مضمون 'ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ تلنگانہ بورڈ کے حوالے سے' شائع ہوا ہے جسے رضوانہ بیگم نے لکھا ہے۔ مضمون میں موجودہ دور کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مرحلہ وار دوسرے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ اس کی وضاحت بڑی خوبصورتی سے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کی ذہنی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے اور میں سوچتا رہ گیا کہ کس یونیورسٹی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ 'اسکول کے درس وتدریس کے عمل میں زبان کی اہمیت'، 'موضوع کا تعلق اردو زبان'، 'اردو زبان میں درسی کتب کی تیاری'، 'ثانوی سطح کی تعلیم میں طلبا کی عمر اور ضروریات'، 'تلنگانہ بورڈ کے ثانوی درجات کی درسی کتب' اور آخر میں دونوں کتابوں سے صرف 'حصہ نظم' کے جائزے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

1984 کی تعلیمی پالیسی میں ثانوی درجات کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ پہلے زبان اور سماجی علوم کو آٹھویں درجہ تک پڑھایا جاتا تھا اور نویں سے طلبا اپنی پسند کے مضامین جیسے آرٹس، سائنس، کامرس کا انتخاب کرلیا کرتے تھے۔ نئی تعلیمی پالیسی نے زبان کی تعلیم، سماجی علوم کی تعلیم اور کھیل کود کے وقت میں بڑا اضافہ کردیا اور کھیل کود کے بڑھتے ہوئے اوقات کا نتیجہ بھی۔ اولمپک اور ایشیائی کھیلوں میں گولڈ میڈلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سامنے آگئی ہے اور خاص طور سے زبانوں کی تعلیم کے دو بڑھتے ہوئے درجوں میں کس قسم کی تعلیم ہو اس کا احساس کراتا ہے۔ چنانچہ ثانوی درجات کی نصابی کتب کے مطالعہ میں اس امر کا ذکر ضروری ہے۔

میں نے اپنی دوسرے پی ایچ ڈی کے لیے اسی موضوع کا انتخاب کیا تھا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ثانوی درجات میں 33 فیصدی اسباق ادب سے، 33 فیصدی اسباق زبان سے اور 33 فیصدی اسباق دوسرے علوم کے ہوں تاکہ مختلف علوم جیسے سائنس، کامرس، اور خلا سے متعلق موضوعات وغیرہ کے مطالعے اور امتحان میں جواب لکھنے کے لیے ان کے پاس زبان کا بھی اچھا معیار ہو اور وہ دوسرے علوم پر بہتر اظہار خیال کرسکیں۔ مضمون کی دونوں تصویریں ثانوی درجات سے اور اردو سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ثانوی درجات میں طلبا کی عمریں 14,15 برس کی ہوتی ہیں اور تصویروں میں بچے اور کم عمر طالبات دکھائی دے رہی ہیں۔

❖ **اخلاق اثر**: صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال، مدھیہ پردیش

محمد قمر سلیم

تعمیریت اور زبان کی تدریس

مغربی مفکر جان لاک (John Lock) کے مطابق انسان کا ذہن خالی سلیٹ کی طرح ہے جس پر والدین، استاد، سماج اپنی فکر کے مطابق جو چاہتے ہیں وہ لکھ دیتے ہیں اور اس کے مطابق ہی بچے کی ذہن سازی ہوتی ہے۔اس خالی سلیٹ کو لاطینی زبان کے ایک فقرے 'ٹیبولا راسا' (Tabula rasa) کا نام دیا ہے۔اس کا ماننا تھا کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن علم سے عاری ہوتا ہے۔اور اس کے خالی ذہن میں علم ڈال دیا جاتا ہے یا یوں کہیں کہ خالی سلیٹ پر علم کو لکھ دیا جاتا ہے لیکن یہ بات وہ بھی مانتا تھا کہ ہر طرح کا علم انسان اپنے تجربات اور خیالات سے ہی حاصل کرتا ہے۔تعمیریت (Constructivism) کے مفکرین انسان کے ذہن کو خالی سلیٹ کے مترادف نہیں سمجھتے ہیں اسی لیے وہ آموزش کے عمل میں متعلم کے علم کو اہمیت دیتے ہیں۔کسی بھی طرح کی آموزش کا دارومدار خود متعلم کے علم اور اس کے ماحول پر ہوتا ہے۔

تعمیری انداز نظر سائنسی اصولوں پر مبنی ہے۔تعمیریت کے مفکرین ایک سائنس داں کی حیثیت سے سوچتے ہیں۔ان کے مطابق آموزش کا عمل نہ صرف اکتسابی ماحول پر منحصر ہوتا ہے بلکہ متعلم کے علم پر بھی منحصر ہوتا ہے، کسی بھی علم کو نئے معنی پہنانا یا نیا علم تخلیق کرنا متعلم کی استعداد کا مرہون منّت ہے۔کسی بھی علم کی تعمیر کے بعد اس کی قدر پیمائی ضروری ہو جاتی ہے جس کی بنا پر ہی وہ علم قبول اور نا قابل قبول ہو سکتا ہے۔یہ آموزش کا عمل ہمیشہ چلنے والا عمل ہے۔علم متعلم کی ذہنی اپج ہے۔اس کے تجربات، مشاہدات، غور و فکر اس کے علم کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔علم حاصل کرنا متعلم کی ذمے داری ہے۔

مشاہدے، تجربے اور سائنسی مطالعے کی بنیاد پر ذہن کی تعمیر کو تعلیمی اور نفسیاتی مفکرین نے تعمیری انداز نظر (Constructivist Approach) کا نام دیا ہے۔اس کے تحت طالب علم اپنے تجربات، مشاہدات کی بنیاد پر اپنے علم (knowledge) اور فہم (Understanding) کی تعمیر کرتا ہے۔ان کے مطابق طالب علم خود اپنے علم کی تخلیق کرتا ہے اور علم کی تخلیق کے لیے سوالات کا پوچھنا، علم کو وسعت دینا اور علم حاصل کرنے کی جستجو ضروری ہے۔جماعت میں تعمیریت مختلف طریقوں کے استعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسے پروجیکٹ میتھڈ، تلاش وجستجو کا طریقہ، اطلاعاتی طریقہ، مسائل کو حل کرنے کا طریقہ، باہمی مدد کا طریقہ، ہم کاری طریقہ، نقشہ کشی کا طریقہ، تخلیقی ورکشاپس وغیرہ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبا جماعت میں مختلف تکنیکوں کا استعمال کریں۔یہاں استاد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ان تکنیکوں کے استعمال سے طلبا کی سوچ، ان کے نظریے اور فہم میں کتنی تبدیلی آ رہی ہے۔دراصل تعمیریت پسند جماعت ایک ایسی جماعت ہے جس میں طلبا یہ سیکھتے ہیں کہ کس طرح سیکھا جائے؟ تعمیریت کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے کہ جس سے طلبا کے ذہنوں میں علم کو انڈیلا جائے بلکہ طلبا آموزش کے عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اپنے تجربات سے سیکھتے ہیں۔اس میں متن کو یاد نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کو سمجھ کر اپنے خیالات اور علم و فہم کو وسعت دی جاتی ہے۔تعمیریت میں استاد طلبا سے سوالات پوچھتا ہے، ان کے سامنے مسائل رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے حل کے لیے طلبا کی رہنمائی کرتا ہے۔تدریس کے وقت وہ مختلف تکنیکوں کا استعمال کرتا ہے جیسے:

1۔ طلبا اپنے سوالات کو خود تشکیل دیتے ہیں اور اس سے متعلق اطلاع (inquiry) حاصل کرتے ہیں۔
2۔ طلبا تکثیری ذہانت (Multiple Intelligence) کی بنیاد پر تشریحات اور وضاحتیں کرتے ہیں۔
3۔ طلبا گروپ میں کام کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے شرکت کاری آموزش (Collaborating Learning) کے عمل کو وسعت دیتے ہیں۔

این سی ای آر ٹی کی کتاب 'اردو تدریسیات: حصہ 1' کے مطابق اس انداز نظر میں طلبا، ان کی ذہنی صلاحیت، سابقہ معلومات، ان کے لیے نئے علم کی افادیت اور ان کے اپنے فطری اور معاشرتی ماحول کو تعلیم کا مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔اس انداز نظر کے مطابق اساتذہ طلبا کو براہ راست نئی معلومات، تصورات، اصول وقواعد نہیں سکھاتے بلکہ جو کچھ بچے جانتے ہیں یا جن الفاظ و معنی کا ذخیرہ ان کے پاس ہے اسے ہی دوبارہ ترتیب دینے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔اسی معلومات کی بنیاد پر ان میں غور و فکر کی صلاحیت کے فروغ کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بچے خود اصول و قواعد اخذ کر سکیں۔(ص 118)

تعمیریت کی جماعت میں طلبا خالی سلیٹ کی مانند نہیں ہوتے ہیں جس پر علم کو لکھ دیا جائے۔وہ حاصل شدہ علم سے نئے علم کی بنیاد رکھتے ہیں۔جب طلبا نئے علم کی تخلیق کرتے ہیں تو استاد ان کی رہنمائی کا کام انجام دیتا ہے۔استاد اس عمل میں طلبا کو ان چیزوں کے استعمال کی طرف بھی زور دیتا ہے جن کو وہ بے کار سمجھتے ہیں۔تعمیریت میں طلبا کی مکمل شمولیت ہوتی ہے۔اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ طلبا اپنی کارکردگی پر خود اپنی رائے دیں، وہ خود ہی اپنے علم کے مقاصد طے کریں، خود ہی ان کی قدر پیمائی کریں، اپنے آموزش کے عمل کو خود ہی منظم کریں اور اپنے تجربات پر خود ہی رائے زنی کریں۔اس طرح وہ علم میں مہارت حاصل کریں گے۔اس کے لیے استاد کو ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ساتھ ہی ساتھ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ:

1۔ طلبا نے کون سا نیا علم حاصل کیا ہے۔
2۔ طلبا کس طرح اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں۔
3۔ اکتسابی ماحول میں استاد کا کیا رول ہے۔

تعمیریت پسند جماعت کا دارو مدار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے پر ہے کیوں کہ طلبا صرف اپنے تجربات سے ہی نہیں سیکھتے ہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی سیکھتے ہیں جب وہ ایک ساتھ آموزش کے عمل میں شامل ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں نئے نئے طریقے رونما ہوتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت طلبا مسائل کو حل کرتے ہیں، سوالات پوچھتے ہیں، عنوانات پر تحقیق کرتے ہیں۔ اپنے سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے مختلف سمتوں میں سوچتے ہیں۔ تعمیریت پسند فلسفی طلبا کے موجودہ نظریوں کو کافی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ وہیں سے ان کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔ جب طلبا کوئی نئی اطلاع حاصل کرتے ہیں تو وہ غور وفکر کرنے کے بعد اپنے علم وفہم سے اس اطلاع کا موازنہ کرتے ہیں۔

1999 میں جیکلن گرینن بروکس (Jacqueline grennan brooks) نے تعمیریت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جس کا مفہوم اس طرح ہے: کہ 'جب تک لوگ ایک دوسرے سے سوالات پوچھتے رہیں گے اس وقت تک تعمیریت کی جماعت چلتی رہے گی۔ تعمیریت جو کہ آموزشی عمل کا مطالعہ ہے۔ اس میں ہم اپنی دنیا کا تصور جیسا کرتے ہیں وہ ہمیشہ ویسا باقی رہتا ہے یعنی وہ بدلتا نہیں'۔ اگر ماضی کی ورق گردانی کریں تو تعمیریت کی جڑیں سقراط (Socrates) سے جڑی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ماننے والوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کرتا تھا۔ وہ اپنے طلبا سے سوالات پوچھتا تھا جس کی وجہ سے اس کے طلبا اپنے علم وفہم کی روشنی میں نہ صرف اس کے سوالوں کو نئے معنی دیتے تھے بلکہ اپنی کمیوں کو سمجھنے کے قابل بھی ہو جاتے تھے۔ سقراط کے سوالات کی تکنیک آج بھی تعمیریت پسند اساتذہ کا اہم آلہ ہیں۔ ژاں پیاژے (Jean piaget) اور جان ڈیوی (John Dewey) نے بچوں کے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا جو کہ تعمیریت کی شروعات تھی۔ پیاژے نے منطق اور ڈیوی نے حقیقی تجربات کو اہمیت دی۔ ژاں پیاژے نظریۂ تعمیریت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ انسان کسی بھی چیز کو اپنے تجربات اور غور وفکر سے نئے معنی دیتا ہے اس کا وہی علم تعمیریت ہے۔ لیو۔ ایس۔ وائی گوٹسکی (Lev S. vygostky) نے آموزش کے عمل میں فرد واحد سے زیادہ سماجی پہلوؤں کو اہمیت دی ہے کیوں کہ متعلم جو کچھ بھی سیکھتا ہے یا علم حاصل کرتا ہے وہ سماج میں رہ کر ہی کرتا ہے اور سماجی ماحول کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے جبکہ جروم برونر (Jerome Bruner) نے سرگرم سماجی عمل میں طلبا کے نئے خیالات کو وسعت دی۔

''تعمیریت کے مطابق کسی مواد کو مکمل سچائی کی شکل میں نہ دے کر ممکنات یا معلومات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی مدد سے طالب علم اس مواد سے متعلق اپنے تصورات اور تعبیرات خود قائم کرتا ہے۔ اساتذہ کوشش کریں کہ جو مواد طالب علموں کے سامنے پیش کیا جائے وہ اسے اپنی ذہنی سطح کے مطابق اخذ کر سکیں... اساتذہ کسی سوال کے معیاری اور متوقع جواب کی امید طلبا سے نہ کریں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ وہ اپنی سمجھ اور علم کے مطابق اپنے الفاظ میں سوالات کے جواب دے سکیں۔ یہی ایک قدم ہے جس کی بدولت ہم رٹنے سے تعمیریت کی طرف پیش رفت کر سکتے ہیں۔ (اردو تدریسیات: حصہ۔2، 2016، این سی ای آر ٹی، ص 121-120)

ہماری جماعتوں میں عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ طلبا کسی بھی سبق کو رٹنے اور یاد کرنے کے عمل سے گذرتے ہیں کیوں کہ ہمارے اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ رٹنے اور یاد کرنے سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رٹا ہوا اور یاد کیا ہوا مواد وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ طلبا کے ذہن کی تخلیق نہیں ہوتا ہے۔ بچہ ذہنی طور پر بذاتِ خود جو تخلیق کرتا ہے وہ صحیح معنی میں آموزش کی طرف ایک بڑا قدم ہے۔ قومی درسیاتی خاکہ 2005 کے مطابق 'جس عمل میں ذہنی کارکردگی شامل نہ ہو وہ آموزش نہیں ہوتی ہے'۔ بچہ اپنی معلومات، تجربات اور مشاہدات کی بنا پر اپنے ذہن سے نئے علم کی تعمیر کرتا ہے۔ آموزش میں اس کے اس علم کی تعمیر اسے تعمیریت کی طرف لے جاتی ہے۔ عام طور سے تعمیریت پسندوں کا ماننا ہے کہ طلبا اس وقت زیادہ سیکھتے ہیں جب انھیں علم کی تلاش وجستجو ہوتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے انہماک کے ساتھ آموزش کا عمل کرتے ہیں۔ اس میں موضوع اور تصور کو سمجھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ طلبا کو کسی بھی موضوع یا تصور کے معنی بتانا غلط ہے بلکہ وہ اس موضوع یا تصور کے معنی اپنے آپ اخذ کریں یا خود اپنی فہم کے مطابق اس کی تعریف کریں۔ طلبا کو درسی کتب کا سہارا لینے کے بجائے اپنے اطراف میں موجود چیزوں کی مدد حاصل کرنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں چیزوں کو یاد رکھنے یا اسباق کو یاد کرنے کے بجائے اپنی فکر پر زور دینا چاہیے، پھر ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے جواب اور وجوہات تلاش کرنا چاہیے مثال کے طور پر اگر اردو میں ان کو نظم برسات پڑھائی جاتی ہے تو اس نظم میں بتائی گئی باتوں اور حوالوں کو استاد سے سمجھنے کے بجائے اس نظم کا تعلق حقیقت میں برسات سے قائم کریں یعنی وہ مشاہدہ اور تجربہ کریں کہ بوندیں کیسے گر رہی ہیں؟ بارش ہونے سے موسم کیسا ہو گیا ہے؟ بارش کی وجہ سے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہو رہا ہے؟ اور پھر اپنے تجربات اور مشاہدے کی بنا پر غور وفکر کر کے اپنے علم کی تخلیق کرے۔ اس طرح حاصل کیا ہوا علم ہی اصلی اور صحیح آموزش ہے۔

تعمیریت پسند جماعت میں استاد کو طلبا سے زیادہ سے زیادہ ایسے سوالات پوچھنا چاہیے جو ان کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں۔ ان سے کیوں، کیسے، کس لیے، کس طرح، کب، کیا جیسے سوالات کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ استاد کسی بھی عبارت کی تفہیم یا شعر کی تشریح خود ہی کر دیتے ہیں جس سے طلبا کو غور وفکر کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ استاد کو اس عبارت یا شعر سے متعلق سوالات پوچھنا چاہیے اور ان کے جوابوں کی روشنی میں عبارت وشعر مکمل کرنا چاہیے۔ عبارت یا اشعار کی بنیاد پر مصنف کی تصنیف یا شاعر کے کلام کی خصوصیات طلبا سے معلوم کرنا چاہیے۔ ان کو تخلیقی، تخیلاتی اور تصوراتی مضامین لکھنے کی طرف راغب کرنا چاہیے۔ ان سے الفاظ کے معنی، جملوں کے مفہوم خود واضح کروانا چاہیے۔ طلبا کو زیادہ سے زیادہ سرگرمیوں میں ملوث رکھنا چاہیے۔ ان کا رجحان سرگرم آموزش کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ ایسی آموزش جس میں زیادہ سے زیادہ ان کی شمولیت کو یقینی بنایا جا سکے اور ان کو ان کے علم کی تخلیق کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جا سکیں۔

حواشی:

۱۔ ڈبلیونیٹ/ ایجوکیشن (2004)، کنسٹرکٹوازم ایز اے پیراڈگم فار ٹیچنگ اینڈ لرننگ، ڈزنی لرننگ پارٹنرشپ۔
www.thirteen.org/edonline/concept2class/constructivism/

2۔ ڈی وریس وغیرہ (۲۰۰۲)، ڈیولپنگ کنسٹرکٹوسٹ ارلی چائلڈ ہڈ کریکیولم: پریکٹیکل پرنسپل اینڈ ایکٹویٹیز۔ ٹیچرس کالج پریس: نیویارک۔ آئی ایس بی این 3۔ 4121۔ 7780۔ 0

3۔ عزیز فاطمہ: کنسٹرکٹوازم: اے سائنٹیفک وے آف لرننگ اینڈ فارمل ایجوکیشن، ایجوٹریک، Vol. 15. No. 9، مئی 2016، ص 7-8

4۔ اردو تدریسیات: حصہ 1، (2015)، این سی ای آر ٹی، نئی دلی۔

5۔ اردو تدریسیات: حصہ 2، (2016)، این سی ای آر ٹی، نئی دلی۔

۶۔ وکی پیڈیا: کنسٹرکٹوازم (فلاسفی آف ایجوکیشن)
https://en.m.wikipedia.org

■

Mohd Qamar Saleem
Associat Prof.
Anjuman-e-Islam Akbar Peer Bhai College of Educational, Wasi
Navi Mumbai - 400703 (MS)

دکنی شاعری میں تلمیحات

محمد نذیر احمد

تلمیح کے لغوی معنی ہیں ''نظم یا نثر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن سے کسی قصے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو'' محمود نیازی اپنی تصنیف 'تلمیحات' میں تلمیح کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ قصوں، کہانیوں اور افسانوں کی طرف جو لفظ، کہاوتیں، ضرب المثلیں اور محاورے اشارے کرتے ہیں ان کو ادبی اصطلاح میں تلمیح کہا جاتا ہے۔ آگے مصنف مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں چند یورپی محققین اور تلمیح نگاروں کے حوالے دیے ہیں جن سے تلمیح کی تعریف اور افادیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

1۔ امریکن انشا پرداز آسبورن کا قول ہے کہ ''تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشانات ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، رسم و رواج، عقائد اوہام، واقعات اور حالات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔''

2۔ فرانسیسی مضمون نگار شوق کران لکھتا ہے کہ ''جب میں کسی فصیح البیان شخص کی زبان سے انقلاب فرانس کی تلمیح سنتا ہوں تو میرا دل ان وحشت اور دہشت انگیز حالات سے بھر آتا ہے جن کے سبب دریائے سین کی وادیاں خون سے لبریز ہو چکی ہیں مگر اس کے فوراً بعد میرے خیال کا رخ اس شاندار جمہوریت کی طرف پھر جاتا ہے جس کی بنیادیں خون سے بھری ہوئی دیواروں سے اٹھائی گئی ہیں۔

ان حقائق سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کلام میں لفظی و معنوی حسن پیدا کرنے کے لیے کسی مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو یہی صنعت تلمیح ہے۔ اہل ادب کی اصطلاح میں تلمیح اس صنعت کا نام ہے جس میں شاعر اور ادیب نظم یا نثر میں اشارے و کنائے میں کسی افسانے، قصے، واقعے اور احادیث و آیات کا اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں۔ الغرض ایک دو لفظ میں ہی فوری طور پر کل واقعات کی طرف ذہن مائل ہو جاتا ہے۔

تلمیح کے لیے یہ ضروری ہے کہ واقعہ بہت مشہور ہوتا کہ پڑھنے والا فوراً سمجھ جائے کہ شاعر نے کس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعر یا ادیب طویل قصوں، داستانوں اور واقعات کے تفصیلی بیان سے گریز کرتے ہوئے تلمیحات کا استعمال کرتا ہے۔ عمدہ کلام کے لیے فصاحت اور بلاغت دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ کہ فصاحت کلام کا جسم ہے تو بلاغت روح ہے۔ ان دونوں کے بنا کلام میں لطف پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

تلمیح کے ماخذ

پروفیسر وحیدالدین سلیم تلمیحات کے ماخذ اس طرح بتاتے ہیں:

''(1) دیومالا یعنی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں (2) مذہبی قصے، مذہبی عقائد کی کتابیں (3) تاریخی واقعات (4) عام فرضی قصے اور افسانے (5) شعرا کی نظمیں خاص کر وہ نظمیں جس میں قصے بیان کیے گئے ہیں (6) ڈراما یا ناٹک کی کتابیں''

محمود نیازی نے اپنی تصنیف 'تلمیحات' میں کم و بیش 750 تلمیحات رقم کی ہیں۔

اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ بنیادی طور پر حسن پرست، رومان پسند اور عاشق مزاج شاعر تھا لیکن اس نے تقریباً روزمرہ زندگی کے ہر موضوع پر نظمیں لکھیں اور قومی مذہبی تہواروں، ہندوستانی تہذیب و کلچر کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ اپنی مختلف نظموں میں جگہ جگہ رسول پاک اور اہل بیت سے محبت کا اظہار کیا ہے۔

نعت کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

لیائے ہے وحی جبرئیل حق کے حبیب کوں تب
اقرا کہ توں ہے خاتم سالم سوا انبیاء کا

اس شعر میں غار حرا میں آپؐ پر نزول وحی کے مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے حبیب آپ کو 'اقرا' نبوت کا پہلا سبق پڑھایا تھا محمد قلی اس شعر میں رسول اللہ کے خاتم الانبیاء ہونے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ محمد قلی اپنی نظم 'شب معراج' میں کہتا ہے۔

شاہ مرداں و محمد ہیں ہمارے سرتاج
خدا باتاں حبیب اپنے سوں کیا شب معراج

اس شعر میں شب معراج کے مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ابن نشاطی نے بھی شب معراج کی تلمیح اس طرح استعمال کی ہے۔

شب معراج ہے تجھ مہ سوں روشن
فلک کا سبز ہے تجھ شہ سوں گلشن

نظم شب برات میں محمد قلی کہتا ہے۔

کہہ طور نور اجالا شب برات اَب دپائے (دپائے: چمکائے)

اب حیات منج کوں اَپ ہت خضر پلائے (اَپ: آپ خود، ہت: ہاتھ)

اس شعر میں کوہ طور، شب برات اور خضر تلمیح ہے۔

محمد قلی 'نوروز' کے موقعے پر دعا کرتا ہے۔

نبی صدقے قطب ایسی کرے نوروز رنگیلی

آب کوثر خدا حضرت کے ہتوں منج کو پلاوے

دکنی شعرانے 'آب کوثر' کی تلمیح کثرت سے استعمال کی ہیں۔

آب کوثر

'آب کوثر' ایک حوض کے پانی کا نام ہے۔ کنایۃً ٹھنڈے میٹھے اور مصفی پانی کو بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پانی حوض کوثر کی ایک نہر کے ذریعے بہشت میں آتا ہے۔ اس نہر کا ذکر قرآن مجید نے سورۂ کوثر میں کیا ہے۔ آب کوثر کو آنحضرتؐ بہشتیوں میں تقسیم فرمائیں گے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آرزوئے چشمہ کوثر نہیں تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا

(ولی دکنی)

حوض کوثر کی نہیں چاہ زنخداں کی قسم تشنۂ شربت دیدار ہوں کن کا ان کا

(سراج اورنگ آبادی)

اس زنخداں کی جس نے چاہ کیا (زنخداں: تھوڑی کا گڑھا)

اوس لب آب دار کی سوگند (اوس: اس، سوگند: قسم)

آب حیات و چشمہ خضر

دکنی شاعروں نے چشمۂ خضر و آب حیات کی تلمیح بھی جگہ جگہ استعمال کی ہے۔ آب حیات زہر کی ضد ہے یعنی وہ پانی جس کو پینے سے آدمی کبھی نہیں مرتا کنایۃً لطیف، شیریں اور جاں بخش چیز کو کہا جاتا ہے۔ اس پانی کو آب بقا، آب حیوان، آب زندگانی اور آب خضر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تلمیح اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آب حیات کی تلاش میں خضر اور سکندر ظلمات کو گئے تھے۔ ظلمات اس مقام کا نام ہے جہاں گھور تاریکی رہتی ہے اور وہاں کبھی چاند سورج نہیں نکلتے۔ مشہور ہے کہ سکندر تو ظلمات کی تاریکی میں راہ بھٹک گیا تھا اور خضر نے آب حیات پی کر حیات جاوداں پائی۔

مارا ہوا ہے خضر محبت کی تبع کا (تبع: پیروی)

آب حیات شوق سیں تیرے جیا ہوا (سیں: سے)

ہے لب ساقی میں چشمہ خضر کا

گر تجھے آب بقا درکار ہے

سراج اورنگ آبادی

آگے تیرے لبوں کے جو ہو چشم حیات

لگتا ہے آب خضر مثال سراب آج

اے اشک چشمہ خضر اپنی شمع رخ دکھلا

کہ ہے بصورت ظلمات انجمن تجھ بن

اگرچہ سخن میرا ہے آب خضر سے شیریں

ولے لذت زُلالی ہے صنم کے لب کی پیالی میں (زلالی: خالص پانی، سرد اور شیریں پانی)

اے سکندر نہ ڈھونڈ آب حیات

چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

دکنی شاعروں نے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت زلیخا کے مشہور واقعہ کو بھی بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔

یوسف زلیخا

زلیخا عزیز مصر کی حسین و جمیل بیوی تھی جو بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر حضرت یوسفؑ سے والہانہ عشق کرتی تھیں۔ اس عشق کی وجہ سے وہ سارے عالم میں رسوا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس واقعے کی تفصیل ہے۔ عورتیں غلام سے عشق، زلیخا پر لعن طعن کرتی ہے تو زلیخا نے شاہی خاندان کی عورتوں کو دعوت پر بلایا اور ان کے ہاتھوں میں ایک ایک لیمو اور چھری دی اور اس جگہ حضرت یوسف کو بھی بلایا۔ ان عورتوں کو لیمو کاٹنے کو کہا تو عورتوں نے حسن یوسف کی تاب نہ لا کر اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔

اس ضمن میں احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' بے حد مقبول ہے۔ یہ جنوبی ہند کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے جو 3709 اشعار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس مثنوی کو 1983 میں مرتب کر کے شائع کیا۔ احمد گجراتی کی ایک اور مثنوی لیلی مجنوں بھی ہے۔

احمد گجراتی نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں جگہ جگہ تلمیحات استعمال کی ہیں۔

سو کچ رنگ روپ تازہ ہو کھلی نار جو کوثر میں کمل نہ ہوے اس سار

کھڑا جوں خضر آ آمریت جل پھوٹیا جوں پاچ گردا گرد کوثر

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کا پروردہ شاعر ہی 'کوثر' میں کمل کا حسن دیکھ سکتا ہے اور 'امریت جل' میں اسے خضر کھڑے نظر آتے ہیں۔

زبس اس یوسف مصری کے ہیں لب (زبس: کافی، کثرت)

ہوا ہے دل مثل کنعاں رفتہ رفتہ

یہی قبر زلیخا سیں ہے آواز

اگر ہے یوسف ثانی یہی ہے

سراج اورنگ آبادی

کچھ حضرت یوسف ہی پہ موقوف نہیں

مخلوق ستاتی رہی خاصان خدا کو

صفی اورنگ آبادی

نکر تغافلی اے مصر حسن کے یوسف

مثال دیدۂ یعقوب ہے نین تجھ بن

ولی دکنی

دکنی شاعروں نے 'کوہ طور' کے مشہور واقعے کو بھی تلمیحاً استعمال کیا ہے۔

کوہ طور

کوہ طور پر حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰ نے خدائے تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تو اللہ نے منع کیا کہ تم تاب نہیں لا سکتے پھر بھی موسیٰ بضد رہے، تو اللہ نے صرف ایک جھلک دکھائی جس سے کوہ طور جل کر خاک ہو گیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے 'کوہ طور' کے نام سے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر ہے۔

کہہ طور پر ہے سدا سبحان کا اجالا

تو خلق سرمہ کرتی ہے رحمان کا اجالا

(زمان: زمانہ)

یار کے دیدار کا طالب ہوں موسیٰ زمان (اوس: اس)
اے ولی دربار اوس کا مجکو کوہ طور ہے
موسیٰ اگر چہ دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا
ولی دکنی

کہاں پر بوالہوس کوں تاب اس رخ کی تجلی کی
کہ موسیٰ کوں جواب 'ربی اَرنی' لن ترانی ہے

طوفان نوح

دکنی شعرانے سفینۂ نوح، کشتیِ نوح کو بھی تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سفینۂ نوح حضرت نوح کی اس کشتی کو کہتے ہیں جو سیلاب سے محفوظ رہی اس کے علاوہ تمام دنیا غرق ہوگئی۔ حضرت نوح نے اپنی سرکش اور نافرمان قوم کے حق میں بددعا کی تھی۔ خدا کے حکم پر حضرت نوح نے کشتی تیار کی اور تمام ایمان والوں کے علاوہ جانوروں کے ایک ایک جوڑے کو اس کشتی میں سوار کرلیا۔ پھر عذاب الٰہی نازل ہوا جس میں تمام کفار اور منکرین غرقاب ہوگئے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

اے ہیا موجاں تھے نِدر من کے بھاتا ہوئے گا (ہیا: دل، موجاں: موج کی جمع)
تو تجھے ہے نوح کشتی بان طوفان غم نہ کھا (بان: تیر، راکٹ: ری)
بھنواں کشتی منے یوں رہیا جو نوح کشتی میں (بھنواں: بھنوئیں، منے: میں، رہیا: رہا)
پرت دریا منے پایا پری ایسی رتن پتلی (پرت: پریت، محبت، منے: میں)
محمد قلی قطب شاہ

آج تجھ غم سے ہے ولی گریاں
دیکھ چل نوح کا تماشا ہے

ولی دکنی

شہنشاہ رباعیات امجد حیدرآبادی کہتے ہیں۔

تن کی کشتی میں نوح بن کر آیا
ساغر میں صبوح بن کر آیا (ساغر: شراب کا پیالہ، صبوح: صبح کے وقت کی شراب)
خیر من الف شہر، ہے آج کی رات (خیر من الف شہر: ایک ہزار راتوں سے افضل رات)
وہ پیکر جاں میں روح بن کر آیا

نصرتی عادل شاہی دور کا بلند پایہ شاعر گزرا ہے اس نے علی نامہ میں اپنے قصیدے 'پنالہ گڑ' میں علی عادل شاہ کے قلعہ فتح کرنے تک کے تمام حالات قلم بند کیے ہیں۔

نصرتی علی عادل شاہ اور شواجی کی جنگ کے موقعے پر لکھتا ہے۔

پھر نوح اس طوفان میں چڑتا تو کشتی موج او (چڑتا: چڑھتا، او: وہ)
ہر دم گگن پر خوئے پر کرتا پنکھا اوزار کا (گگن: آسمان، خوئے: پسینہ)

دکنی شعرانے مذہبی واقعات کے علاوہ افسانوی ادب پر مبنی مشہور واقعات کی تلمیح سے کلام میں حسن پیدا کیا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا پر تلمیحات کثرت سے مل جائیں گی۔

لیلیٰ مجنوں

مجنوں کے معنی پاگل، دیوانہ یا ایسے شخص کے ہیں جس پر جنون کا سایہ ہوگیا ہو۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو ادب میں یہ لقب قیس عامری کے لیے مخصوص ہوگیا ہے جو اپنے ہی قبیلے کی ایک لڑکی لیلیٰ کے عشق میں مجنوں ہو چکا تھا۔ جب خاندان والوں نے لیلیٰ پر سخت پہرے لگا دیے تو وہ دیوانہ وار ریگستانوں میں بھٹکتا رہا۔ مجنوں سے جدائی کے صدمے نے لیلیٰ کی جان لے لی۔ مجنوں کو لوگوں نے لیلیٰ کی قبر نہیں بتائی تو وہ قبر کی مٹی کی خوشبو سونگھ کر پتہ لگا لیتا ہے اور لیلیٰ کی مزار پر ہی دم توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح شیریں فرہاد کی عشقیہ داستان بھی بقائے دوام حاصل کرگئی۔ شیریں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کی محبوبہ اور بیوی کا نام تھا۔ فرہاد مشہور سنگ تراش تھا جس نے شیریں کے عشق میں 'کوہ بے ستون' جیسے سخت پہاڑ کو تراش کر جوئے شیر نکالی اس کے باوجود بھی اسے شیریں نہ ملی تو جس تیشے سے پہاڑ کو تراشا تھا اسی کو سر پر مار کر ہلاک ہوگیا۔

ہیر رانجھا بھی پنجاب کے رسوائے زمانہ عاشق و معشوق کا نام ہے۔ ان کی داستان محبت پنجابی زبان میں وارث شاہ نے لکھی ہے۔ ان کا انجام بھی لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی طرح رہا۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کی تلمیح استعمال کی ہے۔

قصا ہے جگ میں لیلیٰ و مجنوں ہور فرہاد کا — اب عشق میرا جلوہ کرتا ہے تیرے پیغام پر
محمد قلی قطب شاہ

.... — کہ ہے عشاق کا مسکن کبھو صحرا کبھی تربت

....

مشتاق ہوں تجھ لب کی فصاحت کا ولیکن — رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز
الفت لیلیٰ نے مجنوں کا سب مٹایا نشان — نام اس کا صفحہ ایجاد پر باقی رہا
اورنگ آبادی

فرہاد نے بے صبری سے جاں اپنی گنوائی — کم بخت نے بدنام کیا اہل وفا کو
صفی اورنگ آبادی

آئینہ سکندری:

آئینہ سکندر ایک تاریخی واقعہ ہے جسے دکنی شاعروں نے تلمیحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سکندر یونانی آئینہ کا موجد ہے اس کو عرصہ دراز تک جستجو رہی کہ کوئی ایسی چیز بن جائے جس میں مقابل چیز کا عکس نظر آئے۔ آخر کار سام لوہار نے لوہے کو ایسی جلا دی کہ اس میں عکس نظر آنے لگا یہ دنیا کا پہلا آئینہ تھا جس کو 'آہنہ' کہا جاتا تھا۔ سکندر نے اس میں طرح طرح کی جدتیں کیں اور جب یہ شیشے پر بنایا جانے لگا تو اس کا نام آئینہ ہوگیا۔

سکندر کے درپن دونوں چک اہیں (چک: آنکھ)
دیکھن دل کوں دل عین عینک اہیں (دیکھن: دیکھنا)
نصرتی: گلشن عشق

پرنور ہر یک جام اگے جم، جام، جم بے آب ہے (اگے: آگے)
آئینہ اسکندری شرمندہ جس دیدار کا
نصرتی: علی نامہ

میں اس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کا
وہ آئینہ کا آئینہ، سکندر کا سکندر ہے
محمد قلی قطب شاہ

■

Md. Nazeer Ahmad
Head Department of Urdu
University College for Women's Koti
Main Road, Koti
Hyderabad - 500095 (Telangana)

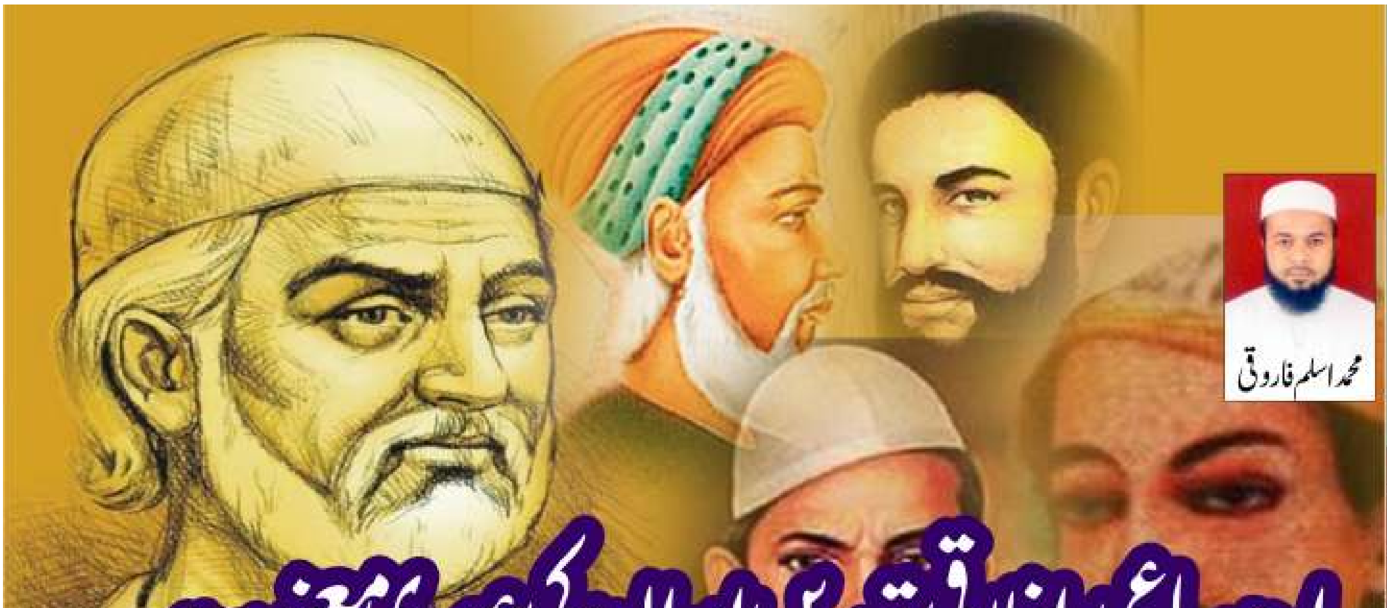

محمد اسلم فاروقی

اردو رباعی، اخلاقی قدریں اور ان کی عصری معنویت

رباعی اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔ چار مصرعوں کی اس صنف کو اردو شعرا نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اردو رباعی کے موضوعات اخلاقی، اصلاحی اور صوفیانہ ہوتے ہیں۔ جیسے دنیا کی بے ثباتی، سادگی، انکساری، ہمدردی، اطاعت الٰہی، خدا کی یاد، قناعت، صبر، شکر، غرور و تکبر سے بچنا، روحانی امراض اور دیگر اخلاقی موضوعات اردو رباعیوں میں پیش ہوئے ہیں۔ ادب کا ایک اہم مقصد تعمیر حیات بھی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ مغرب پرستی اور مادہ پرستی کے سبب دنیا سے انسانیت اور اخلاقی قدریں کم ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارے سماج میں نوجوانوں اور پیشہ ور افراد میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہے۔ نوجوان سگریٹ نوشی، شراب نوشی، بے دینی، اسراف اور دیگر لعنتوں کا شکار ہیں۔ جب کہ وہ قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی بروقت تعمیر، گھر، سماج اور ملک کی اہم ذمہ داری ہے۔ اسی طرح پیشہ ور افراد جیسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، پولس، تاجر اور مختلف محکمہ جات میں کام کررہے ملازمین میں بھی پیشہ ورانہ اقدار کی کمی ہے۔ رشوت ایک سماجی ناسور ہے جس کے سبب ملک کھوکھلا ہوتا جارہا ہے۔ اور سماج میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ نئی نسل کو بہتر اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ ایک اچھے انسان بن کر اپنی اور ملک وقوم کی بھلائی کرسکیں۔ اس کے لیے جو اقدامات کیے جارہے ہیں ان میں صالح ادب کے ذریعے تعمیر انسانیت بھی ایک اہم پہلو ہے۔ عصر حاضر میں اقدار کی شکست وریخت کو دیکھ کر یہ محسوس کیا گیا کہ اردو رباعی کی شکل میں ہمارے پاس ایک اہم تہذیبی سرمایہ ہے جس کی عصری معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے ہم تعمیر انسانیت اور تعمیر سماج کے ایک اہم فریضہ کو انجام دے سکتے ہیں۔

اُردو میں رباعی گوئی فن اور روایت

رباعی عربی زبان کے لفظ 'ربع' سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں چار مصرعوں والی نظم کو 'رباعی' کہتے ہیں۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں کوئی بات کہی جاتی ہے تیسرے مصرعے میں بات کو اٹھایا جاتا ہے اور چوتھے مصرعے میں بات انجام کو پہنچائی جاتی ہے۔ اس لیے رباعی کا چوتھا مصرعہ پرزور ہوتا ہے۔ رباعی میں بحر اور قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ رباعی مقررہ بحر میں کہی جاتی ہے اس کے لیے مخصوص بحر ہزج مقرر ہے۔ عام طور پر رباعیات 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' کے وزن پر لکھی جاتی ہیں۔

ابتدا میں رباعی صرف عورتوں اور بچوں تک محدود تھی۔ تاہم جب رباعی کو پسند کیا جانے لگا تو صوفیائے کرام نے اس صنف سے دلچسپی لی۔ اور اس میں تصوف و معرفت، عشق ومحبت، عمل واخلاق، فقر وغنا اور توبہ ومغفرت کے موضوعات شامل کیے۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی میں مذہبی، اخلاقی اور صوفیانہ، حکیمانہ اخلاقی باتیں کہی جاتی ہیں۔ فارسی شاعر 'رودکی' کو عام طور پر رباعی کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ عمر خیام کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اردو رباعی کی روایت

یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو میں رباعی کی روایت فارسی سے شروع ہوئی۔ اردو رباعی فارسی کے رنگ میں کہی جاتی ہے۔ لیکن اس میں ہندوستانی اثرات شامل کیے گئے۔ اردو رباعی ہندوستان کے ہر دور کی شاعرانہ خصوصیات اور انقلابات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ اردو میں قلی قطب شاہ، امیر خسرو، وجہی، غواصی، ولی، سراج، سودا، میر، انیس، حالی، اکبر، فراق، جوش اور امجد حیدرآبادی رباعی کے مشہور شعراء گذرے ہیں۔

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ اس نے حمد اور نعت کے موضوعات کو رباعی میں پیش کیا ہے۔ اس کی ایک رباعی اس طرح ہے۔

جیتا توں دل و جیو سو قران دیکھے ۔۔۔ احمد کے سوتق پر توں سب احسان دیکھے
دیکھ حلقہ خاتم النبیین ہیں توں ۔۔۔ دل میں سوں تا اضیع رحمان دیکھے

دکنی کے دیگر اہم شعرا نے بھی رباعی گوئی کے فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ شمال میں درد، میر سوز، سودا، میر حسن، میر انیس اور میر تقی میر رباعی کے ابتدائی دور کے مشہور شعرا ہیں۔ میر درد کی رباعیوں میں تصوف کی جھلک ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں ۔۔۔ ہر حرف میں کتنے ہی ورق پڑھتا ہوں
اس علم کی انتہا سمجھنا آگے ۔۔۔ اے درد ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

شمال میں رباعی کے بڑے شاعر کے طور پر انیس ابھر کر آتے ہیں انیس نے مرثیہ کے علاوہ رباعی گوئی کے فن کو بھی عروج تک پہونچادیا۔ انیس کے کلام میں انسانی اقدار اور اخلاقیات کے موضوعات ملتے ہیں۔ انیس نے ایک رباعی میں انسانی زندگی کے حقائق اس طرح پیش کیے۔

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی ۔۔۔ ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا ۔۔۔ جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

حالی نے سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر اپنی رباعیوں میں اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کو پیش کیا۔ 1857 کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ لوگوں میں پائی جانے والی بے عملی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے فرد کی تعمیر ضروری تھی۔ چنانچہ حالی نے رباعی

گوئی کے مقررہ موضوعات سے اچھا کام لیا۔ان کی ایک رباعی لوگوں کو یہ پیام دیتی ہے۔

یارو نہیں وقت ہے آرام کا یہ   موقع ہے آخیر فکر انجام کا یہ
بس حب وطن کا جپ چکے نام بہت   اب کام کرو کہ وقت ہے اب کام کا یہ

حالی کی مقصدیت کو آگے بڑھاتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے طنز ومزاح کے روپ میں اپنی رباعیاں پیش کیں۔ اکبر نے اپنی نظموں کی طرح رباعیوں میں بھی انگریزی تہذیب کی مخالفت کی۔انگریزی تہذیب کے اثرات کی بدولت مسلمان مذہب اسلام سے بیزاری اختیار کر رہے تھے۔اس بات سے فکر مند ہو کر اکبر کہتے ہیں۔

سید صاحب جو سکھا گئے ہیں شعور   کہتا نہیں تم سے کہ ان سے نفور
سوتوں کو جگایا ہے انہوں نے لیکن   اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

رباعی گوئی کے اس سفر میں ایک اہم نام جوش کا ہے۔ جو شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے مشہور ہیں۔اپنی رباعیوں میں انہوں نے عیش کوشی اور غم فراموشی کو موضوع بنایا۔ان کی ایک رباعی اس طرح ہے۔

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ   اپنی ہی عبائیں سی رہے ہیں جو لوگ
انسان کو بھی ہے کیا شراب پینے سے گریز   ان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

فانی نے غزل کے موضوعات کو اپنی رباعیوں میں بھی برتا۔ اور غم کے جذبات کو پیش کیا۔ فانی ایک رباعی میں زندگی کی تصویر یوں بیان کرتے ہیں۔

ناکام ازل کی کامرانی معلوم   قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے مرنا شاید   ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

رباعی کے اس سفر میں اہم نام امجد حیدر آبادی کا ہے۔امجد کو سرمد ثانی کہا گیا ان کی رباعیاں تصوف، اخلاق اور انسانی اصلاح کا اہم سبق فراہم کرتی ہیں۔

ہر چیز مسبب سے سبب سے مانگو   منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو   بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

فراق کی رباعیاں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی رباعیوں کے مجموعے کا نام 'روپ' ہے۔ انھوں نے رباعی کے دامن کو وسیع کیا اور سنسکرت کے سنگھار رس کو اردو رباعی میں برتا۔ رباعی کے عمومی موضوعات بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔ انسان کو اس کے مقام کا تعین کراتے ہوئے ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں۔

پاتے جانا ہے اور نہ کھوتے جانا ہے   ہنستے جانا ہے اور نہ روتے جانا ہے
اول اور آخر پیام تہذیب   انسان کو انسان ہوتے جانا ہے

اردو رباعی کے فروغ میں چند ایک غیر مسلم شعرا نے بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔فراق کے علاوہ رباعی کے فروغ میں ایک اہم نام جگت موہن لال رواں کا ہے۔ انھوں نے رباعی کے روایتی موضوعات کو برتا۔ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں۔

افلاس اچھا، نہ فکر دولت اچھی   جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاح نفس ناممکن ہو   اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

رباعی گوئی کا سفر اردو شاعری کے سفر کے ساتھ جاری وساری ہے۔ رباعی کے ساتھ قطعات کہنے کا رواج عام ہونے لگا ہے۔ لیکن موضوعات کے اعتبار سے آج بھی اردو شاعری رباعی کے ذریعے سماجی اصلاح کا اہم کام لے سکتی ہے۔

اردو رباعیوں میں اخلاقی پیغام

اخلاقیات رباعی کا بنیادی اور اہم موضوع رہا ہے۔ اردو کے سبھی رباعی گو شعرا نے اپنی رباعیوں میں اخلاق کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ انسان کے اخلاق کی تعمیر ہو تو ایک بہتر معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل میں شاعر اپنا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ اچھے اخلاق کیا ہیں۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ساری زندگی اچھے اخلاق ہیں۔ اگر کوئی آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اختیار کر لے تو وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب سمجھا جائے گا۔ دین اسلام اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اس کے علاوہ سماج اور اس کے قوانین بھی اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے مادہ پرست اور اخلاق سے عاری سماج میں اردو رباعیات کا مطالعہ وقت کی اہم ضرورت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اردو کے مختلف شعرا کی رباعیوں کے انتخاب کے ساتھ ان میں موجود اخلاقی اور عصری معنویت کے پیغام کو پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو رباعیوں میں اخلاقی پیغام اور ان کی عصری معنویت

امجد حیدر آبادی 1961-1885 اردو رباعی کے مشہور شاعر گزرے ہیں انھیں سرمد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ان کی رباعیوں میں موجود اخلاقی پیغام اس طرح ہے۔

تصوف: تصوف اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ رباعی گو شعرا نے بھی بندے اور خدا کے تعلق اور بندے کی خدا سے محبت اور خدا کی یاد اور اس کی تڑپ میں جینے کے بارے میں رباعیوں میں اظہار خیال کیا ہے۔امجد نے تصوف کے موضوع کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ وحدت الوجود کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں۔

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو   ہر بت میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم   ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھ

عشق حقیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں۔

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے   پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں   میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آیا ہے

قناعت: امجد نے اپنی رباعیوں میں جابجا لوگوں کو قناعت کا سبق دیا ہے۔ وہ خود ایک صوفی منش انسان تھے۔ اور وہ لوگوں کو توکل کی تعلیم دیتے ہیں۔ جو ملا اس پر شکر کرنے اور دولت سے دور رہنے کے بارے میں کہتے ہیں۔

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے   بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کردی   دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

انفاق فی سبیل اللہ: دولت انسان کو خدا کی طرف سے ملنے والی ایک ایسی نعمت ہے جس کا اسے خدا کے حضور حساب دینا ہے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اس دنیا میں اطاعت الٰہی کے ساتھ زندگی گذارنے والے انسان کو اگر دولت مل جائے تو وہ اس دولت کا اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کرے گا۔ اور جن لوگوں کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ عبادت الٰہی کے ذریعے خدا کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امجد اس پہلو کو ایک رباعی میں یوں اجاگر کرتے ہیں۔

خالق نے جنھیں دیا ہے زر دیتے ہیں   زر کیا ہے خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجود   سامان نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

حب جاہ: حب جاہ ایک روحانی بیماری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی عزت ہو اس کے لیے وہ اپنے طور سے کوشش کرتا ہے۔ جس طرح خالی برتن زیادہ آواز دیتا ہے۔ دنیاوی عزت کے طلب گار بھی اپنی تعریف خود کرنے لگتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا دینا اور لینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان صدق دل سے کام کرتا رہے تو اسے دنیا میں حقیقی عزت ملے گی۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے   وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا اپنی آپ   جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

کم ظرفی: دولت انسانوں کو کم ظرف بنا دیتی ہے۔ جب کہ دولت جانے والی چیز ہے۔ دولت پا کر انسان ہیچ اور ہلکا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام بیان کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے   مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے

کرتے ہیں ذرا سی بات پہ فخر خسیس   تنکہ تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

یہ بہت بڑی سماجی بیماری ہے۔ نئے دولت مند اپنی شان وشوکت دکھانے کے لیے اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ جب تک ان کے پاس دولت رہے وہ پانی کے بلبلے کی طرح اتراتے رہتے ہیں اور جیسے ہی دولت ختم ہوجائے ان کی شان وشوکت چلی جاتی ہے۔

انسانی مظالم: انسان اپنی طاقت کا غلط استعمال کرکے لوگوں پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے۔ یہ طاقت اقتدار، دولت، عہدے اور دیگر سہولتوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ ظالم اور مظلوم کی کشمکش ہر سماج میں ہے۔ انسانی مظالم بعض مرتبہ اس قدر شدید ہوجاتے ہیں کہ شیطان بھی انسان کے کارناموں پر افسوس کرتا ہے۔ قتل وغارت گری دھوکہ دہی، عصمت ریزی کمزوروں پر ظلم کرنا عام ہوتا جارہا ہے۔ امجد اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اک اک کی تاک میں لگا رہتا ہے   خوں ایک کا اک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبثِ باطنی کے آگے   شیطان بھی لاحول ولا پڑھتا ہے

خواجہ الطاف حسین حالی (1837-1914) اُردو کے مشہور شاعر نقاد سوانح نگار اور ادیب گزرے ہیں۔ غالب کے شاگرد تھے۔ سرسید کی علی گڑھ کی تحریک میں حصہ لیا۔ نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ مشہور نظم 'مد و جزر اسلام' لکھی۔ اپنی تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اُردو میں تنقید کو فروغ دیا۔ 'یادگار غالب' حیات صادق اور حیات جاوید ان کی مشہور سوانحی کتابیں ہیں۔ حالی نے بھی کئی رباعیاں لکھیں ان کی رباعیاں اخلاقی پیغام دیتی ہیں۔

نیکی پر غرور: حالی لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ نیکی کے ساتھ خلوص بھی ہونا چاہیے دکھاوے کے لیے نیکی کرنا اخلاص کو ختم کردیتا ہے اور ریاکاری کو جنم دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں اس قسم کی نیکیوں کا کوئی اجر نہیں اس لیے حالی نیکی کے ساتھ اخلاص کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت   ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص   نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

وقت کی قدر

حالی اپنی رباعی میں کہتے ہیں کہ اس فانی دنیا میں انسان کو ملنے والا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی بڑا کام شروع کیا جائے تو اس کو انجام تک پہنچانے کے لیے اس کے ایک ایک لمحے کو قیمتی جان کر مقصد حاصل کرنا چاہیے۔

دنیا کو ہمیشہ نقش فانی سمجھو   روداد جہاں کو ایک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی بڑا کام   ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

اکبر الہ آبادی (1846-1921) اردو کے مشہور طنزیہ شاعر گزرے ہیں۔ اکبر نے اچھی رباعیاں کہی ہیں جس میں زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

محنت میں سکون

اکبر اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں مال و دولت کی ہوس اور عزت کی طلب بے کار ہے اور اس میں ذلت ہی نصیب ہوتی ہے۔ انسان اگر حقیقی سکون تلاش کرنا چاہتا ہے تو اسے محنت کرنا چاہیے کیوں کہ محنت سے ملی کامیابی میں حقیقی راحت ہوتی ہے۔

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش   ذلت ہے دراصل جاہ وشوکت کی تلاش
اکبر تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈ   محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

غصے پر قابو رکھنا

اکبر اپنی ایک رباعی میں لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ غصہ نہ کریں بلکہ لوگوں کے بارے میں اچھی رائے رکھیں اور لوگوں کو معاف کرتے رہیں۔ دل میں کینہ رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا   احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر   لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

شیخ ابراهیم ذوق (1789-1854) اردو کے مشہور قصیدہ گو اور غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ عہد غالب کے شاعر تھے انہوں نے اپنی رباعیوں میں بھی بہت سا اخلاقی پیغام دیا ہے۔

ذات کی نفی اور اللہ کی بڑائی

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا   ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ بھی ہوا، ہوا کرم سے تیرے   جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

شیخ ابراہیم ذوق اپنی اس رباعی میں کہتے ہیں کہ انسان اپنی ذات سے کچھ نہیں اور وہ دنیا میں جو کچھ کرتا ہے اس کی ذات کی صلاحیت کے سبب نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے کبھی فائدہ ہوتا ہے کبھی نقصان ہوتا ہے اس کے لیے انسان کو اپنی ذات کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے اپنے مالک کی مرضی سمجھنا چاہیے اور یہ امید رکھنا چاہیے کہ اللہ کا فضل رہے تو ہی سب کام اچھے ہوتے ہیں۔

پیغام: انسان جب اپنے آپ کو بندہ سمجھے اور اس کائنات کے مالک اللہ کی عظیم قدرت کا اعتراف کرے تو وہ سمجھ جائے گا کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے اللہ کی مرضی سے ہورہا ہے۔ انسان میں تخلیقی صلاحیت ہے اور وہ بڑے بڑے شاہکار انجام دے رہا ہے لیکن اس کے پیچھے بھی اس کے مالک کا کرم ہے اگر وہ یہ جان جائے تو نفع نقصان میں وہ اللہ کی مرضی دیکھے گا اور اس کی زندگی ہر حال میں شکر گزار رہے گی۔

میر ببر علی انیس (1802-1871) لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ انیس نے رباعی گوئی میں نام پیدا کیا۔ انیس کی رباعیوں میں مذہب اور اخلاق کی باتیں پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے دنیا کی بے ثباتی اور مشرقی تہذیب کو اپنی رباعیوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

ناقدری کا شکوہ

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے   ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا   رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

انیس نے اس رباعی میں انسان کو خدا کی طرف سے ملنے والی نعمتوں پر ناشکری کا انداز بیان کیا ہے۔ انیس کہتے ہیں کہ خدا نے ہر انسان ہر جاندار کو کچھ نہ کچھ صفت اور صلاحیت دی ہے۔ عقل، دولت، طاقت، حسن، فراست اور ہنر انسان کو ملنے والی چند صفات ہیں۔ انسانی جسم میں خدا کی کئی نعمتیں پوشیدہ ہیں۔ خدا نے انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھ اور کام کرنے کے لیے ہاتھ، چلنے کے لیے پیر، سننے کے لیے کان دیے ہیں۔ اسی طرح لوگ کئی ہنر سیکھتے ہیں۔ لیکن ہر انسان اپنی حاصل نعمت اور صلاحیت سے مطمئن نہیں ہے۔ جب بھی اُس سے پوچھا جائے تو وہ ناشکری ظاہر کرے گا۔ مثال دیتے ہوئے انیس کہتے ہیں کہ شبنم سے اگر پوچھا جائے کہ اُسے خدا نے کیسا بنایا۔ تو وہ بھی روتے ہوئے کہے گی کہ میں اک ناچیز قطرہ ہوں مجھ میں کیا ہے جبکہ ایک شبنم کا قطرہ ہریالی پر پڑتا ہے تو موتی کی طرح چمکتا ہے۔ موسم کو ٹھنڈا کرتا ہے اور شاعری کے لیے خیال کا ذریعہ بنتا ہے۔

شبنم کی مثال دیتے ہوئے انیس اُن تمام لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم خدا سے اپنی غریبی اور پریشانیوں کا شکوہ نہ کریں بلکہ خدا نے جس حال میں رکھا ہے اُس پر شکر ادا کریں تو خدا اس میں مزید نعمتیں دیتا ہے۔ پریشانی میں صبر کرنا اور خوشحالی میں شکر کرنا نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔

عارضی جوانی طویل بڑھاپا

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی   ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا   جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

انیس نے اس رباعی میں اس دنیا اور یہاں کی زندگی کی بے ثباتی (حیثیت) کا ذکر کیا ہے۔ انیس نے دنیا کو ایک فانی سرائے کہا ہے۔ انسانی زندگی کا مشاہدہ ہے کہ جب انسان سفر میں ہوتا ہے تو اپنے ساتھ مختصر سامان اور توشہ رکھتا ہے اور وہ کسی سرائے میں ٹھہرتا ہے تو عارضی مدت کے لیے قیام کرتا ہے۔ سرائے ایک ایسی جگہ ہے جہاں

لوگ آتے ہیں اور کچھ دن رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس دنیا کی زندگی اور آخرت کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کے مقابلہ میں انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ انسان پیدائش کے ساتھ دنیا کے سرائے میں قدم رکھتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزل سے گزر کر یہ دنیا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ انسان اپنی نظر سے دیکھ رہا ہے کہ اُس کا جانا یقینی ہے اور آگے پیچھے سب ہی جا رہے ہیں۔ انسان جب جوان رہتا ہے تو اسے یہ دھوکا رہتا ہے کہ اُس کی جوانی بہت دیر تک رہے گی۔ جوانی میں انسان چست رہتا ہے، بہت کام کرسکتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ انسان اپنی جوانی کا صحیح استعمال کرلے اور اس کو نیک کاموں میں استعمال کرے۔ لیکن شیطان انسان کو بہکاتا ہے کہ ابھی تیری جوانی بہت پڑی ہے۔ اب کچھ گناہ کرلے بعد میں کچھ ثواب کے کام کرلینا۔ انسان جوانی کے نشہ میں نافرمانیاں کرتا رہتا ہے کہ وہ ادھیڑپن اور بڑھاپے میں داخل ہوجاتا ہے۔ تب اُسے احساس ہوتا ہے کہ ہائے میں نے اپنی جوانی نافرمانی میں گزار دی اور نیکی کا کچھ کام نہیں کیا۔ اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ اب کچھ نیک کام کرنا چاہتا ہے لیکن بڑھاپے کی کمزوری اُسے کچھ بھی کرنے نہیں دیتی۔ جوانی کا زمانہ جلدی گزر جاتا ہے اور بڑھاپا آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔ بالآخر اپنی زندگی پر افسوس کرتے ہوئے انسان اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ وقت کی قدر کرے اور زندگی کے قیمتی ایام کو خدا کی عبادت میں گزار دے۔ تب ہی وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب رہ سکتا ہے اور اس فانی دنیا میں مختصر قیام کے دوران ہمیشہ ہمیشہ کی حیثیت کو یقینی بنا سکتا ہے۔ اس رباعی میں لوگوں کے لیے انیس کا یہی پیغام ہے۔

بابو جگت موہن لال رواں (1889-1934) مشہور رباعی گو شاعر گزرے ہیں۔ اُن کی رباعیوں کا مجموعہ 'روحِ رواں' کے نام سے مقبول ہوا۔ اُنھوں نے اپنی رباعیوں میں انسانوں کو بُرے کاموں سے روکنے اور اچھے کام کرنے کی تلقین کی۔ دنیا سے محبت نہ رکھنے اور دنیاوی کاموں میں رغبت نہ رکھنے کا پیغام دیا۔ اُن کی رباعیوں میں واعظانہ رنگ نہیں ہے۔ البتہ روزمرہ زندگی میں اخلاقی اقدار کی پاسداری کی اہمیت ملتی ہے۔ اُن کی ایک رباعی اس طرح ہے۔

افلاس اچھا، نہ فکرِ دولت اچھی جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

جگت موہن لال رواں نے اس رباعی میں انسانوں کو متوازن زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے۔ رباعی کے پہلے مصرعے میں وہ فکر معاش کے سلسلے میں دو قسم کے لوگوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو قسمت کی خرابی یا سستی یا کاہلی اور نااہلی کے سبب مفلس اور غریب رہتے ہیں۔ انھیں دو وقت کی روٹی بھی چین سے نصیب نہیں ہوتی۔ افلاس اور ناداری اچھی بات نہیں۔ انسان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ جدوجہد اور حرکت کرنی چاہیے۔ سائل اور فقیر افلاس کو دور کرنے کے لیے در در بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ جب انسان کے دو ہاتھ دو پیر سلامت ہوں اور وہ اچھی صحت والا ہو تو اسے بھیک مانگ کر ذلیل ہونے کے بجائے محنت و مزدوری کرکے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنا چاہیے۔ اکثر حالات میں غربت و افلاس کی وجہ سے انسان کی سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ اس لیے چستی، حرکت و عمل، محنت و مزدوری کے ذریعہ افلاس کو دور کرنے کے طریقے اختیار کرنے چاہیے۔ اگر انسان کمزور و ناتواں ہو، ضعیف و بوڑھا ہو، بے سہارا ہو اور افلاس کا مارا ہو تو اسے صبر کرتے ہوئے خدا سے افلاس کی دوری کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ رواں دوسرے قسم کے انسانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو فکر معاش اور دولت کے حاصل کرنے میں حرص اور لالچ بڑھ جاتی ہے اور وہ دولت حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ راتوں رات دولت مند ہوجائیں۔ انھیں دولت میں ہی زندگی کا ہر عیش و آرام دکھائی دیتا ہے۔ ہر مسئلے کا حل دولت میں دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ رات دن دولت کے حصول میں لگ جاتے ہیں۔ رواں ایسے لوگوں کو باخبر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں حصول دولت ہی سب کچھ نہیں۔ انسان کو اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔ اس لیے دولت حاصل کرنے کی دُھن میں لگنا اچھی بات نہیں۔ رباعی کے تیسرے مصرعے میں بات کو اُٹھاتے ہوئے رواں کہتے ہیں کہ مادی خواہشات انسان کے نفس کو اپنا غلام بنالیتی ہیں۔ انسان نفس کا تابع ہوجاتا ہے اور وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پس پشت ڈال کر چاہتوں کی تکمیل میں لگ جاتا ہے اور بالآخر بُرائی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اس لیے رواں رباعی کے آخر میں کہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی زندگی کو نقصان پہنچانے والے عیش سے دنیا کی مصیبت بہتر ہے کیونکہ زندگی کے خاتمہ کے ساتھ مصیبتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن عیش کی زندگی پر خاتمہ ہو تو مرنے کے بعد اور آخرت میں انسان کو ہمیشہ کی مصیبت میں گھر جانا ہوتا اس لیے وہ انسانوں کو اعتدال پسندی کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

پیغام: افلاس اور عیش پسندی دونوں ہی انسان کے لیے پریشان کرنے والی حالتیں ہیں۔ انسان کو زندگی اعتدال اور توازن کے ساتھ بسر کرنی چاہیے۔

اردو رباعی سے اخلاقی تربیت اور سماجی تعمیر ممکن ہے

اردو رباعیوں میں پوشیدہ اخلاقی اور اصلاحی پیغام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اردو شاعری کی اس صنف میں انسانی اخلاق کی تعمیر اور بہتر سماج کی تشکیل کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔ ایک طرف دنیا سکون کی تلاش میں ہے اور انسانیت کے گرتے معیار سے پریشان ہے ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے پریشان ہیں۔ اساتذہ طلباء کے بگڑتے اخلاق سے پریشان ہیں۔ شہری عوام سے پریشان ہیں اور ملک اپنی رعایا سے اور دنیا اس کرہ ارض پر رہنے والے انسانوں کی بری حرکات سے پریشان ہیں تب ایسی عالمی تباہی کے موقع پر ادب کو اصلاح کا ذریعہ بنا کر بہت بڑا تعمیری کام کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو رباعیوں میں موجود اس پیغام کو عام کیا جائے اس کے لیے حسب ذیل تجاویز پیش کی جارہی ہیں۔

اردو رباعیوں میں موجود پیغام کو عام کرنے کی تجاویز

* اردو رباعیوں میں موجود پیغام کو تراجم کے ذریعے دنیا کی سبھی زبانوں میں عام کیا جائے۔
* اردو رباعیوں کو مسلسل نصاب کا حصہ بنایا جائے۔
* اردو رباعیوں کے پیغام کو سوشل میڈیا کے ذریعے عام کیا جائے۔
* اردو رباعیوں کے پیغام کو ڈرامائی شکل کے ذریعے عام کیا جائے۔

کتابیات

- جمال امجد: امجد حیدرآبادی
- پیام امجد: امجد حیدرآبادی
- رباعیات امجد: امجد حیدرآبادی
- نذر امجد: امجد حیدرآبادی
- روپ: فراق
- اردو شاعری کا مزاج: وزیر آغا
- شاعری اور شاعری کی تنقید: عبادت بریلوی
- جدید اردو تنقید اصول و نظریات: شارب ردولوی
- رباعیات انیس: انیس
- حکایات امجد: امجد حیدرآبادی
- گلستان امجد: امجد حیدرآبادی
- ریاض امجد: امجد حیدرآبادی
- اردو رباعیات: سلام سندیلوی
- مقدمہ شعر و شاعری: حالی
- اردو شعریات: آل احمد سرور
- ادب کا مطالعہ: اطہر پرویز
- رباعیات حالی: حالی

■

Dr. Mohammed Aslam Faroqui
Asst Prof & Head, Dept of Urdu
NTR Govt Degree College for Women
Mahabubnagar- 509001 (Telangana)

قمر اقبال

علامہ شبلی اور جدید عربی زبان

شبلی نعمانی ہندوستان کے ان چند ناموروں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی ہمہ جہت شخصیت سے تاریخ کے صفحات پر اپنے لیے مستقل جگہ بنائی ہے۔ جدید ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں شبلی ایک ایسا نام ہے جو علم و ادب کے ہر موڑ پر دکھائی دیتا ہے چاہے اردو ادبیات ہو یا فارسی شعریات، علم کلام ہو یا تاریخ نگاری یا پھر سیرت نبوی کا میدان، ان میں شبلی نے بیش قیمت کتابیں چھوڑی ہیں جو آج بھی اہل علم کو سیراب کرتی ہیں۔ عربی ادبیات کے ضمن میں شبلی نے بہت زیادہ نہیں لکھا ہے چند مضامین ہیں یا پھر مذہبی اور تاریخی نوعیت کے چند رسالے، لیکن یہ مضامین اور رسالے شبلی کو اس میدان کا بھی مرد ثابت کرتے ہیں۔ جدید تنقیدی انداز کے یہ مضامین شبلی کو عربی ادبیات کی اساس کی طرف لے جاتے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شبلی اگر 'شعر العرب' لکھتے جیسا کہ ان کا ارادہ تھا، تو 'شعر العجم' سے زیادہ معرکہ کا کام سامنے آتا۔ ذیل میں کوشش ہوگی کہ ادبیات سے ہٹ کر خالص عربی زبان کے حوالے سے اور جدید عربی کو رائج کرنے کی غرض سے جو کاوشیں شبلی نے کی ہیں ان کا جائزہ پیش کیا جائے۔

مولانا شبلی کا زیادہ کام اردو میں ہے لیکن عربی زبان میں جو ورثہ انھوں نے چھوڑا ہے، وہ اپنے آپ میں شبلی کو عربی کے میدان میں بھی بڑا مرتبہ دلاتا ہے۔ عربی زبان میں مولانا کی کتابیں اسکات المعتدی علی انصات المقتدی، الجزیۃ ، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی اور تاریخ بدء الاسلام ہیں۔ یہ کتابیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، تاریخ اور مذہبیات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عربی قصیدہ اور تین عربی خطوط محفوظ ہو پائے ہیں۔ ان عربی نمونوں پر ان کے شاگرد اور شبلی کے مشن کو مکمل کرنے والے ہندوستان کے مایہ ناز ادیب و عالم سید سلیمان ندوی نے مولانا کے انداز تحریر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اپنے آپ میں شبلی کی عربی دانی کا اعتراف ہے۔ مولانا کے جن خطوط کو سید سلیمان ندوی نے محفوظ کر دیا تھا، ان کے انداز تحریر پر سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''ان کی انشاپردازی اسی زمانے میں کیسی صاف، دلچسپ، فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی جو ہندوستانیت اور متاثرین کے تکلفات سے پاک ہیں۔''

(حیات شبلی، ص 111)

شبلی کی مشہور زمانہ عربی کتاب جو قسط وار صاحب المنار نے شائع کی تھی اور جو بعد میں الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، اس کے انداز بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب نے لکھا ہے:

''اس رسالہ کی تحریر بڑی انشاپردازانہ ہے۔ مولانا عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے، جس زمانے میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے، جاحظ کی البیان و التبیین اور کتاب الحیوان اکثر ان کے مطالعہ میں رہیں۔''

(ایضاً، ص 450)

سید سلیمان ندوی کے اس تبصرے کو کسی شاگرد کا اپنے استاذ کے حق میں جوشِ عقیدت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مولانا کی اس کتاب میں جو عالمانہ شان ہے اس کی بنیاد پر کوئی بھی عربی عالم بجا طور سے اسی قسم کا تبصرہ کرنے پر مجبور ہوگا۔ عالم عرب میں انیسویں صدی کے اواخر میں دو طرح کے اسلوب رائج تھے۔ ایک تو تکلفات سے بھرپور قاضی فاضل اور حریری کا اسلوب، دوسرے ابن مقفع اور جاحظ کا اسلوب۔ شبلی چونکہ بڑے عالم تھے اور علمی کتاب لکھ رہے تھے؛ اس لیے انھوں نے تکلفات کو خارج کر کے علمی انداز تحریر اپنایا۔ اردو نثر میں بھی مولانا کا یہی اسلوب تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر تک عربی زبان کے طریقہ تعبیر میں بڑی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان کا عربی داں طبقہ بشمول شبلی اس سے نابلد تھا؛ کیونکہ باہمی روابط و تعلقات کی جو آسانیاں آج میسر ہیں، اس وقت موجود نہیں تھی۔ شبلی کی اس سے قبل جو عربی تحریریں ہیں، ان کا اسلوب اکتسابی تھا۔ بھلا ہو کہ شبلی کو ترکی و مصر و شام کے سفر کا موقع مل گیا، ان ممالک میں جہاں انھوں نے بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کیا، وہیں عربی کی جدید صحافت کے رنگ و آہنگ کے سفر کا موقع مل گیا، ان ممالک میں جہاں انھوں نے بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کیا، وہیں عربی کی جدید صحافت کے رنگ و آہنگ سے بھی ان کی واقفیت حاصل ہوئی۔ شبلی کا عالم عرب کا دورہ، عرب فضلا سے ان کے رابطوں کی بڑی وجہ بنا۔ شبلی کے عالم عرب کے دورے سے قبل بھی بعض اہل علم شبلی کے ابتدائی عربی رسالے اسکات المعتدی کی وجہ سے ان کو غائبانہ جانتے تھے۔ شبلی کی علمیت کے اعتراف میں وہاں کے ایک رسالہ کے مدیر نے لکھا:

’’ان دنوں ہماری ملاقات عزت مآب عالم شیخ شبلی نعمانی سے ہوئی، جو کہ ہندوستان کے شہر علی گڑھ میں عربی علوم کے معلم اوّل ہیں، ان کی ذات میں ایک ایسا شخص نظر آیا جس کے پاس علم کی بہتات ہے۔ شیخ شبلی کو سلطنت ترکی کی جانب سے مجیدی تمغہ ملا ہوا ہے۔‘‘

(سفرنامہ روم و مصر و شام شبلی نعمانی شبلی اکاڈمی، اعظم گڑھ 2015، ص 143)

سید رشاد رضا سے بھی سفر روم و مصر و شام کے بعد برابر مولانا کی خط و کتابت رہی۔ 6 اپریل 1912 کو دارالعلوم ندوہ کے اندر ایک پروگرام کی صدارت کی غرض سے انھوں نے رشید رضا کو مدعو کیا، اور انھی کی دعوت پر صاحب المنار ہندوستان تشریف لائے۔ (حیات شبلی، ص 499)

انھیں رابطوں کی وجہ سے شبلی کو جدید عربی زبان کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس سے قبل علی گڑھ میں لجنۃ الادب کا قیام اس کا ثبوت ہے۔ زبان میں تحریر و تقریر کی مشق کی اہمیت ان کے سامنے عیاں تھی، عالم عرب سے لوٹنے کے بعد اس کا احساس دوچند ہوگیا تھا۔ اس ضمن میں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

’’مصر میں عربی زبان پر جو نئے نئے خیالات، نئی نئی باتوں کے لیے جو نئے نئے عربی لفظ بن گئے ہیں یہاں مولانا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا۔ غالباً ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا براہِ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی۔‘‘

(حیات شبلی، ص 215)

سید سلیمان ندوی کی اس بات کا ثبوت لگ بھگ 181 الفاظ کی وہ فہرست ہے جو شبلی نے سفرنامہ میں دی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو عالم عرب میں مستعمل تھے اور جن

جدید عربی زبان کی ترقی سے وابستہ مولانا کا دوسرا اہم کام مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح تھا۔ اس اصلاح میں جہاں اور بہت سی چیزیں تھیں، زبان کے واسطے سے بھی اس میں بڑا کام ہوا۔ ادب کی شرحوں کو نکال کر خالص ادبی کتب کو نصاب درس کا حصہ بنایا گیا۔ مدارس کے نصاب کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں عربی ادب اور عربی ادبیت کا حصہ بہت کم ہے، حالانکہ یہ امر یقینی ہے کہ ادب اور عربیت کے بغیر کسی چیز میں کمال نہیں پیدا ہوسکتا۔

کے مفہوم و طریقہ استعمال سے ہندوستان ناواقف تھا۔ ان الفاظ کی فہرست دیتے وقت شبلی نے زبان میں در آئی خرابیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کس طرح سے لوگ فصیح عربی زبان کے ضابطوں کو توڑ رہے ہیں اور اس میں طبقہ خواص بھی شامل ہے۔ مزید برآں کس طرح یوروپی زبانوں سے عربی میں الفاظ داخل ہو رہے ہیں۔

(سفرنامہ، ص 211-203)

شبلی کی عربی دانی سے متعلق اس گفتگو کے بعد ان کوششوں کا تذکرہ کیا جائے گا جو شبلی نے جدید عربی کو رواج دینے کی خاطر کیں۔ اگر شبلی کی جملہ کوششوں کا جائزہ لیا جائے اور اجمالی طور پر یہ کہا جائے کہ کسی زبان کو رواج دینے کی غرض سے جتنے ممکن راستے تھے شبلی نے سب کا تجربہ کیا تو مبالغہ نہ ہوگا؛ اس لیے کہ ان کی کوششوں کا دائرہ ذو الجہات ہے۔

پہلی جہت تو تحریر و تقریر کی مشق کے لیے علی گڑھ میں لجنۃ الادب کا قیام تھا۔ اس لجنۃ میں اس وقت کے ناموران علی گڑھ شامل تھے۔ سید کرامت حسین، لسانیات پر جن کی کتاب فقہ اللسان کو لسانیات کے ضمن میں زمانی تقدم حاصل ہے، وہ اس وقت کمیٹی کے صدر تھے۔ کسی بھی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تحریر و تقریر کی مشق کی کیا اہمیت ہے، اہل علم اس سے واقف ہیں۔ اس لجنۃ کے مقصد پر شبلی کی ایک تقریر سے روشنی پڑتی ہے، جو انھوں نے اس جلسے میں کی تھی، جو ان کے اعزاز میں عالم عرب سے واپسی پر 19 جنوری 1894 کو منعقد کیا گیا تھا۔ شبلی فرماتے ہیں:

’’حقیقت میں میرے لیے اس سے زیادہ فخر و انبساط کا کیا موقع ہوسکتا ہے کہ لجنۃ الادب کا جو اپنے قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، مقصد ہے کہ اس مقدس زبان میں ہم کو تقریر کرنا سکھائے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے۔‘‘

(سیرت شبلی، اقبال احمد خاں سہیل، شبلی اکاڈمی، اعظم گڑھ، ص 12 و 93)

اس تقریر سے شبلی کی ایک اور بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ عربی کی ضرورت کو جہاں مذہبی طور پر سمجھتے تھے، وہیں وہ اس کو اپنی قومی زبان کے طور پر بھی دیکھتے تھے۔ گویا شبلی کی قومیت کا تصور زبان کی حد تک اس قومیت کا پر تو تھا جس کے داعی افغانی تھے۔ اگر کوئی زبان قومی زبان کے طور پر سیکھی جائے تو اس کی ترقی کے لیے جدوجہد یقیناً قومی جدوجہد ثابت ہوگی اور عربی زبان کے ضمن میں شبلی کی کاوشیں اسی قومی جذبہ کے تحت تھیں۔ شبلی نے اس مذکورہ جہت سے زبان کی ترقی کا جو کام کیا اس کی افادیت آج بھی مستحکم ہے بلکہ آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ زبان کی تدریس سے جڑے تمام اداروں میں کسی نہ کسی طور پر تحریر و تقریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

جدید عربی زبان کی ترقی سے وابستہ مولانا کا دوسرا اہم کام مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح تھا۔ اس اصلاح میں جہاں اور بہت سی چیزیں تھیں، زبان کے واسطے سے بھی اس میں بڑا کام ہوا۔ ادب کی شرحوں کو نکال کر خالص ادبی کتب کو نصاب درس کا حصہ بنایا گیا۔ ’’مدارس کے نصاب کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں عربی ادب اور عربی ادبیت کا حصہ بہت کم ہے، حالانکہ یہ امر یقینی ہے کہ ادب اور عربیت کے بغیر کسی چیز میں کمال نہیں پیدا ہوسکتا۔‘‘

(خطبات شبلی، شبلی اکاڈمی، اعظم گڑھ 1998)

اصلاح نصاب کی تمام عملی دشواریاں شبلی کے پیش نظر

تھیں مثلاً کتب کی فراہمی، لائق اساتذہ کا ملنا یا پھر پرانے طبقے کی مخالفت، اس کے باوجود حیدرآباد اور لکھنؤ میں ان کی کوششیں ثمرآور ثابت ہوئیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلما میں زبان کی تدریس کے حوالے سے کیا گیا ان کا تجربہ آج بھی کسی حد تک جاری ہے۔ جدید عربی زبان کی ترویج میں ہندوستان کی حد تک دارالعلوم کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اس حوالے سے ہندوستان کا کوئی بھی مدرسہ یا جامعہ ندوۃ العلما کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتا۔ شبلی نے جو بیج بویا تھا اس کا ثمر ان کی زندگی ہی میں سامنے آنے لگا تھا۔ چنانچہ ندوہ قائم ہوئے ابھی صرف آٹھ نو برس ہوئے تھے کہ شبلی ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ندوہ کے مدرسے کی کل عمر ابھی آٹھ نو برس ہے لیکن انصاف سے بتانا چاہیے کہ آج تک کسی مدرسہ نے ایسے طلبہ پیدا کیے جو عربی زبان میں برجستہ تقریر کرسکتے ہوں اور علمی مضامین لکھ سکتے ہوں۔'' (خطبات شبلی، ص 12)

تحریر و تقریر میں اسی مہارت کی غرض سے شبلی عالم عرب کے اخبارات و رسائل کے مطالعے پر زور دیتے تھے۔ ڈھیر سارے رسائل مولانا کے پاس عالم عرب سے آتے تھے۔ احباب بھی ان سے اکثر اخبارات کا مطالبہ کرلیا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے شبلی کو اخبارات کے لیے لکھا تو شبلی نے جو جواب دیا، وہ عربی صحافت پر ان کی گہری نگاہ کی دلیل ہے۔ شبلی نے لکھا عربی اخبارات خود میرے پاس بہت سے آتے ہیں یعنی ثمرات، الفنون، طرابلس، الہلال وغیرہ اگر علمی مضامین چاہتے ہیں تو مصر کا ماہوار رسالہ المقتطف طلب فرمائیے، اگر پالیٹکس وغیرہ مقصد ہے تو قاہرہ کا اخبار المویّد۔''

(مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص 181)

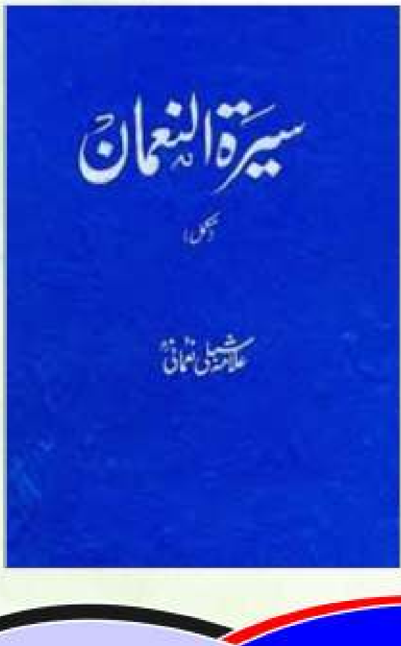

شبلی نے 'روم و مصر و شام' میں مصر کے اس وقت کے صحافتی منظرنامہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ مصر میں صحافتی آزادی ہے، تیس سے زائد اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور اخبارات ہر قسم کے معاملات پر نہایت آزادی سے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں پالیٹکس پر کم کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہمارے ہندوستان کے علما اس قسم کے مضامین پر چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتے اس لیے بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ پالیٹکس کے خیالات اس زبان میں پوری طرح ادا نہیں ہوسکتے، لیکن مصر کے اخبارات نے اس خیال کو قطعاً باطل کردیا ہے۔

(سفرنامہ، ص 191)

لجنة الادب کا بھی مقصد جدید انداز میں عربی زبان میں گفتگو اور جدید موضوعات پر اظہار خیال کی قدرت تھا؛ اس لیے شبلی ان رسائل کو لجنة کو بھی فراہم کراتے تھے اور چاہتے تھے کہ دیگر مدارس عربیہ بھی اس کی تقلید کریں۔

جدید عربی زبان کی ترویج کے ضمن میں شبلی کا ایک اور قدم ان کی دوراندیشی کی دلیل ہے۔ کسی بھی زبان میں ہونے والی تبدیلیوں سے کماحقہ آگاہ اور زبان کی باریکیوں کا صحیح ادراک اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اہل زبان کے ساتھ سیدھے طور پر گفتگو کرنے اور اٹھنے بیٹھنے کا موقع ہاتھ آئے۔ آج کل یہ کام بہت آسان ہوگیا ہے اور رابطے کی مختلف شکلیں پیدا ہوئی ہیں لیکن آج سے سو سال قبل اس طرح کی بات سوچنا اور اس پر عمل کی تدبیر کرنا بڑی ہمت کی بات تھی۔ شبلی چاہتے تھے کہ ہندوستانی طلبہ عالم عرب جائیں اور زبان کا صحیح علم حاصل کریں۔ گوکہ مذہبیات کی تحصیل کی غرض سے ہندوستانی طلبہ عالم عرب پہلے ہی سے جارہے تھے، لیکن خاص زبان سیکھنے کی غرض سے جانا اس وقت بڑی انقلاب آفریں سوچ تھی، جس کا کریڈٹ شبلی کو جاتا ہے۔ شبلی نے سلیمان ندوی کو اس غرض سے مصر بھیجنا چاہا لیکن بوجوہ یہ کوشش ناکام رہی۔ (حیات شبلی، ص 422)

جدید عربی زبان کی ترویج کی غرض سے شبلی کے ذہن میں ایسی کتب کی فراہمی کا خیال بھی تھا جو جدید انداز میں لکھی گئی ہوں، چنانچہ انھیں کی ایما پر سلیمان ندوی نے دروس الادب مرتب کی اور جدید الفاظ پر مشتمل ڈکشنری بھی ترتیب دی جس کا اجرا صاحب المنار کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں عمل میں آیا۔

(ایضاً، ص 423)

ہندوستانی مصنفین نے بعد میں اس جہت سے بڑا

شبلی نے 'روم و مصر و شام' میں مصر کے اس وقت کے صحافتی منظرنامہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ مصر میں صحافتی آزادی ہے، تیس سے زائد اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور اخبارات ہر قسم کے معاملات پر نہایت آزادی سے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں پالیٹکس پر کم کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہمارے ہندوستان کے علما اس قسم کے مضامین پر چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتے اس لیے بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ پالیٹکس کے خیالات اس زبان میں پوری طرح ادا نہیں ہوسکتے، لیکن مصر کے اخبارات نے اس خیال کو قطعاً باطل کردیا ہے۔

کام کیا ہے لیکن اس وقت اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر اس کا روبہ عمل لانے کی ترکیب سوچنا اور لوگوں کو اس واسطے تیار کرنا اپنے آپ میں انقلابی قدم تھا۔

درج بالا باتوں کو دیکھنے کے بعد اگر یہ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں جدید عربی زبان کے تعارف اور ترقی میں شبلی کا بڑا اہم رول ہے، بلکہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندوستان کی توجہ نہ صرف اس جانب مبذول کرائی بلکہ اس کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ شبلی جس طرح علم کے دوسرے میدانوں میں چاہتے تھے کہ ہندوستانی علما وقت کے شانہ بہ شانہ ہوں، اسی طرح زبان کے معاملے میں بھی ان کی خواہش تھی کہ وہ نئی نئی تبدیلیوں سے آشنا ہوں۔ چونکہ عربی کو وہ اپنی قومی زبان تصور کرتے تھے اس لیے زبان کی اصلاح کا جذبہ قوی تر ہوگیا تھا، ان کی عبقریت کی دلیل جہاں ان کے بے شمار کارنامے ہیں وہیں زبان کے ضمن میں کی گئی ان کی کاوشیں بھی ہم عصروں میں ان کا مرتبہ بلند کرتی ہیں۔ عہد حاضر کے ہندوستان کے سب سے بڑے عالم علامہ سید ابوالحسن نے حیات عبدالحی میں شبلی کی تمام جہت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ شبلی کی معتمدی کے زمانے میں دارالعلوم میں جان آگئی تھی۔

(حیات عبدالحی، ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ، ص 160-161)

یہی جان ہے جس نے آج تک دارالعلوم ندوۃ العلما کو بلند مقام پر فائز رکھا ہے۔

■

Qamar Iqbal
Dept of Arabic
Lucknow University
Lucknow - 226007 (UP)

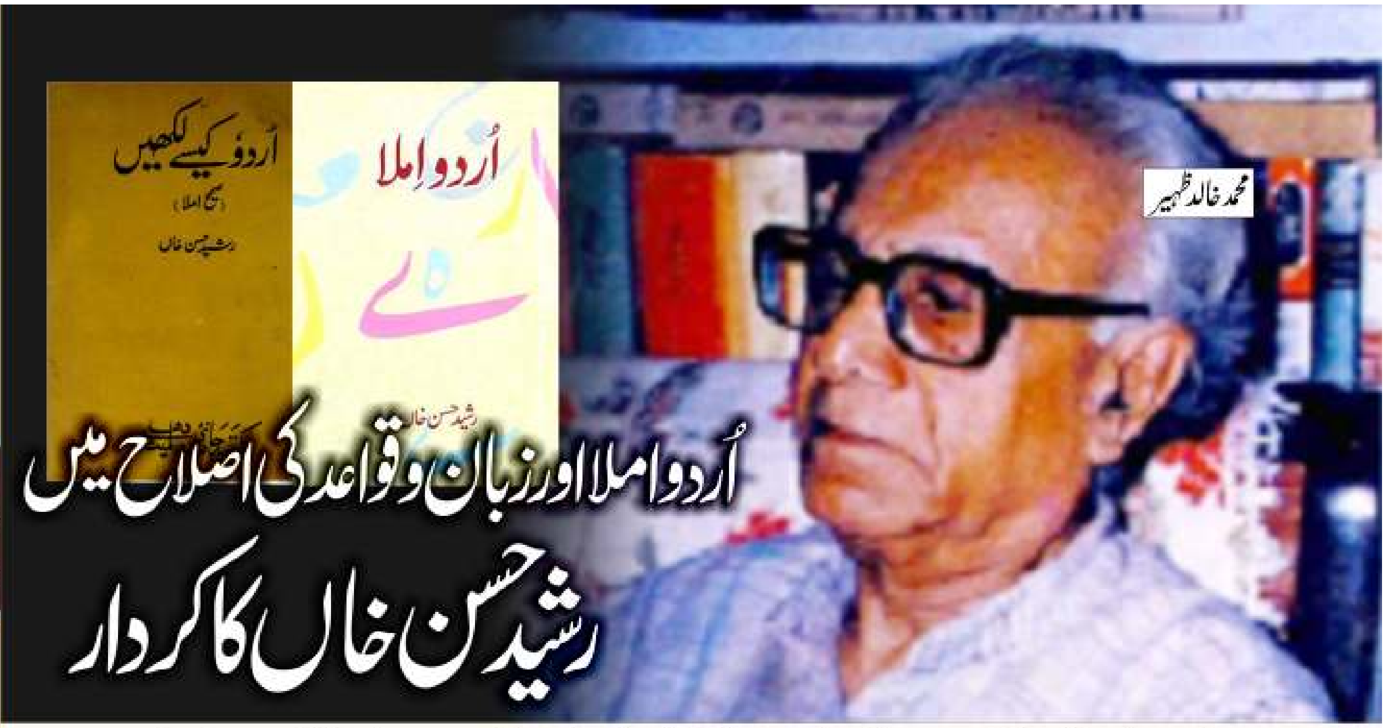

محمد خالد ظہیر

اُردو املا اور زبان و قواعد کی اصلاح میں رشید حسن خاں کا کردار

اُردو ادب کی تاریخ میں رشید حسن خاں اس روشن ستارے کی مانند ہیں جس کی روشنی اور تاب ناکی سے آئندہ نسل استفادہ کرتی رہے گی۔ یہ نابغۂ روزگار شخصیت 25/دسمبر 1925 (عام طور پر رشید حسن خاں کی یوم پیدائش 10/جنوری 1930 بتائی جاتی ہے، لیکن یہ درست نہیں) کو اُتر پردیش کے مردم خیز علاقے شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئی۔ آپ نہ صرف محقق، ناقد، مدون اور تبصرہ نگار تھے بلکہ ایک اچھے مصنف کے ساتھ ساتھ تجزیہ نگار اور اُردو املا کی اصلاح کے روح رواں بھی تھے۔ یوں تو ان میں بہت سی خوبیاں موجود تھیں لیکن اُردو ادب میں بنیادی طور پر ان کی شناخت ایک محقق اور مدون کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ان کو 'خدائے تدوین' کا خطاب عطا کیا ہے۔ رشید حسن خاں بہت ہی محتاط محقق ہیں۔ ان کے نزدیک تحقیق کا مقصد 'حقائق کی بازیافت' ہے۔ ان کو شخصیت میں دل چسپی نہیں بل کہ شخصیت نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں دل چسپی ہے۔ وہ حق کے متلاشی ہیں۔ وہ نہ کسی شخصیت سے مرعوب ہوئے اور نہ صلح و سمجھوتے کے قائل رہے۔ ان کے نزدیک شخصیت سے مرعوب ہونے کا مطلب 'حقائق سے چشم پوشی' ہے۔ خاں صاحب تاعمر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز، تلاشِ حق میں سرگرداں رہے۔

رشید حسن خاں نے اُردو املا، زبان و قواعد میں نئی نئی اصلاحات پیش کیں اور املا سے متعلق بہت سے مسائل کو حل کیا۔ خاں صاحب 1959 کے وسط میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں، صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر قمر رئیس کی کاوشوں سے، بہ حیثیت ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں خاں صاحب نے زندگی کا 30 سالہ طویل وقفہ گزارا اور 31/دسمبر 1989 کو سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے اُردو املا، زبان و قواعد، انشائے غالب، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مثنوی گلزارِ نسیم، مثنوی سحر البیان، مثنویاتِ شوق، مصطلحاتِ ٹھگی، کلامِ جعفر زٹلی وغیرہ کتابوں کو جدید علمی، ادبی، تحقیقی اور تدوینی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مدون کیا۔

رشید حسن خاں نے اُردو دنیا میں جب اپنا سفر شروع کیا تو ان کا موضوع املا اور زبان و قواعد کے ساتھ فکشن تنقید اور شاعری کے معائب و محاسن (زبان و بیان کے حوالے سے) کو قارئین کے سامنے پیش کرنا تھا۔ انشا اور تلفظ پر ان کی غائر نگاہ تھی۔ یہ خاں صاحب کا وقیع کارنامہ ہے۔ اچھی عبارت لکھنے کے لیے انھوں نے تین باتوں پر زور دیا۔ لفظ کا صحیح املا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور جملے میں اس لفظ کو کس طرح لانا چاہیے۔ وہ جملے کے لیے روز مرّہ، املا، تلفظ، قواعد اور محاورے کو اہمیت دیتے ہیں۔ جملے میں قواعد اور املا کی غلطی نہ ہو اور ساتھ ہی روز مرّہ و محاورہ بھی صحیح ہو۔ وہ مثالوں کے ذریعے ان کی وضاحت کرتے ہیں۔ روز مرّہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس طرح لکھنا یا بولنا جس طرح معیاری اُردو بولتے اور لکھتے آئے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب کہیں 'آب پی لو' تو کہا جائے گا کہ اُردو والے اس طرح نہیں بولتے۔ 'پانی پی لو' کہتے ہیں۔ آب کے معنی ہیں؛ پانی۔ لفظ اپنی جگہ ٹھیک ہے؛ بامعنی ہے، دوسرے مقامات پر استعمال میں بھی آتا ہے لیکن 'پینے' کے ساتھ 'پانی' کا لفظ آتا ہے۔''[1]

یعنی خاں صاحب کا اشارہ اس طرف ہے کہ وہ الفاظ جو ہم روزانہ عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں، وہی روز مرّہ کی تعریف میں شامل ہیں۔ اچھی عبارت کے بارے میں رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ روزمرہ محاورے اور قواعد کی غلطی نہ ہو۔ اسی کے ساتھ املا درست ہو اور اس میں بیان کا حسن بھی ہو۔ اسی کو ایک اچھی عبارت کہا جاتا ہے۔ وہ عبارت کو کئی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جملہ زبان سے ادا ہوگا تو اس میں کتنی روانی ہوگی۔ اس میں کوئی ایسا لفظ تو نہیں در آیا ہے، جس کو ادا کرنے میں زبان رُکنے لگے۔ وہ نثر میں روانی کے قائل ہیں اور اس کو اچھی نثر کی خوبی بتاتے ہیں۔

جملے دو طرح کے ہوتے ہیں، مفرد اور مرکب۔ مفرد جملہ یعنی سادہ جملہ۔ مرکب جملہ اس کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ مفرد جملوں سے مل کر بنا ہو۔ جیسے ''وہ کل یہاں سے گئے تھے، لیکن آج پھر واپس آ گئے اور آتے ہی جم کر بیٹھ گئے، مگر ان کے آتے ہی کچھ دوسرے لوگ بھی آ گئے اور وہ لوگ بھی اُن سے باتیں کرنے لگے، یوں سارا دن گزر گیا۔'' یہ جملہ پانچ چھوٹے چھوٹے جملوں سے مل کر بنا ہے۔ طویل مفرد جملے یا لمبے مرکب جملے بھی ضرورت کے مطابق لکھنے پڑتے ہیں۔ خاں صاحب زیادہ طویل جملوں کے قائل نہیں۔ اگر بات چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا ہو جائے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ لمبے جملوں میں کبھی کبھی زائد الفاظ در آتے ہیں اور مفہوم کے تکرار ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ عبارت میں زائد الفاظ کا در آنا اور مفہوم کی تکرار ہونا عیب ہے۔ زائد الفاظ سے مراد ایسے الفاظ سے ہے کہ ان کو اگر عبارت سے نکال دیا جائے تو معنی و مفہوم اثر انداز نہ ہوں اور عبارت پہلے سے اچھی ہو جائے۔ جملے میں جن لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے، ان سے مطلب اور مفہوم اچھی طرح واضح ہو رہا ہے یا نہیں، اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اگر ایک یا دو الفاظ کے بدلنے سے جملے کا مفہوم اچھا ہو سکتا ہے تو بہتر ہے کہ الفاظ بدل

دیے جائیں۔یعنی لفظوں کا انتخاب مناسب طور پر کرنا نہایت ضروری ہے،ساتھ ہی جملے میں ان کا استعمال بھی مناسب ترتیب میں ہو،تاکہ بیان کا حسن بڑھ جائے اور مفہوم بھی بہتر طور پر ادا ہو جائے۔مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ ہو:''تم یہاں سے کل کیا گئے کہ گھر کی رونق ہی چلی گئی۔''اس جملے کا مطلب تو واضح ہے لیکن بیان کا حسن غائب ہے۔جملے کا پہلا حصہ ادا کرنے میں یہ دشواری ہے کہ اس کی روانی میں خلل پیدا ہو رہا ہے۔'کل کیا گئے کہ' کو زبان سے ادا کرنے میں روانی کی سانس ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔علاوہ ازیں اس جملے کو بہتر بنانے کے لیے ایک دو الفاظ کو کم بھی کیا جا سکتا ہے۔جیسے:''گھر کی رونق تمھارے ساتھ ہی چلی گئی''اس طرح مطلب اور مفہوم بھی ادا ہو گیا اور اس میں بیان کا حسن بھی در آیا۔

اس جملے پر غور کیجیے''چونکہ وہ بیمار تھے،اس لیے میں ان کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔''اس جملے کو اس طرح بھی لکھا جا سکتا ہے:''وہ بیمار تھے۔اس لیے میں ان کو دیکھنے گیا تھا۔''جملے سے'چوں کہ'اور 'کے لیے' حذف کرنے سے روانی آ گئی۔مفہوم میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی،بیان کا حسن بھی در آیا اور جملہ پہلے سے بہتر ہو گیا۔

ان جملوں پر بھی ذرا غور فرمائیں:'وہ اُدھر کو گئے ہیں'،'اب تم کدھر جاؤ گے'،'میرا گھر کو جانے کا وقت ہو گیا ہے'۔مندرجہ بالا جملوں میں 'کو' زائد ہے۔ان کو یوں لکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا:'وہ اُدھر گئے ہیں'،'اب تم کدھر جاؤ گے'،'میرا گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے'۔ان جملوں میں روانی کے ساتھ ساتھ بیان کا حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔

خاں صاحب عبارت میں بھاری بھرکم،دقیق اور مشکل الفاظ کے بھی قائل نہیں۔ان کے نزدیک عبارت میں ممکنہ حد تک مشکل الفاظ نہ آئیں۔مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جب آسان الفاظ موجود ہیں،تو مشکل اور ادق الفاظ کیوں استعمال کیے جائیں۔رشید حسن خاں اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہاں!ہم ایک پہلو پر ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ممکن حد تک مشکل لفظ ہماری عبارت میں نہ آنے پائیں۔مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آسان لفظ موجود ہیں،تو مشکل الفاظ کو عبارت میں نہیں ٹھونسنا چاہیے۔اس ٹھونسم ٹھاس سے عبارت بے ربط ہو جاتی ہے۔بندش کی چستی باقی نہیں رہتی اور روانی ختم ہو جاتی ہے۔چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اسی کو کہتے ہیں۔پڑھتے وقت لغت کی کتاب سامنے رکھنا ضروری ہو،تو وہ نثر کیا ہوئی!یہ تو بے کمالی بلکہ بے ہنری کی پہچان ہے۔''[2]

لفظوں کے انتخاب پر بھی آپ کی عمیق نظر تھی۔ مثال دے کر بتاتے ہیں کہ جیسے 'حتی الامکان' کی جگہ 'امکان بھر' اور 'علی الصباح' کے بدلے 'صبح تڑکے' لکھ سکتے ہیں۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ 'یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔''اس کی جگہ آسان جملہ لکھا جا سکتا ہے۔جیسا کہ''اس سے مجھے مسرت حاصل ہوگی''۔یعنی 'امر' اور 'باعث' جیسے ادق الفاظ کیوں لکھے جائیں،جب ان کے ہم معنی آسان الفاظ موجود ہیں۔ان کے نزدیک لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو مد نظر ہونا چاہیے کہ معنی و مطلب اور مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جائے۔عبارت میں ممکنہ حد تک سادگی رہے۔عبارت میں لفظوں کی تکرار بھی مناسب نہیں۔یہ بھی ایک عیب ہے۔جس سے عبارت کا حسن مضمحل ہوتا ہے۔جیسے''میں نے کہا ضرور تھا کہ میں تمھارے ساتھ چلوں گا،لیکن کیا کرتا مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔'' عبارت میں دو جگہ 'میں' اور ایک جگہ 'مجھے' آئے ہیں۔یہ تینوں الفاظ غیر ضروری اور زائد ہیں۔اس کو یوں لکھتے:''میں نے کہا ضرور تھا کہ تمھارے ساتھ چلوں گا،لیکن کیا کرتا،فرصت ہی نہیں ملی۔''زائد الفاظ یا لفظوں کی تکرار عبارت کے حسن کو کھا جاتے ہیں۔خاں صاحب کے نزدیک اچھی عبارت کے لیے لفظوں کی کفایت شعاری اور زائد الفاظ کا اخراج ضروری ہے۔غیر ضروری لفظوں کی تکرار عربی،فارسی کے دقیق الفاظ اور انگریزی الفاظ کے بے جوڑ پیوند عبارت کے لیے بہتر نہیں۔ایسے الفاظ جو ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہوں،جیسے 'صرف'،'فقط' اور 'ہی' ان کو ایک ساتھ لکھنا مناسب نہیں۔مثلاً''صرف میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں۔''اس جملے میں 'صرف' اور 'ہی' میں سے ایک لفظ زائد ہے۔جملہ اگر یوں لکھا جائے:''میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں''۔یہاں بات مکمل ہو گئی۔اسی طرح 'فقط میں ہی نہیں گیا'۔یہاں بھی جملے میں وہی عیب ہے۔'فقط' اور 'ہی' ایک ہی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔'میں ہی نہیں گیا'۔'فقط' کے حذف ہونے سے جملہ اچھا ہو گیا۔اسی طرح فقط،صرف اور ہی کا استعمال علاحدہ علاحدہ کرنا چاہیے۔ایک ساتھ دو ہم معنی لفظوں کا استعمال نہ کیا جائے،ورنہ یہ عبارت کا عیب کہلائے گا۔

لفظ 'میں' کا جملوں میں بے جا استعمال یعنی غیر ضروری طور پر لانا ٹھیک نہیں۔مثلاً 'ہم گھر میں گئے تھے'،'تم شام میں آئے تھے'،'ہم ان کے ساتھ میں تھے'۔اگر ان جملوں کو اس طرح لکھا جائے 'ہم گھر گئے تھے'،'تم شام کو آئے تھے'،'ہم ان کے ساتھ تھے'۔'' یہ زیادہ بہتر ہے۔'میں' کے اخراج سے جملوں میں روانی اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔خاں صاحب یہاں 'میں' کو زائد لفظ گردانتے ہیں اور اس طرح کے جملوں کو انگریزی تراجم بتاتے ہیں کہ یہ انداز اُردو میں بہتر نہیں۔اسی طرح 'پر' کا استعمال بہت سی جگہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔جیسے:'میں اسی جگہ پر تھا'،'تم وہیں پر بیٹھے تھے'،'ہم وہاں پر تھے'۔ان جملوں کو یوں لکھیے:'میں اسی جگہ تھا'،'تم وہیں بیٹھے تھے'،'ہم وہاں تھے'۔یہ جملے اب زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔وہاں پر،یہاں پر،جگہ پر،کہیں پر،کہاں پر،جہاں پر،وہیں پر،کہیں پر وغیرہ کلمے عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔بہتر یہ ہے کہ ان کے ساتھ 'پر' کا استعمال نہ کیا جائے۔اسی طرح بہت سے کلمات میں 'پر' کا استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً تخت پر کرسی پر،میز پر،فرش پر وغیرہ۔ایک غلط روش یہ بھی ہے کہ''وہ تخت کے اوپر بیٹھا تھا،پھر کرسی کے اوپر بیٹھ گیا۔''اس طرح کی عبارت مناسب نہیں۔یہاں پر کے ساتھ''او' زائد ہے۔یہاں تخت کے اوپر،اور کرسی کے اوپر،کی جگہ اگر'تخت پر'اور 'کرسی پر' لکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

دہلی اور لکھنؤ والوں کے درمیان مصدر کا اختلاف ہے۔مصدر کے آخر میں 'نا' آتا ہے،جس کو مصدر کی علامت کہتے ہیں۔مثلاً آنا،جانا،کرنا،پڑھنا وغیرہ۔جب ان کے ساتھ کوئی اسم استعمال ہوتا ہے،تب یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ مصدر کو کس طرح لکھا جائے۔مثلاً کتاب پڑھنا لکھیں یا کتاب پڑھنی لکھیں۔یہ ایک پیچیدہ مسئلہ

> **لفظوں کے انتخاب پر بھی آپ کی عمیق نظر تھی۔ مثال دے کر بتاتے ہیں کہ جیسے 'حتیٰ الامکان' کی جگہ 'امکان بھر' اور 'علی الصباح' کے بدلے 'صبح تڑکے' لکھ سکتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ'یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔''اس کی جگہ آسان جملہ لکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ''اس سے مجھے مسرت حاصل ہوگی''۔ یعنی 'امر' اور 'باعث' جیسے ادق الفاظ کیوں لکھے جائیں، جب ان کے ہم معنی آسان الفاظ موجود ہیں۔ان کے نزدیک لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو مد نظر ہونا چاہیے کہ معنی و مطلب اور مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جائے۔ عبارت میں ممکنہ حد تک سادگی رہے۔عبارت میں لفظوں کی تکرار بھی مناسب نہیں۔یہ بھی ایک عیب ہے۔جس سے عبارت کا حسن مضمحل ہوتا ہے۔**

ہے۔ دہلی والے اسم مونث کے ساتھ 'نی' لاتے ہیں۔ جیسے 'چائے پینی، روٹی کھانی، بات کہنی، رائے دینی' وغیرہ اور اسم مذکر کے ساتھ 'نا' لاتے ہیں۔ جیسے 'جواب دینا، قلم اُٹھانا، سوال کرنا، کالج جانا' وغیرہ۔ جب کہ لکھنؤ والے عام طور پر مصدر کی علامت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے۔ ان کے یہاں اسم مذکر ہو یا مونث، بہرصورت 'نا' بولا اور لکھا جاتا ہے۔ جیسے: 'کتاب پڑھنا، چائے پینا، روٹی کھانا، رائے دینا اور دعا کرنا' وغیرہ۔ رشید حسن خاں کے مطابق دونوں صورتیں جائز ہیں، لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ مناسب یہ ہوگا کہ کسی ایک طریقے کو اپنا لیا جائے اور اسی پر عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر کوئی صاحب 'کتاب پڑھنا، یا رائے دینا' لکھتے ہیں تو ان کے لیے یہ بہتر نہیں کہ وہ ایک جگہ 'کتاب پڑھنا' لکھیں اور دوسری جگہ 'دعا کرنی' یا 'چائے پینی' لکھیں۔ یعنی خاں صاحب کے نزدیک ایک ہی انداز استعمال ہونا چاہیے۔

بہت سے مقامات پر 'نہیں' کے ساتھ 'ہے' یا 'ہیں' لانا مناسب نہیں۔ مثلاً وہ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں، گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔'' اس جملے کو اگر یوں لکھا جائے: وہ کہیں آتے جاتے نہیں، گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔'' جملے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 'نہیں ہیں' میں 'ہیں' زائد لفظ ہے۔ فعل میں جہاں بھی 'نہیں ہیں' یا 'نہیں ہے' کا استعمال کیا جائے تو صورت مسولہ میں، اس طرف ضرور توجہ دی جائے کہ ادائے مطلب اور حسن عبارت کے اعتبار سے یہ مناسب ہے کہ نہیں۔ اکثر مقامات پر 'نہیں' اور 'ہے' یا 'ہیں' کے ساتھ آنے سے عبارت کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان الفاظ کا استعمال محتاط ہو کر کرنا چاہیے۔ یعنی لکھنے والے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہاں 'نہیں' کے ساتھ 'ہے' یا 'ہیں' لکھنا مناسب ہے یا غیر مناسب۔

جملوں میں مفرد اور مرکب الفاظ جو بھی استعمال میں آئیں، ان کے معنی ضرور معلوم ہونے چاہئیں۔ جملوں میں ان کا استعمال کہاں تک ٹھیک ہے اور کہاں غلط، یہ بات بھی توجہ طلب ہے۔ یہ جملہ دیکھیے: اہل ہنود کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئیں ہیں۔ یہاں 'اہل ہنود' صحیح ترکیب نہیں''۔ اس کی جگہ 'اہل ہند' ضرور صحیح مرکب ہے۔ اس کے معنی ہیں ہندوستان والے۔ اس میں تمام ہندوستانی، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ آ گئے۔ اس جملے میں 'اہل ہنود' مناسب نہیں۔ اس لیے یہ لکھنا چاہیے تھا کہ: ''ہندوؤں کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئی ہیں۔''

ایک لفظ 'معرکۃ الآرا' ہے۔ اس کے معنی ہیں جس میں اختلاف رائے بہت ہو۔ یہ عربی لفظ ہے۔ 'آرا' جمع ہے 'رائے' کی۔ کسی مضمون کی تعریف میں کہا جائے کہ بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے یا کسی غزل کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہنا کہ بڑی معرکۃ الآرا غزل ہے، درست نہیں، کیوں کہ یہاں بجائے تعریف کے برائی ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک مرکب 'معرکہ آرا' ہے۔ یہاں 'آرا' فارسی لفظ ہے۔ اس کا مصدر ہے آراستن۔ 'معرکہ آرا' کے معنی 'زبردست، پُرزور' وغیرہ ہیں۔ اس لحاظ سے عمدہ غزل کو معرکہ آرا کہا جا سکتا ہے۔ بہت سی مرکب تراکیب میں الفاظ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ وہ غلط ہے۔ مثلاً جیب گریباں'' یہاں جیب کے معنی گریبان کے ہیں۔ یعنی 'جیب و گریباں' ہوا 'گریباں اور گریباں' جو غلط ہے۔ اس لحاظ سے 'جیب و دامن' صحیح مرکب ہے۔ اس کے معنی ہوئے 'دامن اور گریباں' یعنی یہ صحیح ترکیب ہوئی۔

رشید حسن خاں صفت کے تین درجے بتاتے ہیں:

'اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا'۔ یہ سب با معنی کلمے ہیں، لیکن ان کا استعمال اگر صحیح جگہ پر نہیں ہوگا تو بے معنی ہو جائیں گے۔ خاں صاحب کے مطابق ہر اسم صفت ایک بیان ہے۔ جب کوئی اسم صفت جملے میں لکھا جاتا ہے تو وہ ایک بیان ہوتا ہے۔ جس کی مکمل ذمے داری لکھنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہر اسم صفت ایک بیان ہے، جب ہم کوئی اسم صفت جملے میں لکھتے ہیں، تو گویا ہم ایک بیان دیتے ہیں: جس کی پوری ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ معمولی جلسے کے لیے یہ کہنا کہ عظیم الشان جلسہ تھا، غلط بیان دینے کے برابر ہے۔ معمولی شاعر کے لیے یہ کہنا کہ وہ بہت اچھا شاعر ہے، یا یہ کہنا کہ وہ صاحب طرز شاعر ہے، جھوٹی گواہی دینے کے ہم معنی ہے۔ اسم صفت بہت سے ہیں جیسے: اچھا، بُرا، اعلا، ادنا، بے مثال، بے نظیر، عظیم الشان (وغیرہ)۔ یہ تحریر میں آتے رہتے ہیں اور گفتگو میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہم ان کو غیر مناسب طور پر استعمال میں لائیں گے، تو اس سے دو بڑے نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ان لفظوں کا مفہوم بگڑ کر رہ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ہماری تحریر میں خرابی پیدا ہو جائے گی اور ہم غلط بیانی کے مجرم قرار پائیں گے۔ اگر ہم صفاتی لفظوں کو غیر مناسب طور استعمال کرنے کے عادی بن جائیں گے، تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لی ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ جھوٹے کی بات اعتبار کے قابل نہیں رہتی۔''[3]

درجہ بندی کے اعتبار سے صفت کی ترتیب: بہ، بہتر، بہترین ہے۔ اسی ترتیب میں معنی ہوئے: اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ 'بہ' مفرد لفظ ہے، اس کے معنی 'اچھا' ہے۔ 'بہتر' مرکب لفظ ہے، جو دو الفاظ 'بہ' اور 'تر' سے مل کر بنا ہے۔ 'تر' کے معنی 'زیادہ' کے ہیں۔ اسی طرح بہتر کے معنی ہوئے 'زیادہ اچھا' یا 'بہت اچھا'۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ 'یہ کتاب زیادہ بہتر ہے'۔ یہاں یہ بات صاف واضح ہو رہی ہے کہ معنی کے لحاظ سے 'زیادہ' زائد لفظ ہے۔ کیوں کہ 'بہتر' کے معنی خود ہی 'زیادہ اچھا' کے ہیں۔ لفظ 'تر' بطور لاحقہ بہت سے الفاظ میں مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً بہتر، کم تر، بیش تر، خوب تر، بدتر۔ اسی طرح یہ دوسرے لفظ سے مل کر مرکب لفظ بنا ہے۔ 'تر' کے معنی 'زیادہ' کے ہیں یعنی بہتر کے معنی 'بہت اچھا' کم تر کے معنی 'بہت کم' بیش تر کے معنی 'بہت زیادہ' خوب تر کے معنی 'زیادہ اچھا' اور بدتر کے معنی ہوئے زیادہ برا یا بہت بُرا۔ اس لیے ایسے الفاظ جن کے آخر میں 'تر' کا استعمال کیا گیا ہو، ان الفاظ کے ساتھ 'بہت' اور 'زیادہ' لفظوں کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

رشید حسن خاں نے مرکب الفاظ کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کے مطابق 'انھی' اصل مرکب لفظ ہے۔ یہ 'اُن' اور 'ہی' سے مل کر بنا ہے۔ 'ہی' میں ہائے ہوز ہے۔ 'اُنھی' میں یہی 'ہ' دوچشمی 'ھ' میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس طرح تلفظ آسان ہو گیا۔ 'ان ہی' میں 'ہ' کی آواز الگ سے نکلتی ہے۔ 'انھی' میں نون کی آواز 'ھ' میں مل جاتی ہے۔ یوں دو حرفوں کی علاحدہ علاحدہ آوازیں ایک آواز بن جاتی ہے۔ تلفظ کے لحاظ سے لفظ میں سبک پن کے ساتھ ساتھ روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح 'اس ہی'، 'وہ ہی'، 'یہ ہی'، 'جب ہی'، 'تب ہی' کی جگہ اسی، وہی، یہی، جبھی، اور تبھی لکھنا چاہیے۔

جس طرح خاں صاحب نے 'ان ہی' کو 'انھی'، 'وہ ہی' کو 'وہی' اور تب ہی کو 'تبھی' لکھنے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اصلاً مرکب الفاظ ہیں۔ اسی طرح انھوں نے چند الفاظ کو مرکب سے مفرد بنا دیا، جو ان کی قدیم املا تھی اس پر اعتراض کیا۔ مثلاً بلکہ، چونکہ، آنکہ، حالانکہ وغیرہ۔ ان الفاظ کو بل کہ، چوں کہ، کیوں کہ، آں کہ، اور حالاں کہ لکھنے کے لیے اصرار کیا۔ جب کہ یہ قدیم زمانے سے اسی طرح لکھے جا رہے ہیں اور مرکب الفاظ ہیں۔

جملے میں فعل کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کا استعمال صحیح جگہ پر ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ جملہ غور سے پڑھیں: یہاں پرسوں بہت بڑا جلسہ ہونے جا رہا ہے۔'' یہ جملہ غلط استعمال ہوا ہے۔ اس کی جگہ یہ کہا جائے کہ ''پرسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا۔'' یا ''پرسوں یہاں

بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔" خاں صاحب "ہونے جا رہا ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یہ تو نرا انگریزی کا ترجمہ ہے۔" ایسا ترجمہ اُردو زبان کے مزاج اور اس زبان کے انداز بیان سے میل نہیں کھاتا۔

گفتگو ہو یا تحریر دونوں کو روز مرّہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ یعنی اس طرح بولنا اور لکھنا، جس طرح معیاری اُردو میں بولتے اور لکھتے ہیں۔ مثلاً پانی پینا کو 'آب پینا' لکھا جائے تو یہ روز مرۃ کے خلاف ہوگا۔ کیوں کہ ہم اُردو والے روز مرّہ استعمال میں 'پانی پینا' استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے لکھنے پڑھنے یا گفتگو میں 'پانی پینا' ہی استعمال ہونا چاہیے۔ یہ درست ہے۔

محاورے کا صحیح اور برمحل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ محاورے میں مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ اس کے استعمال میں اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ جس جگہ اس کا استعمال کیا جارہا ہے وہ وہاں معنی و مفہوم کے اظہار سے مناسب ہے یا نہیں۔ اس محاورے پر غور کیجیے 'ناک کٹنا' اس کے معنی ہیں کسی کے آگے ذلیل وخوار ہونا۔ اگر کسی کی واقعی ناک کٹ جائے تو یہ محاورہ نہ ہو کر حقیقت ہو جائے گا۔ اس صورت میں ہم اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔

خاں صاحب کے مطابق جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھنا چاہیے۔ جملۂ معترضہ اس جملے یا عبارت کو کہتے ہیں جو اصل بات کا لازمی جزو تو ہو لیکن اس کو کسی طرح عبارت سے نسبت ہو، اور لکھنے والے کے نزدیک اس کا لکھا جانا بھی ضروری ہو۔ جملۂ معترضہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ قوسین میں لکھی عبارت اور قوسین سے باہر کی عبارت میں ربط اور تسلسل بدستور بنا رہے۔ بے ربطی پیدا ہونے کی صورت میں عبارت اُکھڑی اُکھڑی ہو جائے گی۔ یہ عبارت میں عیب مانا جائے گا۔ عبارت کو قوسین کے ساتھ پڑھا جائے یا بغیر قوسین کے، ربط و تسلسل جوں کا توں بنا رہنا چاہیے۔ مثلاً مرزا صاحب نے (جن سے آپ مل چکے ہیں) کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا۔ اس عبارت میں "جن سے آپ مل چکے ہیں" جملۂ معترضہ ہے۔

رشید حسن خاں کے نزدیک دوسری زبانوں مثلاً انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ کے الفاظ جو اُردو زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور جن کا بدل اُردو زبان میں موجود نہیں، مثال کے طور پر، میزائل، آکسیجن، تھرما میٹر، ہائڈروجن، ناول، فلم، ٹیلی ویژن، اسٹیشن، ریفریجریٹر،

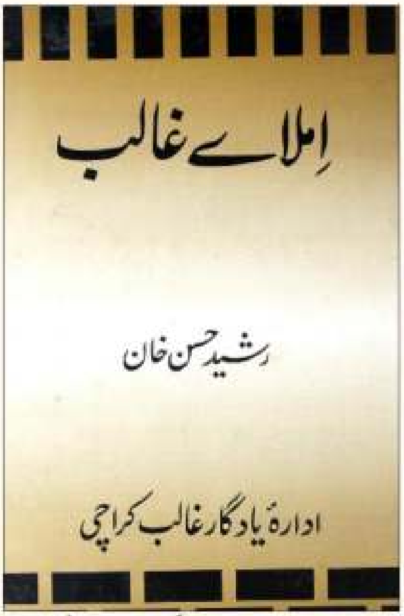

پینسل، ایٹم، گلاس اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ۔ اب اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا الفاظ استعمال کیا جائے تو وہ بہتر نہیں۔ جیسے: لاؤڈ اسپیکر کی جگہ 'آلۂ مکبر الصوت' یا تھرما میٹر کی جگہ 'مقیاس الحرارت' الفاظ کا استعمال کیا جائے تو یہ زبان کو مشکل اور بوجھل بنانے کے مترادف ہے۔ اب یہ انگریزی الفاظ اُردو زبان کا حصہ ہیں۔ اسی طرح، وہ الفاظ جن کے بدل پہلے سے موجود ہیں ان کی جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا جائز نہیں۔ اس سے نہ صرف تحریر بلکہ گفتگو بھی عجیب وغریب اور بگڑ جائے گی۔ ان انگریزی الفاظ کو غیر ضروری سمجھا جائے گا اور اسے بگڑی ہوئی اُردو کہا جائے گا۔

خاں صاحب نے ایک اور بڑی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام طور پر عوام الناس کرتے آئے ہیں۔ جب ہم کسی سے مخاطب ہوتے ہیں یا خط لکھتے ہیں اور وہ صاحب ڈاکٹر یا پروفیسر ہوں، تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لکھنے والا ڈاکٹر اور صاحب دونوں لکھ دیتا ہے، جو غلط ہے۔ یعنی جب نام سے پہلے 'ڈاکٹر' یا 'پروفیسر' لکھا گیا تو پھر نام کے بعد صاحب لکھا ہے تو تو نام سے پہلے 'جناب' لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً 'پروفیسر خالد محمود صاحب' لکھا جائے تو کہا جائے کہ یہاں 'پروفیسر' اور صاحب میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اس کو فقط 'پروفیسر خالد محمود' یا 'خالد محمود صاحب' لکھا جائے۔

املا اور تلفظ کے مسائل بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر لکھنے میں املا کا خیال نہ رکھا جائے تو معنی اور مفہوم کچھ کا کچھ ہو جائے۔ اسی طرح تلفظ صحیح نہ ہو تو بعض دفعہ بڑی شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہ دونوں ہی مسائل بڑے اہم ہیں اور ان کا رفع ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً لفظ 'گذشتہ' ہے، اسے 'گزشتہ' لکھا جائے تو یہ املا کی غلطی ہوئی، یا لکھا تو صحیح ہے 'گذشتہ' (ذال کے ساتھ) لیکن پڑھنے میں 'گذِشتہ' پڑھا (ذال کے نیچے زیر)۔ یہاں لکھا ہوا صحیح ہے لیکن تلفظ غلط ہو گیا۔ جب کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ 'گُذَشتہ' (گاف پر پیش ذال پر زبر)۔ اکثر لوگ 'توجّہ'، 'عُلما، اُدبا اور طِلبہ پڑھتے ہیں۔ جب کہ ان الفاظ کا صحیح تلفظ توجّہ، عُلَما، اُدَبا اور طَلَبہ ہے۔

تلفظ کے غلط ہونے سے بہت سی جگہ معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں۔ لفظ 'شہید' کی جمع 'شُہَدا' ہے (شین پر پیش، ہ پر زبر) جیسے شُہَدائے کربلا۔ ایک لفظ 'شُہْدا' (سین پر پیش ہ ساکن) ہے۔ یہ آوارہ، بدکردار جیسے مفہوم میں آتا ہے۔ اس طرح ایک حرف 'ہ' کو ساکن پڑھتے ہی معنی کچھ کا کچھ ہو گیا۔

'فاضل' کی جمع 'فُضَلا' ہے (ف پر پیش، ض پر زبر) ایک دوسرا لفظ 'فُضْلہ' ہے (ف پر پیش، ض ساکن)۔ اس کا املا مختلف ہے، تلفظ ایک ہے۔ 'فُضَلا' کو اگر 'فُضلہ' پڑھا گیا تو سارا معنی اور مفہوم ہی بدل جائے گا۔ مثلاً سارا فُضلہ خارج ہو گیا۔" یعنی فُضلہ ایسے مادے کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا بے کار یا فاسد مادہ ہو۔ جبکہ 'فُضَلا' کا مطلب کسی میدان میں مہارت رکھنا یا فاضل ہونے کے ہیں۔ اسی طرح بہت سے الفاظ ہیں جن کے تلفظ میں بہت گڑبڑی کی جاتی ہے۔ مثلاً ان الفاظ کا تلفظ دیکھیں مَرَض، خَلَق، عَرَق اور عِطر وغیرہ یہ صحیح ہیں لیکن اکثر اشخاص ان کو مَرْض، خَلْق، عَرْق اور عَطر پڑھتے ہیں جو غلط ہے۔

اس طرح رشید حسن خاں نے علم کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگا کر زبان اُردو کی زلفوں کو سنوارنے کی سعی جمیلہ کی ہے۔ بہت سے مسائل کو اپنی محنت شاقہ، لگن، جاں فشانی، ایمان داری، حق پرستی اور علم کی روشنی میں حل کیا ہے۔ وہ جب کوئی علمی بحث چھیڑتے تو پھر پرت کی پرت کھولتے چلے جاتے۔ بلاشبہ اُردو زبان وقواعد کے اعتبار سے ان کی اصلاحات اور مشورے قابل احترام ہیں۔

حواشی

1۔ رشید حسن خاں، انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011، صفحہ 6

2۔ ایضاً، ص 12

3۔ ایضاً، ص 36-37

Dr. Mohd Khalid Zaheer
Mohalla Islamabad
Sheyampur Road, Kathor
Meerut - 250104
Mob.: 9412473222/8445727800

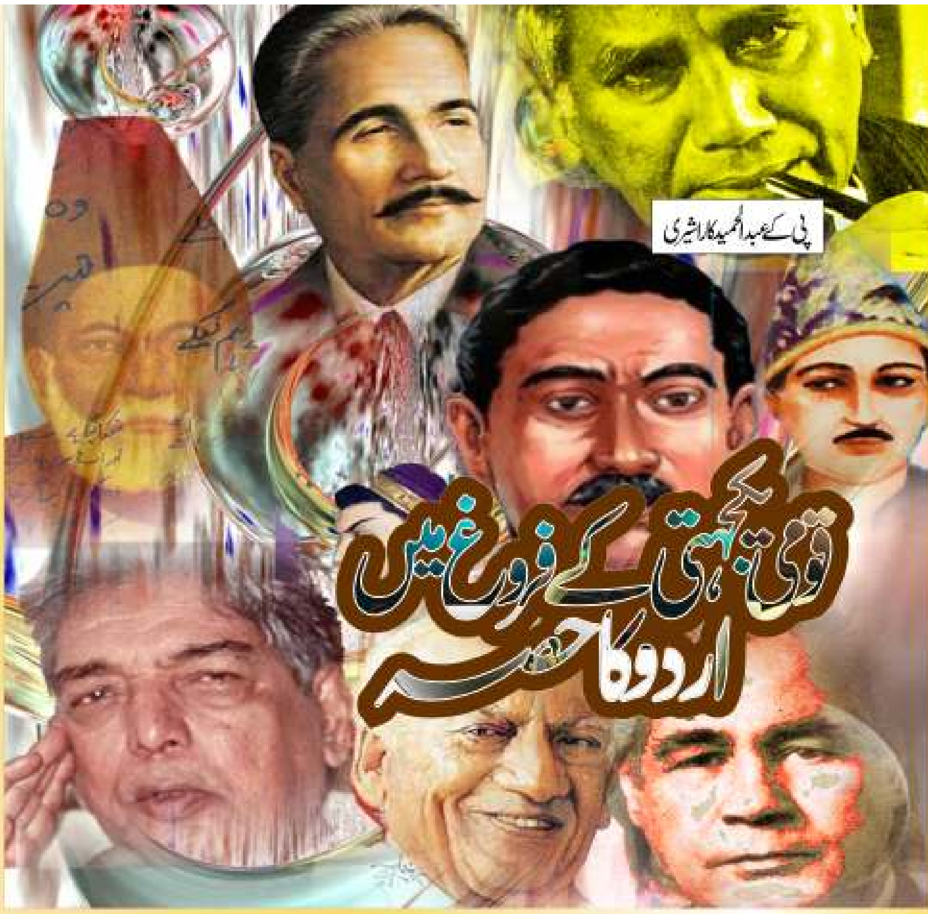

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا حصہ

پی کے عبدالحمید کاراشری

ہے ضرورت دیس میں سب لوگ مل جل کر رہیں
بوئے یکجہتی سے مہکے دیس کی رنگیں فضا
باہمی ہمدردیاں ہوں دوستی ہو پیار ہو
متحد ہوکر رہیں ہم بھائے سب کو ایکتا
دھرم کا شیوہ نہیں غارت گری قتل و فساد
دھرم تو کہتا ہے سب دھرموں کے انساں ایک ہیں
جو ستم مجبوروں پہ ڈھاتا ہے وہ شیطان ہے
اور جو سب کے کام آتے ہیں وہ بندے نیک ہیں
پاک ہو کر ہر تعصب سے ہمیں رکھنا ہے یاد
ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کے سب یک رنگ ہیں
سب ہی بندے رب کے ہیں ہے جینا مرنا ایک سا
سب ہمارے اپنے بھائی ہیں ہمارے سنگ ہیں

رئیس الدین رئیس

ہندوستان کی مخلوط گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ زبان، مادرِ وطن کی ادبی عظمت کا نشان، قومی یکجہتی کی روشن مثال یہ وہ دلفریب و دلنشین زبان ہے جس نے ہندوستان کی مقدس سرزمین میں یہیں کے مختلف النسل اور مختلف باشندوں کی ہم نشینی کی کوکھ سے جنم لی۔ یہیں کے کھیتوں، کھلیانوں، گھروں اور بازاروں میں پلی بڑھی۔ یہیں کی درس گاہوں، دفتروں اور عدالتوں میں پروان چڑھی۔ میر، غالب، پنڈت برج نارائن چکبست اور منشی پریم چند جیسی مایہ ناز شخصیتوں کے ہاتھوں پھلی پھولی۔ یہ وہ حسین عوامی زبان ہے جو آزادی کی لڑائی میں طبلِ جنگ بنی جس نے آزادی کے متوالوں کو سرفروشی کی تمنا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ جس نے مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا کے ذریعے ہندوستانیوں کو مشترکہ تہذیب کا ترانہ گایا۔

قومی یکجہتی پر سلام مچھلی شہری کے اشعار ہیں۔

قومی یکجہتی ایک تقاضا ہے آج کے حالات کا
قومی یکجہتی ایک نغمہ ہے آج کے حالات کا
قومی یکجہتی ایک نعرہ ہے آج کے حالات کا

اردو زبان کی تاریخ قومی یکجہتی کی تاریخ ہے۔ اردو زبان و ادب میں قومی یکجہتی کی تلاش ایسی ہے جیسے آفتاب میں روشنی کی، نغمہ میں نغمگی کی۔ اس زبان کی بناوٹ اور سجاوٹ میں ہندوستان کے مختلف فرقے اور مذہب شامل رہے ہیں۔ اردو قومی یکجہتی کی روح رواں ہے۔ صفی کا مشہور شعر ہے۔

لفظ ہم میں جس طرح 'ہ' 'م' ہیں شیر و شکر
چاہیے ہندو مسلماں یوں ہی مل جل کر رہیں

اردو زبان کی پرورش میں تمام ہندوستانیوں کا برابر حصہ رہا ہے۔

انجیل کی نہ قرآن کی نہ پران کی
مذہب کی نہ ملت کی نہ صوبوں کی
واللہ ہر دل کی زبان ہے اردو

آج جس طرح ہم تاج محل پر فخر کرتے ہیں اسی طرح اردو زبان بھی ہماری تہذیبی وراثت کا ایک اہم حصہ ہے اور اس زبان پر ہم تمام ہندوستانیوں کو فخر ہونا چاہیے۔ یہ وہ واحد زبان ہے جو بغیر کسی ترجمان کی مدد کے دلوں میں سیدھے اتر جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ہندوستانی زبانوں کا زندہ تاج محل ہے۔

ہماری زبانیں اور ہماری عبادتوں کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتے ہیں لیکن یہ اختلاف نہیں بلکہ ہماری تہذیبی رنگا رنگی ہے۔ پنڈت نہرو کے لفظوں میں کثرت میں وحدت اور رنگا رنگی میں یک رنگی ہی ہندوستانیت ہے۔

قومی یکجہتی کا سچا تصور اسی کثرت وحدت سے عبادت ہے۔ ہندوستان میں مختلف قوموں، ذاتوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ آئے مگر یہ سب ہندوستانی ثقافت میں ایسے ضم ہوگئے کہ انھیں کوئی طاقت الگ نہیں کرسکی۔

تمھارا جسم میرا جسم الگ الگ
تمھارا رنگ میرا رنگ الگ الگ
یہ سب الگ الگ مگر یہ بات بھولتے ہیں ہم
لہو تمھارے جسم میں ہو یا ہمارے جسم میں
لہو کا رنگ ایک ہے
ہمارا ذہن ایک ہے
ہماری فکر ایک ہے
ہماری راہ ایک ہے

مغلیہ سلطنت کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کو جاننے کی رفتار کافی تیز ہوچکی تھی۔ اکبر بادشاہ نے دو قوموں کو ملانے اور قریب لانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ مشہور اردو شاعر اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دور میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ شہنشاہ، امرا، نوابین اور عوام سب مل کر ہولی، دیوالی اور دیگر مذہبی تقریبات میں حصہ لیتے۔

کہتے ہیں جسے ہند لسانی سنگم
تہذیب وہ اردو کی ہے گنگا جمنی

اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی وراثت ہے۔ یہ زبان گنگا جمنی تہذیب، یہاں کے جہانِ رنگ و بو کی ندرتوں اور نگہتوں کی حقیقی نمائندہ ہے۔

اردو شاعری میں ہندو دیومالا کا دو طرح سے استعمال ہوا۔ ایک تو راست دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں وغیرہ۔ دوسرے ان دیوی دیوتاؤں کی تمثیلات و تلمیحات وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور شعری تصنیف کتاب 'نورس' ہے۔ ہندو دیومالائی عناصر کے تعلق سے اسے اردو کے دکنی عہد کی نمائندہ شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بیشتر گیت ہندو دیومالا سے بھرے ہیں۔ شیو، پاروتی، سرسوتی، گنیش اور اندر جیسے دیوی دیوتاؤں کا

ذکر اس میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ بار بار آتا ہے۔

اردو کے مشہور شعرا میں جنھوں نے ہندو دیو مالا کو بھرپور طریقے سے برتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اپنی نظیر ہیں۔

نظیر اردو میں عوامی شاعری کے داعی ونقیب ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندو دیو مالائی عناصر اور ہندو مذہب کا ذکر و بیان صرف تشبیہ وج ستعارے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ ایک طرح کے عقیدے اور طرز زندگی کے طور پر ملتا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے ایک نئے نصب العین اور ایک نئے نظام زندگی کا پیغام سنایا تھا۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا کی بنیاد پر ایک نیا شوالہ تعمیر کرنے کی دعوت دی۔ گوتم، گرونانک اور سوامی رام تیرتھ کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

سردار جعفری نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔ ان کی نظم 'نئی دنیا کو سلام' کے چند اشعار ہیں۔

نغمۂ عصر کہن ہے زندگی کے ساز میں
آج ہے اک درد سا پھر رام کی آواز میں
بانسری کے زمزموں پر رقص کرتی ہے فضا
آرہی ہے آسمانوں سے کرشن جی کی صدا
ہر طرف بکھرا ہوا ہے چاند سے ماتھے کا نور
موج جمنا میں ہے رادھا کی نگاہوں کا سرور
آج پھر کاشی کی پیشانی پہ رقصاں نور ہے
آج پھر تلسی کے نغموں سے فضا معمور ہے

اخترالایمان اور کیفی اعظمی کے یہاں بھی اسی طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں ہندو عقائد، رسم و رواج کی جھلکیاں ہیں۔ سلام مچھلی شہری، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر وغیرہ شعرا کے یہاں اس قسم کے اساطیری عناصر کے نقوش ملتے ہیں۔ اردو مسلمانوں کی زبان ہرگز نہیں بلکہ مشترکہ تہذیب کی زبان ہے۔

اردو کے مشہور کہانی کار منشی پریم چند قومی یکجہتی کے متمنی ہی نہیں مبلغ بھی تھے۔ اپنے ناول میدانِ عمل میں انھوں نے حصول آزادی کے لیے قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر نہایت دلکش انداز میں زور دیا ہے۔ اس ناول میں آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی شمولیت پر تفصیل سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ پریم چند یہ بات ایمان داری سے سوچتے اور سمجھتے تھے کہ جب تک ہندو مسلم اختلاف کی خلیج نہیں پاٹی جائے گی ممکن نہیں۔

پریم چند نے ہندوؤں کی سماجی اخلاقی اور مذہبی برائیوں پر دل کھول کر لکھا ہے۔ پریم چند قومی یکجہتی کی اہمیت پر زور دینے کے لیے مسلمانوں کا کردار تخلیق کیا ہے۔

اردو زبان کی آرائش و زیبائش میں صوفیوں اور سنتوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے انسان دوستی اور پریم کی تعلیم دی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کی شاعری ہندوستانی، تہذیبی عناصر کا بیش بہا خزانہ ہے۔ قلی قطب شاہ کا کلام ان کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا ثبوت ہے۔ محمد قلی ہند لسانی تہذیب کے پروردہ تھے۔ وہ ہندوستانیت کے سچے پرستار تھے۔

قلی قطب شاہ وطنیت اور قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ قطب شاہیوں کی تہذیب صحیح معنی میں گنگا جمنی تہذیب تھی۔ محمد قلی نے اس گنگا جمنی اور ہند لسانی تمدن کو جلا بخشی تھی۔ رسومات، رہن سہن اور روزمرہ زندگی میں محمد قلی نے جس قومی یگانگت اور ہم آہنگی کو تقویت پہنچائی تھی اس کی بہت سی مثالیں ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی سرزمین کی خوشبو بسی ہے۔

اردو ذرائع ابلاغ نے ہمیشہ قومی یکجہتی کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے جدوجہد آزادی میں ہی نہیں بلکہ عوامی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ سرسید احمد خان کی ادارت میں شائع ہونے والے سائنٹفک گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں قومی یکجہتی سے متعلق موضوعات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ ملاپ، پرتاپ، تیج اور دیگر متعدد اردو اخبارات نے جدوجہد آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اگر برطانوی نظام کسی چیز سے خوف زدہ تھا تو وہ اردو صحافت ہی تھی۔

اردو صحافت نے تحریک آزادی کے دوران عوام کے دلوں میں حب وطن کے جذبے کو فروغ دیا۔ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو میں تقسیم وطن کے دل دہلانے دینے والے واقعات کو درکنار کرتے ہوئے ہمیشہ سماجی ہم آہنگی کی جانب پیش پیش رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سماج کی رہنمائی کی۔

آج دنیا ایک عالمی گاؤں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اردو ذرائع ابلاغ کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے برتنے کی ضرورت ہے۔ جذبۂ اتحاد سے قوم کی تعمیر ہوتی ہے۔ قومی یکجہتی کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا ایک دوسرے کے تئیں دوستانہ سلوک اور ذات پات کی سطح سے بلند ہونا بھی ہے۔ قومی یکجہتی کے معنی ومفہوم کی وضاحت کے لیے قومی سطح پر مفاد عامہ سے متعلق فکر وہم آہنگی کے جذبے کو فروغ دیا جائے حالانکہ اردو ذرائع ابلاغ اپنے ابتدائی زمانے سے ہی انھیں خطوط پر گامزن ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کی اس منحوس گھڑی میں اردو ادب نے قومی یکجہتی کو برقرار رکھا۔ ایک طرف فقہ، حدیث، تاریخ اسلام وغیرہ موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا تو دوسری طرف ہندو، عیسائی، بدھ اور سکھ مذہب پر سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں ہندوؤں کی مقدس کتابیں رگ وید، یجروید، سام وید، اتھروید وغیرہ کا اردو ترجمہ ہوچکا ہے۔ رامائن، مہابھارت، گیتا کے بھی مختلف ورژن (Version) ہیں۔ انجیل کے کئی ترجمے ہوچکے ہیں۔

ہندوستان ایک کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی (Multi lingual & Multi Cultural) ملک ہے۔ اس ملک کے ہر صوبے کی زبان الگ ہے اور ان کے تہذیبی رنگ بھی مماثلتوں کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان اختلافات میں بھی ایک تہذیبی وحدت ہے جسے مشترکہ تہذیب بھی کہا جاسکتا ہے۔ اردو زبان و ادب مشترکہ تہذیب کی دین ہے۔ اردو سارے ہندوستان کی مشترکہ قومی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔

اردو ہندو مسلمان کے مابین معاشرتی اختلاط کی وجہ سے وجود میں آئی اور یہ ان دونوں کے درمیان باہمی اور یگانگی کی یادگار ہے اور انہی جذبات کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنی اپنی زبانوں کو اس نئی خالص ہندوستانی زبان میں ضم کردینے کا فیصلہ کیا اور دونوں نے دوش بدوش اسے پروان چڑھایا اور اس کی نشو ونما میں بھرپور حصہ لیا۔

مسلمان کی طرح غیر مسلم شاعروں، نثر نگاروں اور ادیبوں کا اردو زبان کی ترقی دینے اور پروان چڑھنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان میں رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، لالہ شری رام، تلوک چند محروم، برج نارائن چکبست، دیانارائن نگم، مہیش پرساد، فراق گورکھپوری، امرناتھ ساحر، آنند نارائن ملا، بیشور پرساد منور، پنڈت کرشن پرشاد کول، جگر بریلوی، تیج بہادر سپرو، میلا رام وفا، مہاشے سدرشن، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، گلزار دہلوی، ڈاکٹر گیان چند جین، کمار پاشی، مہندر سنگھ بیدی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اپیندر ناتھ اشک، رام لال کرشن سہائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

PK Abdul Hameed, Karassery
'Ghazal' Karassery (Po), Mukkam (Via)
Kozhikkode- 673602 (Kerala)

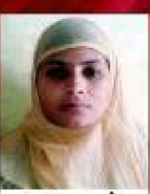

فوزیہ خانم

لسان القوم صفی لکھنوی

صفی لکھنوی ایک منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ صفی لکھنوی کے آبا واجداد غزنی کے رہنے والے تھے۔ وہ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کرلی اور کچھ عرصہ بعد دہلی کے مضافاتی علاقہ پچگوڑ منتقل ہوگئے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد صفی کے پرداداسید احسان علی علاقائی جاٹوں کے ظلم سے تنگ آکر پچگوڑ چھوڑ کر فیض آباد آگئے۔ لیکن جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو ان کے متوسلین بھی لکھنؤ آگئے۔ انھیں میں صفی کے دادا سید سلطان حسین بھی تھے۔ سید سلطان حسین کے دو بیٹے تھے سید حسین اور سید فضل حسین۔ سید حسین ایک جید اور نامور حکیم تھے اور شہزادہ سلیمان قدر بہادر کی والدہ کے طبیب خاص تھے۔ سید فضل حسین بھی اسی ڈیوڑھی کے معتمد تھے۔ سید فضل حسین لکھنؤ کے قدیم محلّہ مولوی گنج میں رہتے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے سید افضل حسین، سید علی نقی، سید مقبول حسین۔

سید علی نقی صفی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ رسم کے مطابق پانچ سال کی عمر میں رسم بسم اللہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید فضل حسن سے حاصل کی۔ عربی فارسی مولوی احمد علی اور سید حسین سے سیکھی اس کے علاوہ کاکوری کے مولوی شمس الدین سے بھی فیض حاصل کیا۔ اپنے تایا سے اصول طب سیکھا، لیکن اسے کبھی ذریعہ معاش نہ بنایا۔ جلد ہی صفی کے سر سے باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد گھر کی ساری ذمے داری ان کے کندھوں پر آگئی۔

فارسی عربی کی تعلیم کے بعد کنگ کالجیٹ اسکول لکھنؤ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا 1879 میں لال اسکول اور پھر کیننگ کالج کی برانچ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ کالج میں دو سال ملازمت کے بعد 1881 میں گورنمنٹ اتر پردیش کے محکمہ دیوانی میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ دوران ملازمت ان کا قیام رائے بریلی، سلطان پور، پرتاب گڑھ میں رہا۔ لیکن ملازمت کا زیادہ وقت لکھنؤ میں گزرا۔ یہیں سے 1917 میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی پوری زندگی شعروسخن کی خدمت میں گزری۔

صفی کی شادی ان کے استاد مولوی محمد علی کی بڑی بیٹی سے ہوئی۔ معاشی الجھنوں کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار رہی۔ صفی کی سات اولادیں تھیں۔ ان کی حیات ہی میں بیوی اور چاروں بیٹیوں اور ایک بیٹے کا انتقال ہوچکا تھا۔ بڑے بیٹے کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا اس لیے اس کی شادی نہیں ہوئی۔ منجھلے بیٹے کی شادی خاندان میں ہوئی تھی، ان کی اولادیں پاکستان چلی گئیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے کے تین بچے تھے جو کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوکر انتقال کرگئے ایک بیٹا گونگا بہرہ تھا۔ ان کی بیوہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ صفی کے تینوں بیٹوں کو شعروشاعری کا ذوق تھا شاعری بھی کرتے تھے لیکن اس میدان میں صفی کا کوئی جانشیں نہ بن سکا۔

صفی لکھنوی کی پرورش لکھنؤ کے ایسے خوشگوار ماحول میں ہوئی، جہاں انسانیت سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ ہندو مسلم شیروشکر ہوکر زندگی گزارتے تھے، جہاں مذہبی جھگڑوں اور فرقہ پرستی کی کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن برطانوی حکومت کے آتے ہی انسانیت اخوت اور مذہبی رواداری کی جگہ فرقہ پرستی، تعصب، تنگ نظری، مذہبی منافرت کے نام پر خوں ریزی عام ہوگئی۔ صفی انسانی جذبات کے نباض اور حساس دل کے مالک تھے۔ منافرت اور عدم رواداری کے حالات و ماحول دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکے۔ ملک وقوم کی نجات وترقی انھیں اتحاد واتفاق میں نظر آئی، اس لیے وہ اپنے کلام سے قوم میں اتحاد واتفاق اور پیغام انسانیت کے جذبوں کو عام کرنے لگے۔

صفی کو بچپن ہی سے شعروسخن کا شوق تھا، 12 سال کی عمر سے غزل کہنی شروع کردی تھی۔ شاعری میں انھوں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ صفی کو کتابوں کے مطالعہ کا شغف تھا۔ زبان وبیان، عروض ومعانی پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے تمام صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی میں صفی کا اہم مقام ہے۔ عشق وعاشقی، ہجر ووصال، قید تنہائی، تصوف، سائنس، فلسفہ، اخلاق، پندونصائح، حب الوطنی، اتحاد واتفاق ان کے کلام کے اہم موضوعات ہیں۔ تغزل، چاشنی، نغمگی اور زبان وبیان روزمرہ محاورہ کے موزوں استعمال نے ان کے کلام کو پراثر وپرتاثیر بنادیا ہے۔ ان کا کلام قدیم وجدید شاعری کا سنگم ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار

ملاحظہ فرمائیں۔

یہ کسی کو کیا غرض تھی کہ جو غمگسار ہوتا
ہمیں دل پہ جبر کرتے اگر اختیار ہوتا
ترے وعدے کی وفا کا مجھے اعتبار ہوتا
جوطلوع صبح محشر شب انتظار ہوتا

—

اس انقلاب کی بھی کوئی حد ہے دوستوں
نا آشنا سمجھتے ہیں اب آشنا مجھے

—

زیر زمیں انھیں بھی رہنا ہے تا قیامت
جن کے دماغ نخوت آج آسمان پر ہیں

—

اصل منشائے بنائے دیروکعبہ ایک ہے
پھر دوئی شیخ وبرہمن میں ہے کس بنیاد پر

—

چھوڑ کر آدم گئے کس قدر میراث غم
ہورہی ہے آج تک تقسیم جو اولاد پر

—

وہ نقطہ جو تھا مرکز آدمیت
بہت دور اس سے جدا ہوگئے ہم

—

بے لوث محبت ہوجسے ملک سے اپنے
وہ برہنہ پا خسرو بے تاج ونگیں ہے

مرزارضا حسین اپنے مضمون 'صفی کچھ مشاہدات اور پرانی یادیں' میں صفی کی شاعری اور لسان القوم کے خطاب سے نوازے جانے کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

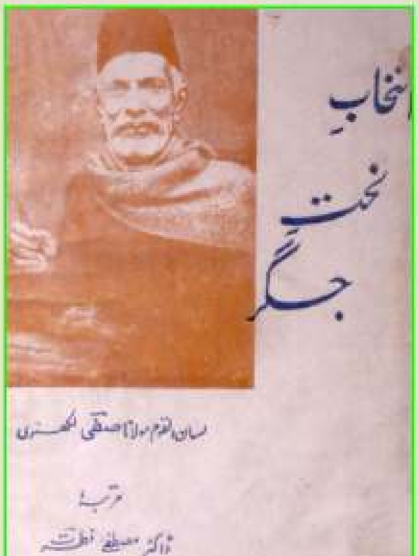

''یوں تو صفی نے ہر صنف سخن میں کمال حاصل کیا تھا لیکن ان کی جوشیلی قومی نظمیں خاص طور سے پسند کی گئیں اور قومی تحریکوں کی کامیابی میں ان کا ایک بہت بڑا حصہ ہے جس کی وجہ سے ان کو لسان القوم کہا جانے لگا۔شاید قومی خدمت کے جذبے اور وطن سے خالص دوستی،محبت اور دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے اپنا تخلص بھی صفی رکھا تھا۔جس کے معنی خالص دوست کے ہیں اور اسی وجہ سے حضرت آدم کا لقب ہی صفی اللہ ہے۔''

(صحیفہ،یادگارصفی:مرتبہ سید زائرحسین کاظمی:سرفراز پریس لکھنؤ 1974، ص80)

صفی چاہتے تھے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی جگہ محبت واخوت قائم ہوجائے، مسلمان مذہبی ومسلکی اختلافات میں پڑکر خود کو کمزور نہ کریں،اسی میں ملک وقوم کی ترقی ہے۔ان کی نظموں کی اہم خصوصیات لطف بیان،اختصار جامعیت،واقعہ نگاری،منظر نگاری،جذبات نگاری،فطری لب ولہجہ،پندونصائح،زبان کی سادگی،روز مرہ الفاظ ومحاورہ کا برمحل وبرجستہ استعمال ترنم ونغمگی ہے۔مثال کے لیے نظموں سے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ اخلاق کا ایک سرسبز پودہ
لگایا ہوا خاتم الانبیاء کا
پھیلک کر جو روئے زمیں پر ہے چھایا
جسے دین اسلام کہتی ہے دنیا
تم اس نخل کی حیف جڑ کاٹتے ہو
تعلق ہے جس کا وہ لڑ کاٹتے ہو
کچھ اسلام کی شان وشوکت بڑھاؤ
مجالس کو بے خار گلشن بناؤ
فریقین کو صحبتوں میں بلاؤ
طریقے تمدن کے سب کو دکھاؤ
نہ شیعہ ہوں سنی نہ سنی ہوں شیعہ
ترقی اسلام کے ہوں ذریعہ
ضرورت محبت کی ہے سخت ہم کو
یہی تاج ہم کو یہی تخت ہم کو
یہ دولت جو چھوڑے گی ایک لخت ہم کو
کہے گی ہر اک قوم کم بخت ہم کو
صفی نام مٹ جائے گا دیکھ لینا
یہ اسلام مٹ جائے گا دیکھ لینا

لکھنؤ میں شیعہ سنی فسادات عالم گیر نوعیت اختیار کرچکے تھے۔جس سے اسلامی شیرازہ بکھر رہا تھا۔صفی لکھنوی ایک حساس ہم درد انسان تھے وہ اس فساد سے بہت دلبرداشتہ ہوگئے۔صفی اتحاد المسلمین کے علمبردار تھے خاموش نہ رہ سکے اور انھوں نے 'اتحاد' نظم لکھ کر دونوں فرقوں میں تقسیم کرایا۔ وہ چاہتے تھے مسلمانوں کی آپسی نفرت ختم ہوجائے اور ملک وقوم ترقی کی طرف گامزن ہوجائے۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے ان کے دلی جذبات واحساسات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

قوم کی حالت زار دیکھ کر صفی کا دل کڑھتا تھا۔وہ اپنی نظموں کے ذریعہ قوم میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔تاعمر صفی اسلاف کے کارناموں اور زبوں حالی کے سبق آموز واقعات کے ذریعہ قوم کو بیدار کرتے رہے۔ان کا کہنا تھا ابھی وقت ہے جاگ جاؤ ورنہ تمہارا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ان کی نظم 'نالۂ مستانہ' سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

افراد کو گھیرے ہیں امراض جو نفسانی
گھٹتی ہی چلی جاتی ہے قوت ایمانی
اے قوم علاج اس کا ممکن ہے بآسانی
اسلام میں خود تیرے موجود ہیں لاثانی
اخلاق کا اک مہتم بالشان شفا خانہ
اے قوم کے نوخیزو راہیں نہ چلو بے جا
برباد ہوں کیوں نسلیں کیوں تم پہ ہنسے دنیا
چوسی ہوئی ہڈی کو کیوں چوس کے ہو رسوا
کچھ نام کرو پیدا کچھ کام کرو یہ کیا
گلیوں میں پڑے پھرنا مثل سگ دیوانہ

صفی کی شاعری سماجی،معاشرتی،تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے،اور ادبی وفنی حیثیت سے بھی ان کا کلام اعلی درجہ کا ہے۔صفی لکھنوی کی شاعری کے متعلق سید زائرحسین کاظمی 'منظومات صفی' کے مقدمے میں یوں لکھتے ہیں۔

''لسان القوم صفی لکھنوی کی شاعری میں اپنے عہد کے تذکرے بھی ملیں گے اور ہر آنے والے زمانے کے ہمہ گیر جذبات بھی۔ان کی شاعری کی تصویر میں ہر رنگ نظر آئے گا اور یہی شاعری کی ہمہ رنگی ہے۔جو اسے اردو کے دوسرے شعرا سے برگزیدہ کرتی ہے۔جب بھی ان کے اشعار پڑھے جائیں گے بلاتفریق زمانہ وجہ سکون ہوں گے کیونکہ ایسی شاعری کا انھوں نے ہمیشہ التزام کیا ہے۔''

(منظومات صفی حصہ اول:مرتبہ زائرحسین کاظمی:سرفراز پریس لکھنؤ 1977،ص19)

■

Fauzia Khanam C/o Dr. Mohd Ali Jauhar
Dept of Urdu, Muslim University Aligarh
Aligarh - 202002 (UP)
Mob: 7983060032
Email: fauziaga4787@gmail.com

ذاکر حسین ذاکر

امیر خسرو

کے ہندوی کلام کی معنویت

شاعر امیر خسرو، صوفی امیر خسرو سے بڑا تھا یا صوفی امیر خسرو سے شاعر امیر خسرو بڑا تھا۔ یہ سوال بہر حال حل طلب ہے مگر ایک سوال جو اکثر عوام الناس کے ذہنوں میں گونجتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ صوفی و شاعر امیر خسرو نے آج سے سات سو سال قبل جس عوامی زبان میں شاعری کی شروعات کی اس کا زیادہ تر حصہ غتر بود کیوں ہوگیا۔ وہ اردو کی ابتدائی وراثت اور پہچان جسے آج موجود ہونا چاہیے کیوں نہیں ہے؟ یا جو ہے بھی وہ متنازعہ کیوں ہے؟ آخر کار وہ کون سے عوامل یا کون سی مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ قیمتی سرمایہ ہمارے پاس محفوظ نہیں رہ سکا۔ خسرو اپنی عوامی شاعری کو ہندوی کہتے تھے۔ یہ وہی ہندوی ہے جس نے نشو ونما کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد آج دنیا کی سب سے خوبصورت زبان اردو کے نام سے موسوم ہے۔

امیر خسرو کا ہندوی کلام ان کے فارسی کلام سے مقدار میں زیادہ تھا۔ شبلی نعمانی کے مطابق یہ پورا کلام تین سے چار لاکھ اشعار پر مشتمل تھا (شعر العجم جلد دوم از شبلی نعمانی دار المصنفین) اس بات کو مولانا نے اوحدی کرمانی کے تذکرے عرفات العاشقین کے حوالے سے لکھا ہے۔ خسرو کے فارسی میں مثنوی قصیدہ غزلیں اور رباعی کے علاوہ چھوٹے چھوٹے خط ہائے سخن ہمارے سامنے موجود ہے۔ مگر ان کے ہندوی کلام کا کوئی دیوان یا کوئی مجموعہ موجود نہ ہونا حیران کرتا ہے۔ اوحدی افسوس بھی ظاہر کرتا ہیں کہ ان کے ہندوی کلام کا آج نام و نشان نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی خسرو کے 3 سے 4 لاکھ ہندوی کلام ہونے کے اوحدی کرمانی کے دعوے کو سرے سے خارج کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''بظاہر اوحدی مبالغے سے کام لے رہا ہے، کیوں کہ یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ جو کلام 3 سے 4 لاکھ بیت پر مشتمل ہو وہ سارے کا سارا یوں غائب ہو جائے کہ اس کا نشان ہی نہ رہے''

(اردو کا ابتدائی زمانہ از شمس الرحمٰن فاروقی۔ آج، کراچی 1999)

دیکھا جائے تو خسرو کے موجودہ ہندوی کلام کے متعلق سب سے پہلے ایک آسٹرین مستشرق (Orientalist) ڈاکٹر الوائس اسپرینگر (Dr Aloys Sprenger) نے 1852 میں جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایک مضمون لکھا جس میں خسرو کی کچھ پہیلیاں درج ہیں۔ بعد میں 1854 میں بھی اسپرینگر نے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں خسرو کی کچھ مزید پہیلیوں کو شامل کیا ہے (امیر خسرو کا ہندوی کلام از پروفیسر گوپی چند نارنگ)۔

اسپرینگر 1845 میں ہندوستان آتا ہے 11 سال ہندوستان میں رہتا ہے اس دوران وہ دہلی کالج، اودھ کی لائبریری اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے علاوہ کئی مقامات پر تعینات رہتا ہے۔ جب 1856 میں وہ جرمنی واپس جاتا ہے تو اس کے پاس قدیم اردو ہندی اور فارسی کے 1972 نادر قلمی نسخوں اور بیاضوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ خسرو کے ہندوی کلام کو جس قلمی نسخے کے ذخیرے سے نکال کر ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں اس نے شامل کیا تھا اس نسخے میں خسرو کا مزید کلام ہو اور جرمنی واپس جانے کے بعد جب وہ برن یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگیا تھا اسے اپنی مصروفیات سے فرصت نہ ملی ہو کہ وہ خسرو کے مزید کلام کی اشاعت کر سکے۔ اسپرینگر برن یونیورسٹی سے 1881 میں ریٹائر ہوتا ہے اور 1893 میں اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ ہمارے جن محققین نے اسپرینگر کے جرمن لے گئے قدیم قلمی نسخوں کی تلاش میں اپنا قیمتی وقت اور پیسہ خرچ کیا وہ بھی جرمنی میں بکھرے ہوئے اس مکمل ذخیرے تک نہیں پہنچ سکے۔ ان میں ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی وغیرہ اہم ترین نام ہیں۔ ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی کو جرمنی میں اپنے 7 سالہ قیام کے دوران تلاش کے بعد بھی کئی سو قلمی نسخوں کا پتہ نہیں چل سکا۔ خسرو 13 ویں صدی میں تھے اسپرینگر 18 ویں صدی میں ان کے ہندوی کلام کو شائع کرتا ہے اور باقی جرمنی لے جاتا ہے ہمارے محققین اس کے 50 سال بعد خسرو کے ہندوی کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ اسپرینگر سے سب سے پہلا تعارف سید شمس اللہ قادری 1925 میں شائع اپنی کتاب 'اردوئے قدیم' کے ذریعے کراتے ہیں۔ اس کے دو سال قبل 1918 میں خسرو کے ہندوی کلام پر تفصیلی کتاب جواہر خسروی ایم اے او کالج پریس علی گڑھ سے شائع ہو چکی تھی۔ جواہر خسروی کے مرتبین مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی اور مولانا رشید احمد سالم نے اس وقت تک خسرو کے تمام دستیاب ہندوی کلام کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ (بحوالہ تاریخ ادب اردو جلد دوم از سید جعفر اور گیان چند جین۔ ناشر این سی پی یو ایل)۔

اس سوال کو اردو کے ادیب اور افسانہ نگار انتظار حسین نے بھی اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ ہندوی شاعری خسرو کی تمام تر شاعری کا ماحصل تھی آخر اس کے ساتھ اس طرح کا رویہ کیوں کر اختیار کیا گیا۔ انھوں نے خسرو کی ہندوی شاعری کو ان کی فارسی شاعری پر ترجیح دی ہے۔ انتظار حسین نے کہا کہ جو شاعری خلقت کے حافظے میں محفوظ رہتی ہے وہی بڑی اور اصل شاعری ہے۔ (علامتوں کا زوال از انتظار حسین مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) انھوں

نے خسرو کی ہندوی شاعری کی گمشدگی کے لیے 'طہارت پسند' مسلمانوں کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ طہارت پسند مسلمانوں نے ایک خسرو کی جگہ کئی خسرو بنائے بلکہ اپنے مزاج اور ذہن کے مطابق انھوں نے خسرو کا ایک فریم ورک تیار کیا اس فریم میں انھوں نے خسرو کی شخصیت کو فٹ کرنے کی کوشش کی اور جو بھی مواد اور شاعری اس فریم میں فٹ نہیں ہو رہا تھا اسے ''انھوں نے خسرو کی شخصیت کا فالتو حصہ جانا اور اسے غتر بود کر دیا۔'' (علامتوں کا زوال از انتظار حسین) وہ کہتے ہیں کہ خسرو نے فارسی شاعری بہت اچھی کی مگر صرف اسی پر قانع نہیں رہے بلکہ انھوں نے ہندوی میں اس سے بھی اچھی شاعری کی کیونکہ وہ ہند کی مٹی سے گہرائی سے جڑے ہوئے تھے اور اس سے بھی گہرائی سے وہ یہاں کے لوگوں سے جڑے تھے۔ وہ برج بھاشا کے ماہر (Specialist) تھے۔

گیان چند جین کے مطابق خسرو کے زمانے میں ہندی (ہندوی) اور اردو کا فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ دونوں زبانیں ایک تھیں (کھڑی بولی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ بحوالہ خسرو شناسی از ظ انصاری) انھوں نے خسرو کی مادری زبان کے حوالے سے کہا ہے کہ خسرو کی مادری زبان مغربی ہندی تھی جب کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ دلی میں گزرا جہاں کی زبان کھڑی بولی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خسرو کی شاعری میں کھڑی بولی کے ساتھ برج بھاشا کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ برج بھاشا کی مہارت اور ان کی ہندوی شاعری کی جدت اور اختراع سے متاثر ہو کر مولانا محمد حسین آزاد انھیں نظم اردو کے اول ترین شاعر شمار کرتے ہیں۔ 'امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلی درجہ صنعت و ایجاد کی رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا... (آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد)۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام میں گیت، دوہے، پہیلیاں ہیں ان میں دو طرح کی پہیلیاں ہیں ایک وہ جن کے معنی وہ خود پہیلیوں میں بتا دیتے ہیں اور دوسری پہیلی وہ ہے جن کے معنی وہ نہیں بتاتے وہ کہہ مکرنیاں ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی پہیلی ہے جس میں اس کا جواب اے سکھی ساجن نا سکھی... کہہ کر دیا رہتا ہے جس کے بعد اس کا نام کہہ مکرنی پڑا۔ دو سخنے وہ ہے جس میں دو یا تین سوالوں کا ایک جواب دیا ہوتا ہے۔ انمل کو ڈھکوسلا بھی کہتے ہیں اس میں وہ کئی طرح کے غیر متعلق لفظوں سے نظم تیار کرتے ہیں۔ نسبتیں وہ دوہے ہیں جن میں دو الفاظ میں رشتہ قائم کیا جاتا ہے۔ یہ تمام تخلیقات ان کی ہندوی شاعری کا حصہ ہیں۔

ہمارے نقادوں اور محققین نے خسرو کے صرف فارسی کلام کو ہی وقیع سمجھا اور ان کے مطابق اردو کلام کا معاملہ لے دے کے کل یہ تھا کہ بی چمو کے لیے کچھ لکھ دیا، کچھ چھولے والیوں کے لیے کہہ دیا اور کچھ بھٹیارنیوں کے لیے چلتے چلتے کہہ دیا (علامتوں کا زوال)۔ اگر محقق حضرات اس طرح کی باتیں کہتے ہیں تو اس میں کتنی سچائی ہے کہ ایک اتنا اونچے درجے کا باکمال شاعر چلتے چلتے اتنا بڑا ذخیرہ شاعری کا چھوڑ دے اور اسے وہ اہمیت نہ دے۔ شبلی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''ہندوستان میں 600 برسوں سے آج تک اس درجے کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف گونا گوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعر کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔'' (شعر العجم جلد دوم) تاریخ ادب اردو میں گیان چند جین کہتے ہیں کہ خسرو ہندوی زبان سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی فارسی تصانیف میں اکثر و بیشتر ہندوی کے جملے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے حوالے سے انتظار حسین ایک نئی دلیل دیتے ہیں۔ خسرو ہند کی مٹی کے سپوت تھے اور انھیں فارسی میں شاعری کرتے ہوئے بار بار اجنبیت کا احساس ہوتا تھا۔ انھیں یہاں کے خوشبوؤں، رنگوں اور یہاں کے لہجے و لفظوں کی تلاش کے لیے یہاں کی زبان، رسموں، رواجوں اور روایتوں سے جڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی وہ وقت تھا جب خسرو کو فارسی شاعری کے ناکافی ہونے کا احساس ہوا۔ خسرو کو اپنے بیان کی وسعت کی تلاش میں برج بھاشا کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے ہندوی نام دیا۔ غالب بھی تو اپنے فارسی کلام کو بہت قابل احترام سمجھتے تھے اور ریختہ کو یونہی چلتے پھرتے کہہ دیا کرتے تھے (یادگار غالب از مولانا الطاف حسین حالی) مگر ان کا ریختہ کلام ان کی زندگی میں ہی منظر عام پر آ گیا تھا اس لیے وہ آج ہمارے سامنے موجود ہے اور یہ کتنی بڑی سچائی ہے کہ آج دنیا میں غالب کی مقبولیت کی وجہ ان کی فارسی شاعری نہیں بلکہ ان کی ریختہ میں کہی ہوئی وہ غزلیں ہیں جنھیں قاری اپنے ذہن و دل کے قریب تر سمجھتا ہے۔ امیر خسرو کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہندوی کلام کو خود محفوظ نہیں رکھ سکے اور تاریخ نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ محققین نے ان کے زیادہ تر ہندوی کلام کو متنازعہ بنا دیا۔ ان کا جتنا اور جو کچھ بھی ہندوی کلام عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہ سکا ان پر ہمارے محققین بحثیں کرتے رہتے ہیں کہ آیا یہ کلام خسرو کا ہے بھی یا نہیں۔

یہ بحث بہت طویل ہو سکتی ہے کہ خسرو کی ہندوی شاعری اصل ہے یا نہیں مگر خسرو زمین سے جڑ کر ایک ایسی شخصیت بن گیا جسے آج بھی تلاش کیا جائے تو کئی مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ آج سیاست ہو یا ادب ہر شعبے میں خسرو کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ خسرو نے جب ہندوی میں شاعری شروع کی تو ہندوی جو بعد میں اردو میں تبدیل ہو گئی اس کے ابتدائی خدو خال ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم پوری شدت سے کہہ سکتے ہیں کہ خسرو نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے قواعد اور لفظیات کو بہت قرینے سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی ہوگی۔ گاؤں کے کنوئیں پر پانی بھرنے والی عورتوں نے جس انداز میں ان سے بات کی اسی انداز میں انھوں نے ان سے بات کر لی۔

کھیر پکائی جتن سے چرکھا دیا چلائے
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی پلا

(ایک کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کنویں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انھیں پہچانتی تھی اس نے اوروں سے کہا دیکھو خسرو یہی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے جس کے سب گیت گاتے ہیں، انھوں نے کہا ہاں اس پر ان میں ایک بولی مجھے کھیر پر بات کہہ دے، دوسری نے چرکھا کا نام لیا تیسری نے ڈھول اور چوتھی نے کتے کا۔ انھوں نے کہا کہ پیاس لگی ہے پانی پلا دے وہ بولیں جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا نہ پلائیں گی۔ انھوں نے جھٹ کہا۔ آب حیات)

خسرو کے محلے میں رہنے والی چمو بائی جو بہت اچھی بھانگ بناتی تھی۔ اس کی دوکان پر محلے کے لونڈے اور چھچھورے بیٹھ کر بھانگ چرس پیا کرتے تھے۔ اس راستے سے خسرو کے آتے جاتے چمو بائی بھی سلام کرتی اور انھیں حقہ پیش کرتی۔ وہ اکثر خسرو سے کہا کرتی کہ 'ذرا لونڈی کے نام پر کچھ کہہ دیں' (آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد) تاکہ اس کا نام دنیا میں باقی رہ جائے۔ اس نے کہا کہ ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی، بناتے ہو کتابیں لکھتے ہو، بھٹیارن کے لڑکے کے لیے خالق باری لکھ دیا... چمو کی متواتر فرمائش پر خسرو نے اس کے لیے لکھا۔

اوروں کی چوپہری باجے چمو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جس میں ناہیں توسل
اوروں کے جہاں سینگ سماوے چمو کے وہاں موسل

(یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں بادشاہوں کے یہاں ان دنوں چوپہری بجتی تھی چمو کے یہاں اٹھ پہری بجتی ہے۔ یہ جنگلی گنواروں کا کام نہیں ان کی دوکان پر

صرف سفید پوش شہری آتے ہیں۔ یہ بھنگ صاف مصفی خاطر کرتی ہے جس میں تس تکا نہ ہو۔ بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتے ہیں کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سینک کھڑی رہتی ہے۔ خسرو اس میں مبالغہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ ترجمہ مولانا محمد حسین آزاد ماخوذ آب حیات)

ان دوہوں میں زبان کی ساخت اور قواعد وضوابط کی تلاش کرنے لگیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بڑے شاعر کی شاعری نہیں ہے۔ لیکن اسی زمانے میں صرف خسرو ہی نہیں نظام الدین اولیا اور ان سے قبل شیخ شرف الدین بو علی قلندر مخدوم بھی ہندوی میں شعر کہہ رہے تھے۔ قلندر کا یہ دوہا بہت مشہور ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

اس دوہے پر محققین نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ محمود شیرانی نے تو اس دوہے میں لفظوں کی ساخت اور اس کے استعمال پر ہی سوال کھڑا کر دیا ہے۔ شیرانی کہتے ہیں کہ یہ دوہا اس زمانے کا ہے ہی نہیں کیوں کہ اس کی زبان بہت صاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شکار لفظ کو ہندی میں سکارے لکھ دیا گیا ہے۔ جب کہ (تاریخ ادب اردو جلد دوم از جمیل جالبی) میں گیان چند جین کا خیال ہے کہ سکارے سنسکرت لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں کل صبح۔ اس ضمن میں ان کا ایک دوہا جس کی زبان بہت صاف ستھری ہے۔

ساہرے نہ مانیوں پیو کے نین تھانو
کنہ نہ پوچھی بات روی دھنی سہاگن نانوں

بوعلی قلندر

اس طرح دیکھا جائے تو اسی زمانے میں امیر حسن سنجری جو خسرو کے دوست کے ساتھ ساتھ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید بھی تھے ٹھیک اسی طرح کی شاعری کر رہے تھے۔

جب تے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ ہی آیا کریں یا مجکو لیں بلوائے کر

اس دوہے کے بارے میں میر نے نکات الشعرا میں کہا ہے کہ یہ کسی حسن نامی شاعر کا کلام ہے۔ اسی طرح بابا فرید گنج شکر، علاء الدین علی احمد صابر کلیری، شیخ سراج الدین عثمان، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور خواجہ مسود سعد سلمان وغیرہ نے بھی ہندوی میں شاعری کی ہے جو اردو کی ابتدائی شکل کہی جا سکتی ہے۔

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر
کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

صابر کلیری

بابا فرید گنج شکر کا ہندوی میں ایک غزل کے چند شعر قابل ذکر ہیں

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
فریدہ دھر سولی پنجرہ تیلیاں تھوکن کاگ
اب اجیون باہورے تو دھن ہمارے بھاگ

بابا فرید گنج شکر

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر کے تیر
پنکھ پسارے بس ہرے نرل کرے سریر
شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے
گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

دسویں صدی کے بعد ہندوستان میں جو اردو بن رہی تھی اسے اس وقت کے شعراء اور ادباء نے اسے ہندوی کہا۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس ہندوی کو ہی ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسا کرنے کے دوران ہم نے ان تمام صوفیوں اور شاعروں کے کلام کو ہی خارج کرنا شروع کر دیا جنھوں نے ہندوی میں شاعری کی تھی۔ دراصل ہندوی فارسی سے زیادہ دلچسپ اور عوام کے زیادہ قریب تھی۔ اسی لیے 18ویں صدی میں جب اردوئے معلی کو ریختہ کہا جانے لگا تو وہ محاورے اور عام بول چال کی ترکیبیں سب کو چھوڑتے چلے گئے۔ اسی گہما گہمی میں اردو والوں نے کبیر، نانک اور رسکھان کو خارج کر دیا (علامتوں کا زوال) ریختہ کا دور آتے آتے امیر خسرو کے ہندوی کلام کو اردو سے خارج کر دیا گیا۔ یہی لوگ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو بھی عامیانہ کہہ کر اردو غزل کو معتبر بناتے رہے۔ مگر اس سے زبان کی ساخت رکی نہیں زبان تو دریا ہے جو اپنی روانی میں بہتی رہی ہے۔ لیکن انتظار حسین اس بات پر افسوس کا اظہار ضرور کرتے ہیں کہ اردو سے رات غائب ہونے لگی اور اس کی جگہ خالص شب تارنے لے لی۔ اردو شاعری سے چھوٹی بی غائب ہونے لگیں اور رند اور ناصح اپنی جگہ جمانے لگے۔ انتظار حسین کے مطابق زبان کو خالص کرنے کے چکر میں ہمارے محققین نے ایک پوری زبان کو ہی صاف کر دیا۔ محمود شیرانی اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں خسرو کی ایک غزل درج کرتے ہیں۔

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر
ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر

اس کے بعد وہ اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔" انتظار حسین کہتے ہیں کہ ارے صاحب کیوں نہیں مانیں گے (علامتوں کا زوال) عرش ملسیانی نے بھی سوال اٹھایا ہے کہ شیرانی صاحب شیخ فرید الدین گنج شکر (وفات 1265) کی نظم۔ "وقت سحر وقت مناجات ہے۔ خیز دراں وقت کہ برکات ہے" پر اعتراض کیوں نہیں کرتے (امیر خسرو عہد فن اور شخصیت)۔ اسی طرح نام دیو خسرو کی وفات کے تین سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی زبان بھی انتہائی صاف ستھری ہے۔

مائی نہ ہوتی باپ نہ ہوتے کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں سے آیا

صرف خسرو کی ہندوی زبان کی صداقت پر اعتراض ناقابل فہم ہے۔ آخر خسرو نے کیا قصور کیا ہے۔ دراصل دقت یہ ہے کہ خسرو نے اپنی ہندوی شاعری میں چشم کی جگہ نین، شب کی جگہ رین اور اور محبوب کو ساجن لکھ دیا ہے۔ اس بات کو ہمارے اعلیٰ تمدنی و ثقافتی ماحول برداشت نہیں کر پایا اور ان کی شخصی عظمت کے مقابلے ان کے الفاظ کو ہیچ سمجھا۔ امیر خسرو کی شخصیت کو ہم اتنی اونچائیوں پر دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ موجودہ اردو کے محقق یہ سوچنے لگے ہیں کہ وہ اتنی عامیانہ بات کیسے لکھ سکتے ہیں۔ امیر خسرو فارسی معلی میں مثنوی شریف اور غزل شریف لکھنے والے ایسی زبان کیوں کر استعمال کر سکتے ہیں۔ جمیل جالبی کے مطابق امیر خسرو دو تہذیبوں کے ملن کی نمائندہ شخصیت تھے۔ وہ ایک طرح سے سنگم تھے جہاں دو بڑی تہذیبوں کے دھارے مل رہے تھے۔ وہ خود تہذیب کی علامت بھی ہیں اور اس کے ناخدا بھی۔ وہ ایسے شاعر تھے جن کی مٹھاس آج بھی بدستور بنی ہوئی ہے (تاریخ ادب اردو جلد اول)۔ ان کی شاعری میں کہیں سے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ 12ویں صدی میں خسرو ہند مسلم تہذیب کے نمائندہ شاعر تھے۔ اسی لیے ان کی ہندوی شاعری میں وہ تمام باتیں اپنی آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہیں جو اس وقت معاشرے میں گھلی ملی تھیں۔ جالبی کے مطابق خسرو نے صرف اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ بعد کے بھی تہذیبی دھارے کو متاثر کیا (تاریخ ادب اردو جلد اول)۔ خسرو ایک بڑے شاعر تھے، ایک بڑے موسیقار تھے۔ ان سب سے زیادہ وہ ایک بہت بڑے زبان دان تھے۔ اگر آج ہم نے خسرو کی زبان کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہوتا تو اردو کی حالت کچھ اور ہوتی۔

■

Dr. Zakir Husain Zakir
Shanti Nagar, Ward No: 7
Deoria - 274001 (UP)
Mob: 09450479788

شکیب جلالی کی غزلوں میں عصری حسیت

سلیم انور

بیسویں صدی کے نصف اول میں چند ایسے شعرا ابھرے جنھوں نے غزل کی شاہراہ پر قدم رکھا اور مشعل غزل کو از سر نو تجلی بخشی اور اسے اپنے خیالات و تجربات سے ایک ممتاز اور بلند مرتبے سے ہمکنار کیا۔ ان شعرا میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، عرفان صدیقی، احمد مشتاق، احمد فراز اور شہزاد احمد وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں کے درمیان ایک ایسا جواں مرگ شاعر بھی تھا جس کی عمر انتہائی قلیل تھی، میری مراد اردو غزل کی امید گاہ اور عصر رواں کی روح تصور کیے جانے والے شاعر شکیب جلالی سے ہے۔ ان کا اصل نام سید حسن رضوی تھا لیکن شاعری میں شکیب تخلص کرتے تھے۔ یکم اکتوبر 1934 کو اتر پردیش کے شہر علی گڑھ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ لیکن بعد میں پاکستان چلے گئے جہاں محض 32 برس کی عمر میں 12 نومبر 1966 کو راہی ملک عدم ہوئے۔ قلیل عمر میں انھوں نے شعر و ادب کی دنیا میں بڑا کارنامہ انجام دیا اور سرمایۂ غزل کو نہ صرف وسعت بخشی بلکہ نئے نئے شعری تجربے بھی کیے، جس کے باعث ان کا شمار نئی شاعری کے چند اہم اور معتبر شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''برصغیر کی تقسیم کے بعد ہند و پاک میں جن معدودے چند غزل گو شعرا نے اپنے لہجے اور فکری رویوں سے تازگی اور سلیقۂ اظہار کا ثبوت فراہم کیا ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ شکیب جلالی کا شمار یقینی طور پر ایسے ہی ممتاز غزل گو شاعروں میں کیا جا سکتا ہے۔ شکیب جلالی، ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے نسبتاً کم عمر معاصرین میں تھے۔ ان کی ابتدائی غزلوں نے ہی ادبی جرائد کے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی، یہ محض سوئے اتفاق تھا کہ قدرت نے ان کو طویل عمر سے نہیں نوازا۔ مگر دو دہائی کے عرصے میں انہوں نے جو کہا، اسے انتخاب کا نام دیا جانا چاہیے۔''

(شکیب جلالی کی غزل کے امتیازات: پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مشمولہ: کلیات شکیب جلالی، فرید بک ڈپو نئی دہلی 2007، ص 82)

15 برس کی عمر میں شکیب جلالی کے شعری سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ ان کا مکمل سرمایۂ سخن محض 17 سال کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی جملہ اصناف سخن غزل، نظم، قطعہ اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اصلاً وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں نہ صرف غزل کی ہیئت میں ہیں بلکہ ان میں غزل سا رنگ و آہنگ اور غنائیت بھی موجزن ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صنف غزل سے انھیں کس قدر انسیت تھی۔ انھوں نے احساسات و جذبات اور تجربات کی سنگلاخ گھاٹیوں کی بادیہ پیمائی کی، اس کے بعد دنیائے شاعری میں ورود فرمایا اور غزل کی ایسی آبیاری کی جو ضرب المثل ہے، اس میں ایسی رنگ آمیزیاں اور ایسی کشش پیدا کی جو دلنشیں ہے، وہ مزاج اور وہ ساز و آہنگ عطا کیا جو لوگوں کے داخلی جذبہ و احساس کا بوسہ لیتے ہیں۔ اپنے افکار و خیالات، جدید رجحانات، شعوری وجدان، گہرے فنی رچاؤ، ادراک و آگہی کی بالیدگی سے غزل کے سرمایہ میں وہ بیش بہا اضافہ کیا کہ اس سے غزل نے ایک سنبھالا لیا اور اس میں ابدی عظمت و وقعت کے امکانات روشن ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں قارئین غزل کے دلوں کی دھڑکن بن گئے اور ان کے بے شمار اشعار زباں زد خاص و عام ہو گئے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شکیب جلالی کے کلام کو پڑھیں تو ہمیں جگہ جگہ ایسے شعر نظر آتے ہیں جو ضرب المثل کی حد تک مانوس ہو چکے ہیں اور نئی شاعری کی پہچان بیان کرنے کے لیے اکثر مذکور ہوتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شکیب جلالی کے سوا کوئی جدید شاعر نہیں ہے جس نے اتنی کم عمر پائی ہو اور جس کا کلام اتنا مختصر ہو اور پھر بھی جس کے شعر اتنی کثیر تعداد میں مقبول خاص و عام ہو چکے ہوں۔ شکیب جلالی کی اکثر غزلوں کا ایک شعر، بلکہ بعض غزلوں کے تو دو دو شعر آج بھی ہماری زبان پر ہیں۔''

(معرفت شعر نو: شمس الرحمٰن فاروقی، مرتب: سید ارشاد حیدر، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد 2010، ص 237)

شکیب جلالی کی غزلیہ شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ان کی غزلیں کثیر الجہات اور گوناگوں کیفیات کی حامل ہیں۔ کہیں پر غم عشق اور غم روزگار ہے تو کہیں پر آرائش خم و کاکل اور اندیشہ ہائے دور دراز، کسی جگہ پر قومی ناآسودگی ہے تو کسی مقام پر قومی افراط و تفریط اور عصری جذبہ احساس کی جلوہ سامانی ہے۔ بات جب احساسات و جذبات کی آتی ہے تو شاعر کا عہد و ماحول اور اس کا سماج پردۂ ذہن و ادراک پر رقص کرنے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر اپنے عہد و ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سماج میں وہ جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اسے جذبہ و احساس کی آنچ میں پگھلا کر شعری پیکر میں ڈھال دیتا ہے، اس سے اس عہد و ماحول اور سماج کی تصویر شفاف اور روشن آئینے کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ شکیب جلالی بھی اس سے اچھوتے نہیں تھے۔ انھوں نے بھی اپنے عہد و ماحول کے شب و روز پر بڑی باریک اور عمیق نگاہ ڈالی، اس کے نشیب و فراز میں غوطہ زنی کی، اس کے وسیع و عریض صحرا کی خاک چھانی، تب جا کر ان کا ذوق اتنا نکھرا ہوا اور اپنے عہد و ماحول سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ جب جب مسرت و شادکامی کے مواقع آئے ہیں انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسی گل کاریاں کیں کہ اس سے ایک مترنم اور فرحت بخش فضا پیدا ہو گئی اور جب زمانے کے اوراق بکھرے، رنج و آلام اور اجاڑ کے دن آئے تو غزل کی زمین کو اپنے خونیں مضامین سے لالہ زار کر دیا۔ چند اشعار قابل توجہ ہیں:

موسم گل ہے، بھری برسات ہے
جام چھلکاؤ، اندھیری رات ہے

مانند صبا جدھر گئے ہم
کلیوں کو نہال کر گئے ہم

مستی سی چھا رہی ہے فضائے حیات پر
کوئی شراب گھول رہا ہے نگاہ سے

ساغر چشم سے سرشار نظر آتے ہیں
بہکے بہکے جو یہ مے خوار نظر آتے ہیں

تم نے تقدیر جگا دی مرے ارمانوں کی
رشک کرتی ہیں فضائیں بھی شبستانوں کی

دیکھ کر اپنے در و بام لرز جاتا ہوں
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

ساحل تمام اشک ندامت سے اٹ گیا
دریا سے کوئی شخص تو پیاسا پلٹ گیا

شکیب نے کرب ذات، داخلی رنج و الم اور شوق تنہائی کو بے شمار اشعار میں جگہ دی

ہے۔ بیشتر شعرا نے اپنے فکری محرکات کو جدید رنگ و آہنگ کا پیراہن عطا کرنے اور اسے عصری محاکات سے منضبط کرنے کے لیے روایتی غزل کے مضامین اور اس کے لوازمات سے یکسر انحراف کیا ہے۔ لیکن شکیب جلالی ان تمام شعرا سے مختلف اور منفرد خصوصیت کے پروردہ ہیں۔ وہ روایتی طرز اظہار کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی غزلوں کو جدید رنگ و آہنگ سے بڑے استقلال سے مربوط کرتے ہیں جس سے ان کی غزلوں میں ندرت اور معنوی تہہ داری جیسے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ اوصاف ان کی شاعری کو آفاقیت کے حامل بناتے ہیں:

''شکیب جلالی کا کلام عصری حسیت سے بھرپور ہے۔ ان کے لہجے میں کلاسیکیت ہے اور جدیدیت بھی۔ فنی بالیدگی بھی ہے اور انسان دوستی بھی۔ شکیب جلالی کی طرح کے شاعر اپنے کلام کی تہہ داری اور معنویت کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

(احساس تا آسودگی کا شاعر: پروفیسر جعفر رضا، مشمولہ کلیات شکیب جلالی، فرید بک ڈپو نئی دہلی 2007، ص 101)

نئی غزل کے اکثر شعرا کے یہاں تنہائی کے مضامین کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نئی تہذیب کے رونما ہونے سے مشترکہ خاندان انتشار سے دوچار ہو رہے ہیں جس کے سبب تنہائی کی کیفیت رواج پا رہی ہے، تہذیبی قدریں پامال ہو رہی ہیں، ہر طرف اداسی اور ناامیدی اپنا قبضہ جما رہی ہے جس سے نئے دور کا انسان ذہنی انتشار، کشمکش، کرب، بے چینی، چڑچڑاہٹ، الجھن کے حصار میں مقید ہوتا جا رہا ہے۔ شکیب جلالی نے بھی کچھ اسی طرح کے معاشرے میں اپنی زندگی بسر کی جس کا عکس ان کی غزلوں سے عیاں ہے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے   مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے
میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں   خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندام ہو جائے
قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا   میں آب جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا
کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی   گماں گزرتا ہے، یہ شخص دوسرا ہے کوئی

تو نے کیا کیا نہ اے زندگی، دشت و در میں پھرایا مجھے
اب تو اپنے در و بام بھی جانتے ہیں پرایا مجھے

کیا واقعی نہیں ہے یہ موسیقیوں کا شہر   کیوں چپ ہیں نغمہ کار، کہاں آ گیا ہوں میں
ہر عندلیب مرگِ تبسم پہ نوحہ خواں   ہر پھول سوگوار، کہاں آ گیا ہوں میں

شکیب جلالی کی فکری دنیا کو عصری سماج اور اس سماج کے افراد سے گہری وابستگی تھی۔ ان کی شعوری کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ان کا فکری میلان افراد و سماج کی جبلت سے آشنا ہو۔ لہٰذا انھوں نے ان سے قرب حاصل کیا اور دیکھا کہ سماج میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو پسماندگی کا شکار ہے جن کی دنیا میں سورج طلوع تو ہوتا ہے لیکن اس کے پرتو سے وہ خاطر خواہ مستفیض نہیں ہو پاتے۔ فراوانی نعمت اور آرائش دنیا سے قدرے غافل ہیں۔ اس پرمحن اور تلخ کام زندگی کو شکیب محسوس کیے بنا نہ رہ سکے۔ اپنے پڑوسیوں کی رنجیدہ خاطر طبیعت کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں
اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو

شکیب کی غزلوں میں منفی رجحانات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ دراصل یہ محض شاعر کا رجحان نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کے فرد، معاشرے اور سماج کا رجحان بن چکا ہے جس کی جانب دور جدید کا انسان تیزی سے گامزن ہے۔ جذبۂ انسانیت کا فقدان ہو رہا ہے، ہر طرف جھوٹ، فریب، ریاکاری، عیاری، مکاری، بے غیرتی اور بے حسی کا بازار گرم ہے۔ لوٹ مار، قتل و غارت، ہوس پرستی، درندگی عام ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کا سکون و قرار چھن رہا ہے اور وہ رنج و الم کی پرپیچ وادیوں میں بھٹکنے کو مجبور ہیں۔

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے   گزر ہوا ہے مرا کس اجاڑ بستی میں!
زمانے میں انساں ہے انساں کا دشمن   یہاں اب خلوص و محبت نہیں ہے
مفلسوں کی پکار ہے دنیا   رنج و غم کی شکار ہے دنیا
اُنس والفت، خلوص و غیرت کا   دامن تار تار ہے دنیا
حال باطن کسی کو کیا معلوم   ظاہراً دوست دار ہے دنیا

انھوں نے اپنے ذاتی رنج و الم اور جدید انسان کی مایوسیوں اور سوز و گداز کو بڑے حسین اور شاداب شعری پیکر میں ڈھالا ہے جس میں بلا کی اثر آفرینی ہے جو قارئین ادب کے سینوں میں اتر کر ان کے نرم گوشوں کو سہلاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہونٹوں پر زیر تبسم کی برقی لہر دوڑا دیتی ہے۔ اس جہت کے اشعار جہاں فکر و عمل کے جذبات سے معمور ہیں، وہیں جدید معنویت اور عصری حسیت کے خوشگوار امکانات سے پر ہیں۔

میں گھٹا ہوں، نہ پون ہوں، نہ چراغ   ہم نشیں میرا کوئی کیا ہوتا
کیا جانے کہ اتنی اداسی تھی رات کو   مہتاب اپنی قبر کا پتھر لگا مجھے
ستارے سسکیاں بھرتے تھے، اوس روتی تھی   فسانۂ جگرِ لخت لخت ایسا تھا

شکیب جلالی نے اپنی غزلوں میں سیاسی صورت حال کا بھی حقیقی نقشہ کھینچا ہے۔ سماج کے وہ افراد جن کے سر پر اولیت کا تاج ہے، جن کو لوگوں نے اپنا رہنما اور پیشوا تسلیم کیا ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں سے کہاں تک عہد برآ ہو رہے ہیں؟ شکیب ان سے کلی طور پر متفق نظر نہیں آتے کیونکہ انھوں نے ان کی سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا ہے اور ان کی انسانیت سوز چنگھاڑ کو سنا ہے اور ان کے جبر و ستم کی گرم بازاری کو بھی دیکھا ہے۔ اسی سبب ایسے لوگوں کو ہدف تنقید بنایا اور ان پر تیر ملامت چلائے اور طعن و تشنہ اور طنز کے شعلے برسائے ہیں۔

چلتے ہو سینہ تان کے دھرتی پہ کس لیے
تم آسماں تو سر پہ سنبھالے ہوئے نہیں

ایک دوسرے شعر میں تقریباً اسی مضمون کی بازگشت محسوس کی جا سکتی ہے۔

عشق پیشہ نہ رہے داد کے حق دار یہاں
پیش آتے ہیں رعونت سے جفا کار یہاں

نئی غزل کے متعدد شعرا نے روایتی غزل کے مضامین اور اس کے لوازمات سے یکسر انحراف کیا ہے لیکن شکیب نے کلاسیکی روایت اور جدید طرز اسلوب اور لوازمات کو اس طرح مدغم کیا ہے کہ دونوں حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوتی ہے۔ انھوں نے شعری کائنات کی تخلیق میں اس کے دروبست کا بھی خیال رکھا ہے۔ ان کی غزلوں کی زبان اپنے دور سے ہم آہنگ ہے اور یہ ہم آہنگی اپنے دور کی آواز بن گئی ہے۔

مختصر یہ کہ شکیب کی غزلیہ شاعری جملہ عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جدید انسان کی طرز حیات اور کشمکش کی سچی مرقع سازی کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں اتنے رنگ، اتنے پہلو، اتنے تیور اور اتنی جہات ہیں کہ سب کو اپنی گرفت میں لینا دشوار کن امر ہے، پھر بھی عصری حسیت کے تعلق سے بیشتر محاکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں شمس الرحمٰن فاروقی کے اس اقتباس پر اپنی بات مکمل کرتا ہوں:

''شکیب جلالی نے ہمارے زمانے کا درد اور کائنات کی وسعت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے جدید انسان کے المیے کو اپنے ہی رنگ اور اپنی ہی زبان میں بیان کیا ہے۔''

(معرفت شعر نو، شمس الرحمٰن فاروقی، مرتب: سید ارشاد حیدر، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد 2010، ص 242)

■

Saleem Anwar
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Allahabad - (UP)

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢urduduniyancpul@yahoo.co.in

ہر مرحلہ میں اردو تعلیم کا نظم کیا جائے

ناظم علی

زبان اور زمینی صورتِ حال

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگھی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر ناظم علی ایک عرصے تک تدریسی خدمات سے وابستہ رہے ہیں۔ پرنسپل کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے ہیں۔ اردو زبان کے تعلق سے نہایت سنجیدہ ہیں اور زبان و ادب کے مسائل پر اکثر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ زبان کی زمینی صورتِ حال سے بھی وہ واقف ہیں۔ اپنے اس انٹرویو میں انہوں نے اردو زبان کے حوالے سے بہت سے اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں جن پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس کے مفید نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

س1: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: جب عوام یا سماج کے مختلف طبقات زبانیں استعمال کرنا بولنا یا تحریر و تقریر کرنا موقوف کردیں تو زبانیں ختم ہوجاتی ہیں۔ پالی، پراکرت کم ہوگئی ہے۔ یہاں ریاست تلنگانہ کے تلکنڈہ ضلع کے ناگرجنا کنڈہ جزیرہ میں پالی پڑھنے والا کوئی نہیں ہے اس لیے زبانوں سے عوام کو جوڑنا چاہیے سنسکرت بھی نئی نسل میں کم استعمال میں ہے اس لیے مروجہ زبانوں کو عوام سے سماج سے مربوط کرنا چاہیے ورنہ مروجہ زبانیں موت کا شکار ہوسکتی ہیں۔ جب تک زبان کے بولنے والے زبان کو استعمال کریں گے زبان زندہ رہے گی۔

س2: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے زبان کا، علم و ادب کا تحفظ ضروری ہے اور مروجہ زبانوں میں علم و تحقیق کے سوتے جاری رہنا چاہیے اس کے علاوہ تعلیمی شعبے، تحقیقی شعبے اور تہذیبی و سرکاری معاملات میں زبانوں کا استعمال ہو تو زبانیں ہمیشہ زندہ رہیں گی نئی نسل کو مادری زبان سے مربوط رکھیں تو زبانیں کبھی مر نہیں سکتیں۔

س3: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: زبان سے ہی تمدن، معاشرہ، تہذیب و ثقافت کو فروغ ہوتا ہے۔ اخلاقی قدریں، مذہبی قدریں زبان سے ہی پروان چڑھتی ہیں۔ زبانیں ادب تخلیق کرتی ہیں، علمی سرمایہ میں اضافہ کرتی ہیں۔ اخلاق، اعمال، نیکی، ہمدردی، خلوص، محبت اور دیگر اخلاقی قدروں کو فوقیت عطا کرتی ہیں، رہن سہن، اخلاق و عادات، تہذیبی و معاشرتی رویہ زبان سے بنتے ہیں۔ ہر ملک کی تہذیب و ثقافت اس کی زبانوں کے ادب میں موجود ہوتی ہیں اس لیے زبان سے ہی ہمہ جہت ترقی ہوتی ہے۔

س4: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: جی ہاں زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ دنیا میں کئی زبانیں ختم ہوگئی ہیں اور ان کے ساتھ تہذیب اور وراثت بھی ختم ہوگئی ہے ان پر تحقیق کرنا باقی ہے جو زبانیں موت کا شکار ہوگئیں۔

س 5: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: زبان میں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ چلنے کا مادہ ہونا چاہیے۔ زمانے میں جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور عصری حالات و تقاضوں سے زبان کو مزین ہونا چاہیے اس میں سائنسی و سماجی مواد تخلیق ہونا ضروری ہے مواد کی کمی سے زبان مرتی نہیں بلکہ کمزور ہوجاتی ہے۔

س6: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: اردو زبان کو خطرات تو آزادی کے بعد پیدا ہوگئے ہیں جو بہار ماقبل آزادی ہندوستان میں اردو کی تھی وہ ختم ہوگئی۔ زبان سے منافرت نہیں رکھنا چاہیے زبانیں کسی کی ذاتی میراث نہیں یہ سب کی ہے قوم و ملک کی زبان ہوتی ہے۔ نئی نسل اردو سے دور ہوتی جارہی ہے نئی نسل کو اردو سکھائیں تو یہی نسل آئندہ صدیوں میں اردو کو لے جائے گی۔

س7: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔ نئی نسل صحیح اردو نہیں لکھ پارہی ہے اور الفاظ، املا غلط لکھے جارہے ہیں۔

س8: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ اردو، عربی مدارس اور صحافت کے ذریعے زندہ ہے تعلیمی ادارہ میں اس کا موقف کمزور ہورہا ہے۔ اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لیے اس کو دیگر ابنائے وطن میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔

س10: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان پر توجہ دے رہے ہیں۔ ادب بھی تخلیق ہورہا ہے زبان و ادب دونوں پر توجہ دیں تو زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہندوستان میں فعال تنظیمیں کم ہوگئی ہیں اگر اردو کے ادارے تنظیمیں فعال ہوتیں تو آج اردو کی ایسی حالت نہیں ہوتی بے لوث تنظیموں کا فقدان ہے ان کے پاس ٹھوس منصوبے عنقا ہیں۔ بعض تنظیمیں صرف برائے نام شہرت کے واسطے چل رہی ہیں۔ حقیقی خادم کم ہوگئے ہیں۔ مخدوم زیادہ ہیں۔

س11: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: ہر زبان میں کلاسیکیت و جدیدیت پر گفتگو ہوتی ہے اور کلاسیکی ادب و جدید ادب لکھا جارہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا گفتگو و بحث کرنے سے نئے افکار و خیالات جنم لیتے ہیں گفتگو سے زبان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے نقصان نہیں۔

س12: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: ہماری ریاست تلنگانہ میں ضلع پریشد اور DEO کے تحت سرکاری اسکول موجود ہیں۔ خانگی اردو میڈیم اسکول ضم ہوکر انگلش میڈیم میں تبدیل ہورہے ہیں ایسے اسکولوں کی تعداد کم ہے لیکن سرکاری اردو میڈیم زیادہ ہیں لیکن وہاں اساتذہ کی تقرری نہیں ہورہی ہے۔ کئی پوسٹ خالی ہیں ان پر بھرتی ہونا ضروری ہے تاکہ بچوں کی حقیقی انداز سے تربیت ہوسکے۔

س13: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: لائبریریاں تو زیادہ ہیں ان میں اخبارات رسائل بہت کم آتے ہیں اب لائبریریوں میں صرف اخبارات و میگزین پڑھے جارہے ہیں۔ کتب بینی کا شوق ماند پڑرہا ہے۔ زیادہ کتب خانوں میں پرانی کتب ہیں نئے کتب خریدنے کے لیے بجٹ نہیں ہے قاری اخبارات ورسائل پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

س14: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

جواب: اردو کی تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں مگر سوائے کانفرنس، سمینار، ادبی اجلاس ومشاعرہ منعقد کرنے کے دوسرا کام نہیں کرتے حالانکہ مذکورہ تنظیمی ادارے اردو کا بنیادی کام کرسکتے ہیں نئی نسل کو اردو پڑھانے کے لیے گرمائی اردو جماعتوں کا اہتمام کرسکتے ہیں اردو کے بنیادی و ابتدائی کام کی اہم ضرورت ہے۔ نسل نو کو اردو سکھانا ہے۔ جلسے وجلوس اجلاس تو سب ادارے تنظیمیں کرتی ہیں۔

س15: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: اردو سے جڑی شخصیات ہیں ان کا اعتراف علاقائی سطح پر ہوا ہے لیکن قومی سطح پر نہیں ہوا ہے جبکہ اعتراف کیا جانا چاہیے۔

س 16: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟

جواب: مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کوشش جاری ہے۔ کتب خانے قائم کیے ہیں۔ بچوں کو اردو پڑھانے لکھانے کے لیے مرکز قائم ہیں۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے اردو دانی، زبان دانی اردو انشا کی کلاسیں چل رہی ہیں۔

س17: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: میرے ذہن میں فروغ اردو کے لیے بہت سی تجاویز ہیں ایک تو یہ کہ نسل نو کو اردو سکھانے کے لیے محلّہ سطح پر، گھر گھر اردو سکھانے کی تجویز ہے اور جب اردو سیکھنے کے لیے لوگ زیادہ آئیں گے تو زبان کی وسعت بھی ہوگی۔ عصر حاضر میں اردو کا مسئلہ یہ ہے کہ اردو کی معیاری نئی پود پیدا کرنا ہے نئی نسل اردو سیکھ لے تو اردو کے حق میں خوش آئند عمل ہوگا۔ اردو سکھانے والے تیار ہیں لیکن اردو سیکھنے والے نہیں آرہے ہیں۔ شعرا و ادبا کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اچھے لکھنے والوں کو انعامات سے نوازیں۔

س18: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

جواب: اردو رسم الخط کی بقا ضروری ہے۔ یہی تو مسئلہ آن پڑا ہے۔ اردو لکھنے والے پیدا کریں رسم الخط زیادہ سے زیادہ بچوں کو سکھائیں۔ جب زیادہ لوگ رسم الخط جان لیں تو اردو کی خود بہ خود بقا ہوگی۔ نسل نو رسم خط سے واقف نہیں ہے۔ کسی بھی زبان کے لیے رسم الخط جان کی مانند ہے۔

س19: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں تیلگو میں اردو کے الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بندوبست، عرضی، منہا، راضی نامہ، عرضی نامہ، تحصیل، درخواست روزمرہ استعمال میں لاتے ہیں ان کے علاوہ بریانی، بل کا میٹھا اور کئی اردو الفاظ کثرت سے تیلگو والے استعمال کرتے ہیں۔

س 20: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: اہل خانہ SSc، انٹرمیڈیٹ تک اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کیے ہیں اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتے بولتے ہیں۔

س 21: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: جی ہاں بچوں کو اردو آتی ہے اور وہ اردو میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

س22: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

جواب: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے اردو سے محبت پیدا کرنی چاہیے۔ غیر اردو داں طبقہ اردو کو سیکھے۔ لیکن موجودہ دور میں زبانوں پر مذہبی لیبل لگادیا گیا ہے۔ تیلگو ہندوؤں کی زبان ہے، اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ زبان سیکھنے سے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ زبان دلوں کو جوڑتی ہے، آپس میں انسیت ومحبت پیدا کرتی ہے۔ جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے، غیر اردو داں طبقہ کو زبان سکھانے کی پیش کش کریں ان کو تہذیب وکلچر کی بنیاد پر مائل کریں۔ غزل کی چاشنی ولطافت کی وجہ سے وہ غزلیں سنتے ہیں لیکن انھیں سکھانا چاہیے۔ زبان سیکھنے کے بعد غزل سنیں تو لطف دوبالا ہوجائے گا۔

س23: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: کالجز و یونیورسٹی ہیں ان میں شعبہ اردو قائم ہے۔ دیگر مضامین کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے۔ اب ایم اے اردو کی 30 نشستیں بھی پُر نہیں ہوتیں البتہ بعض ڈگری و جونیئر کالجز میں اردو میڈیم کی متوازی جماعتیں چل رہی ہیں لیکن ان میں تعداد کم آرہی ہے۔ ریاست تلنگانہ کے اضلاع میں اردو میڈیم ہے لیکن خاطر خواہ مقررہ سیٹیں فل نہیں ہوپارہی ہیں۔

س24: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب: غیر سرکاری تنظیموں کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد کیا جائے۔ اس میں اردو کے تعلق سے لائحہ عمل مرتب کیا جائے تادم تحریر اردو کی انجمنوں، تنظیموں کا ایک بھی اجلاس قومی سطح پر نہیں ہوا۔ پورے ہند سے ایسی کانفرنس رکھیں کہ تمام ہندوستان سے علمی، ادبی، تنظیمیں شرکت کرسکیں۔

س25: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: سنٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم نہیں ہوپارہی ہے۔ میری ایک تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام کالجز اور ٹیکنیکل یونیورسٹی وعصری تعلیمی اداروں میں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ جب اردو کو انڈین زبانوں میں شمار کرتے ہیں تو اس کا ان اداروں میں پڑھانا ضروری ہے۔

■

Dr. Mohd Nazim Ali
Ex. Principle Gov Degree College
Mortar, Distt.: Nizamabad - 503224 (Telangana)

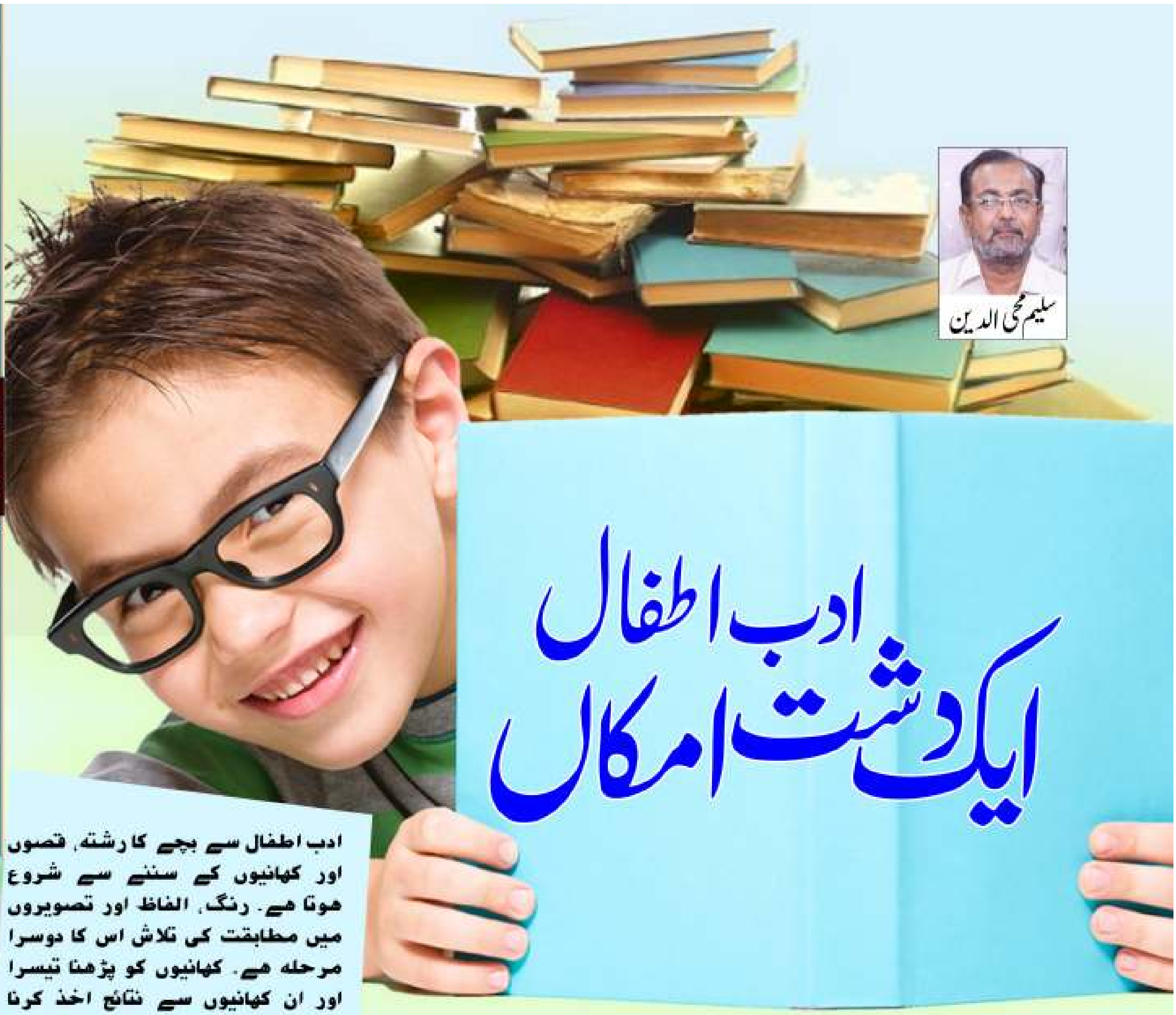

ادب اطفال
ایک دشت امکاں

سلیم محی الدین

ادب اطفال سے بچے کا رشتہ، قصوں اور کہانیوں کے سننے سے شروع ہوتا ہے۔ رنگ، الفاظ اور تصویروں میں مطابقت کی تلاش اس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ کہانیوں کو پڑھنا تیسرا اور ان کہانیوں سے نتائج اخذ کرنا چوتھا مرحلہ ہوتا ہے۔اس کڑی کا آخری مرحلہ عملی اور تخلیقی طور پر قصہ یا کہانی میں شمولیت اور اپنی زندگی پر انطباق ہوتا ہے۔

نانی اور کہانی ہمارے بچپن کے دو اہم کردار رہے ہیں۔ خاندان کے بدلتے تصور کے ہاتھوں پہلے تو ہم نانی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب الیکٹرونک آلات (Gadgets) کے دم سے کہانی دم توڑ رہی ہے۔ بچوں کے لیے یہ کہانی کچھ اور نہیں اپنے اطراف کی چیزوں سے تعلق بنانے، اپنی سمعی و بصری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور چیزوں کے متعلق ردعمل کے اظہار کے ساتھ ساتھ ادب سے اولین رابطہ بھی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ کہانی کا کھو جانا ہماری زندگی کا ایک بڑا المیہ اور اہم حادثہ ہے۔ کہانی دراصل ادب سے ہمارا پہلا واسطہ ہے جو ادب اطفال کے طفیل نصیب ہوتا ہے۔ اسی لیے کہانی سنیے اور کہانی سنائیے۔

ادب اطفال کیا ہے ؟

ادب اطفال کی کوئی متعین تعریف نہیں، میری مراد سکہ بند تعریف سے ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ادب اطفال کی تعریف اس کا قاری طے کرتا ہے۔ ڈانا مچل کے مطابق ہر وہ تحریر جو بچوں میں دلچسپی جگائے۔ ادب اطفال کے زمرے میں آئے گی۔ جس کی زبان سادہ ہو۔ جس کے کردار یا تو بچے ہوں یا بچوں کے جانے بوجھے ہوں اور مقام ایسے جو بچوں کے دیکھے بھالے ہوں یا بچے جہاں جانا پسند کریں۔ موضوع یا خیال ایسا ہو جس سے بچے مانوس ہوں یا جس کے متعلق ان کے ذہن میں ایک تصور پیدا ہوا۔[1]

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ تحریر یا کتاب ادب اطفال کے زمرے میں شامل ہوگی جس کا انتخاب اور مطالعہ بچے خود کریں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آج بھی بچوں کے لیے ادب کا انتخاب ان کے سرپرست، اساتذہ، مصنفین، دانشور اور پبلشر ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں ادب اطفال کو عموماً بچوں کے اخلاق اور کردار کی تعمیر کے تناظر ہی میں دیکھا جاتا ہے۔ ہم میں وہ وسعت نظری نہیں ہے کہ ہم بچے کو مادی دنیا کے ایک مادی وجود کے طور پر دیکھیں۔

ادب اطفال سے بچے کا رشتہ، قصوں اور کہانیوں کے سننے سے شروع ہوتا ہے۔ رنگ، الفاظ اور تصویروں میں مطابقت کی تلاش اس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ کہانیوں کو پڑھنا تیسرا اور ان کہانیوں سے نتائج اخذ کرنا چوتھا مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کڑی کا آخری مرحلہ عملی اور تخلیقی طور پر قصہ یا کہانی میں شمولیت اور اپنی زندگی پر انطباق ہوتا ہے۔

اگر خالق باری کو اردو کی پہلی ادب اطفال کی کتاب مانا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم ادب اطفال کے عالمی تناظر میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ محمد حسین آزاد، حالی اور ڈپٹی نذیر احمد بھی انیسویں صدی کے نصف دوم میں اسی وقت بچوں کا معیاری ادب تخلیق کر رہے تھے جب انگریزی میں ادب اطفال کے خدوخال واضح ہونے لگے

تھے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس قدر معیاری کلاسیکی سرمایہ رکھتے ہوئے بھی اردو ادب اطفال کا موجودہ منظر نامہ عالمی ادب کے منظر نامے سے میل نہیں کھاتا۔

عالمی ادب میں ادب اطفال آج ادب کا ایک اہم بلکہ مقبول شعبہ ہے یہ اپنے آپ میں نہ صرف افادیت کا حامل ہے بلکہ تجارتی سطح پر بھی ایک کامیاب ترین شعبہ مانا جاتا ہے۔اور یہ اپنے قارئین میں اخلاقی اقدار، سوچنے کی مہارت، شعور کی بیداری اور جذباتی ذہانت میں اضافے کے ساتھ ساتھ زبان وادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کررہا ہے۔ عالم کاری کے فروغ کے سبب دنیا سمٹ کر ایک گاؤں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ زبان اور تہذیب پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ٹام اینڈ جیری، شین چین، پوکے مان، اسپائڈرمین، مکی ماؤس، ننجا ہتھوڑی اور ڈورے مان سے لےکر ہیری پوٹر تک سبھی کردار اب ٹی وی اسکرین تک محدود نہیں رہے ہیں۔ یہ تو اب ہمارے گھروں میں دوڑتے پھرنے بھی لگے ہیں۔ہمیں اسے عالم کاری کا منفی اثر مان لینا چاہیے لیکن عالم کاری کے مثبت اثرات کی توقع رکھنا بھی غیر واجب تھوڑے ہی ہے۔ادب اطفال کے حوالے سے اس کے مثبت اثرات کچھ یوں ہونے چاہئیں کہ ہمارا بچوں کا ادب بھی سائنٹفک بنیادوں پر لکھا جائے۔اس کی اقسام اور ذیلی اصناف بھی بالکل اسی طرح متعین ہوں جس طرح عالمی ادب میں ہیں۔ادب اطفال کی تنقید اور تدریس پر بھی توجہ دی جائے۔

ادب اطفال کی درجہ بندی :

دنیا کے مقبول برقی انسائکلو پیڈیا 'وکی پیڈیا'[2] کے مطابق بچوں کے ادب کی درجہ بندی دو طریقوں اصناف اور عمر کے لحاظ سے کی جاسکتی ہے۔ادب اطفال کو بجائے خود ایک صنف تسلیم کیا جاتا ہے لہٰذا اس کی تمام اصناف، ذیلی اصناف کے زمرے میں آئیں گی۔

(1) تصویری کتابیں:ان میں تصاویر کی مدد سے حروف اور اعداد سکھائے جاتے ہیں اور یہ کتابیں الفاظ سے مبرا ہوتی ہیں۔

(2) روایتی ادب:اس زمرے میں لوک کہانیاں شامل ہوں گی جو گزشتہ تہذیبوں کے رسوم و رواج، عقائد ونظریات اور توہمات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

(3) فکشن:اس صنف کے تحت تخیلاتی، حقیقت پسندانہ اور تاریخی فکشن کا شمار ہوگا۔

(4) نان فکشن:معلوماتی مضامین یا کتابیں۔ دنیا کے متعلق حقائق۔ کسی موضوع یا خیال کی وضاحت

(5) سوانح یا خودنوشت:عظیم شخصیات کی سوانح یا خودنوشت۔

(6) شاعری اور نثر:بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری اور نثر۔

جبکہ عمر کے لحاظ سے بھی ادب اطفال کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔عمر کے لحاظ سے ان کتابوں میں زبان، پیشکش، مواد اور موضوع میں تبدیلی کی جاتی ہے۔یعنی بعض بچے اپنی عمر سے زیادہ اور بعض اپنی عمر سے کم سطح کے لٹریچر میں دلچسپی رکھ سکتے ہیں۔

(1) تصویری کتابیں:پری ریڈرس یعنی پڑھنا سیکھنے سے قبل کے بچوں کے لیے۔ عمر 5 سال۔

(2) ابتدائی کتابیں:نئے پڑھنے والوں کے لیے جو ابھی پڑھنا سیکھ رہے ہوں۔عمر 7-5 سال

(3) ابواب پر مبنی کتابیں:انھیں چیپٹر بکس بھی کہا جاتا ہے۔عمر 12-7 سال

(4) نوخیز ادب:اسے ینگ اڈلٹ فکشن کہا جاتا ہے جو 18-12 سال کی عمر کے بچوں کے لیے لکھا جاتا ہے۔

(5) نوبالغ ادب: اسے نیو اڈلٹ فکشن کہا جاتا ہے۔جو 18 سال سے زائد عمر کے بچوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ وکی پیڈیا نے ابھی اس کو شامل نہیں کیا ہے۔

نوخیز اور نو بالغ ادب میں فرق :

نوخیز ادب (Young Adult Litrature) بچپن کی حد سے نکل کر بلوغت کی سرحد پر قدم رکھنے والے 18-12 سال کے لڑکوں کے لیے لکھا جانے والا ادب ہے۔ یہ کسی بھی بچے کی عمر کا ایک اہم موڑ ہوتا ہے جہاں وہ ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی سطح پر بڑی اور اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے۔اسی لیے نوخیز ادب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ انگریزی ادب میں 60 کے دہے میں اس کی شناخت کی گئی اور 1967 میں ناول "The Outsider" کے منظر عام پر آنے کے بعد سے نوخیز ادب سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ دراصل اس کا مصنف ایس۔ای۔ ہنٹن خود ایک 17 سالہ لڑکا تھا جس نے نوبلوغت کے حقیقی اور بعض تاریک پہلوؤں پر کھل کر روشنی ڈالی تھی۔

برخلاف اس کے نوبالغوں کا ادب (New Adult Literature) کی شناخت 2009ء سے کی جانے لگی ہے۔ اس کا ہدف 30-18 سال کے وہ نوجوان ہیں جو بلوغت کی سرحد پر قدم رکھ چکے ہیں۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ نوبالغوں کے ادب کی اصطلاح سینٹ مارٹنس پریس نے 2009 میں پہلی بار استعمال کی۔ اس ادب میں مابعد بلوغت مسائل جیسے گھر سے ہجرت، تعلیم یا نوکری کے حصول میں مشکلات، تعلقات اور قطع تعلقی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض ناقدین نوبالغ ادب کو نوخیز ادب کا اگلا قدم کی بجائے اسے بالغ ادب کی ذیلی قسم تصور کرتے ہیں۔

> **عالم کاری کے فروغ کے سبب دنیا سمٹ کر ایک گائوں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ زبان اور تہذیب پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ٹام اینڈ جیری، شین چین، پوکے مان، اسپائڈرمین، مکی مائوس، ننجا ہتھوڑی اور ڈورے مان سے لے کر ہیری پوٹر تک سبھی کردار اب ٹی وی اسکرین تک محدود نہیں رہے ہیں۔ یہ تو اب ہمارے گھروں میں دوڑتے پھرنے بھی لگے ہیں۔ ہمیں اسے عالم کاری کا منفی اثر مان لینا چاہیے لیکن عالم کاری کے مثبت اثرات کی توقع رکھنا بھی غیر واجب تھوڑے ہی ہے۔**

ہیری پوٹر اور ہم :

برطانوی مصنف جے کے رولنگ کا نوخیز ادب پر مشتمل ناول ہیری پوٹر مقبولیت اور تجارت کی سطح پر ایک عدیم المثال کامیاب ناول ثابت ہوا۔فروری 2018 کے اعداد وشمار کے مطابق یہ 500 ملین سے زیادہ فروخت ہوچکا ہے۔یہی نہیں بازار میں اس کی گائیڈس کی بھی مانگ کم نہیں ہے۔ یہ دنیا کی 80 زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ یہ ہیری پوٹر اور اس کے دوستوں کی کہانی ہے جو ایک جادو سکھانے والے اسکول کے طالب علم ہیں جہاں ان کا سامنا ایک ایسے جادوگر سے ہوتا ہے جو کالے جادو میں یقین رکھتا ہے اور اسی کالے جادو کی مدد سے خود کو لافانی کرنا چاہتا ہے۔اندرونی سطح پر ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی تبدیلیوں سے گزرتے ہوئے یہ نوخیز کردار بیرونی سطح پر بھی حق و باطل کی معرکہ آرائی میں کامیاب جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کے مرکزی خیال اور اس کی پیشکش کے انداز نے دنیا بھر سے قارئین کو متوجہ کیا۔ کیا اردو میں زبان وادب کے تہذیبی پس منظر کے ساتھ ایسے کسی کردار کی تخلیق ممکن نہیں ہے جو ہمارے سوئے ہوئے بلکہ کھوئے ہوئے قاری کو تلاش کرکے بیدار کردے۔ ہمارا ہیری پوٹر کہاں ہے؟۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

قاری کی تلاش :

ہمیں اس حقیقت کو قبول کرنا ہوگا کہ ہمارے ہاں مطالعے کا کلچر روبہ زوال ہے۔ بچوں کی شخصیت کے مجموعی ارتقاء میں مطالعہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مطالعہ ہی تعلیم،

خود آموزش اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کلید ہے۔ بچوں کے ادب کے ایک اہم انگریزی مصنف للیین اسمتھ کے مطالعے کے متعلق ان خیالات کو دیکھیے:

"There are many forces in our life today which tend to seprate the child and the book. Yet does not this make it only more desirable and more necessary that the best efforts be made to bring them together."

یاد رہے کہ ان خیالات کا اظہار اسمتھ [3] نے 1953 میں کیا تھا اور اس قوم کے لیے جہاں بچوں کی ایک کتاب 500 ملین کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں ہمیں اسمتھ کی نہج پر سوچنا ہوگا اور پھر ایک بار کتاب اور بچے کے باہمی رشتے کو جوڑنے کی سر توڑ کوشش کرنی ہوگی۔ ویسے ادب اطفال کی راہ کا ایک اور روڑا ہمارا طرز تعلیم بھی ہے، ہمارا طالب علم اسی قدر ادب اطفال سے روبرو ہوتا ہے جتنا کہ یہ اس کے نصاب میں شامل ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب سے ہٹ کر بھی بچوں کو کتابیں پڑھنے کے مواقع اور فراغت نصیب ہو۔

کتاب کا نعم البدل: اسکرین:

بے شک کتاب کی اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ آج کی نئی نسل کتاب کی خوشبو سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ کتابی کیڑا کہلانے میں فخر محسوس کیا جاتا تھا لیکن اگر کسی کو کتاب ہی میں کیڑے نظر آنے لگیں تو وہ کتابی کیڑا کیسے بنے گا۔ واقعہ یہی ہے کہ ہماری نئی نسل کتاب پڑھتے ہوئے پکڑے جانے پر خود کو قدیم اور آوٹ آف ڈیٹ محسوس کرتی ہے کیونکہ ان کی ضرورت اور دلچسپی کا سارا مواد مختلف اسکرین پر موجود ہے۔ یہ اسکرین کسی موبائیل کی بھی ہوسکتی ہے، کسی ٹیبلیٹ، لیپ ٹاپ یا کمپیوٹر کی بھی۔ اسکرین سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے ہاں کتاب کی خوشبو ضرور عزیز ہے۔ جب اماں باجی کہتی تھیں کہ چاند میں پریاں رہتی ہیں تو ہر بچے کے ذہن میں پری کی ایک تصویر بن جایا کرتی تھی اور ہر ذہن کی پری دوسرے سے مختلف ہوتی تھی۔ آج ذہن میں تصویر کہاں بنتی ہے آج اسکرین پر دکھائی دینے والی پری ہی ہر ذہن کا حصہ ہے۔ کیا ہمارے بچے یکساں دیکھنے اور یکساں سوچنے پر مجبور نہیں ہیں۔ کیا یہ اسکرین قوت متخیلہ کے قاتل نہیں ہیں۔ جب تخیل ہی نہ ہو تو تخلیق کہاں سے ہوگی۔ اسکرین تخیل اور تخلیق دونوں کا دشمن ہے۔ چاہے کچھ ہو کہانی سے ربط برقرار رہنا چاہیے۔ شاید اسی لیے www.childrens-stories.net نے بچوں کی کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی ویب سائٹ پر محفوظ کرلیا ہے۔ یہ کہانیاں اسکرین پر پڑھی بھی جاسکتی ہیں اور آڈیو کی صورت میں پس منظر میں سنی بھی جاسکتی ہیں۔ اس میں مختلف مصنفین کی کہانیاں، مختلف ممالک کی کہانیاں، بچوں کے لیے لکھی گئی بچوں کی کہانیاں غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ نئے لکھنے والے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ویب سائٹ 'ینگ رائٹرس ایوارڈ' سے بھی نوازتی ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس ویب سائٹ پر بچوں کی کہانیوں کے لیے مصورین کی خدمات مفت میں فراہم کی جاتی ہیں۔ [4]

اس کے علاوہ انٹرنیشنل چلڈرنس ڈیجیٹل لائبریری ہے جس میں دنیا کی 48/ زبانوں میں ہزاروں ادب اطفال کی کتابیں موجود ہیں ان دونوں ویب سائٹس پر اردو کی چند کتابیں موجود ہیں بھارت سے پرتھم بکس۔ بنگلور کی اردو کتابیں اس میں شامل ہیں لیکن افسوس کہ یہ تمام تراجم پر مشتمل ہیں۔ کوئی طبع زاد کتاب نہیں ہے۔ لائبریری آف کانگریس میں ادب اطفال کا سیکشن موجود ہے۔ اردو میں بھی اس طرح کی پہل کی اشد ضرورت ہے کہ کتاب نا سہی اسکرین ہی سہی۔

ادب اطفال میں ڈگری:

انٹرنیٹ پر ادب اطفال کے متعلق عصری معلومات کی تلاش کے دوران مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ دنیا کی گیارہ یونیورسٹیوں میں ادب اطفال پر ڈگری سطح کی تعلیم کا نظم ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں پانچ امریکہ، چار انگلینڈ اور ایک ایک آسٹریلیا اور کینڈا کی ہیں۔ اس فہرست میں کوئی ترقی پذیر ملک شامل نہیں ہے۔ ترقی پذیر ممالک بشمول بھارت کے ہمارے ہاں ڈگری سطح پر مضمون نہ پڑھائے جانے کے باوجود تحقیق بھی کی جاسکتی ہے۔ بھارت میں ادب اطفال میں تحقیق زبان، ادب یا تدریس کے شعبے کے تحت کی جاتی ہے جبکہ مذکورہ بالا یونیورسٹیوں میں ادب اطفال میں ڈگری سے لے کر تحقیق تک لائبریری سائنس کے تحت ہوتی ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ بھارت کی پہلی چلڈرنس یونیورسٹی[5] کا قیام ریاست گجرات کے گاندھی نگر میں عمل میں آچکا ہے۔ 2009 میں قائم اس یونیورسٹی میں بنیادی طور پر تعلیم و تربیت سے متعلق مضامین کی تدریس و تحقیق جاری ہے۔ ادب اطفال کی تخلیق و تدریس بھی ہوگی۔ ضرورت ہے کہ ادب اطفال کو ڈگری سطح پر ہماری یونیورسٹیوں میں متعارف کروایا جائے۔ ڈگری نہ سہی ایک مضمون کے طور پر بھی اسے متعارف کروایا جاسکتا ہے۔ بی ایڈ اور ایم ایڈ کی سطح پر ایک مضمون یا Skill Enhancement Course کے طور پر ادب اطفال کو متعارف کیا جاسکتا ہے اور یہ کام اردو ہی سے شروع ہو تو سونے پر سہاگہ۔

ادب اطفال کی تدریس:

ڈائنا مچل امریکہ میں ادب اطفال تحریک کا ایک اہم نام ہے۔ وہ پیشے سے ایک ٹیچر رہی ہیں اور بچوں کی ادیبہ کے طور پر بھی معروف ہیں۔ 2003 میں ان کی کتاب Children's Literate are : An invitation to the world ادب اطفال کی فہم اور تدریس میں ایک اہم سنگ میل مانی جاتی ہے۔ یہ ایک جانب تو ادب اطفال کی مبادیات سے بحث کرتی ہے تو دوسری جانب تدریسی نقطہ نظر سے مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کا انداز راست مکالمے کا انداز ہے جس سے اساتذہ میں ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ادب اطفال کے حوالے سے یہ کتاب امریکی معاشرے کے چند اہم مسائل جیسے صنفی اور نسلی امتیازات پر بھی کھل کر گفتگو کرتی ہے۔

کیا اردو میں ادب اطفال کی تدریس کے لیے اسی طرح کی کتاب کی ضرورت نہیں ہے جو عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔ یہ کام بہتر انداز میں ادب اطفال کے وہ مصنفین جو عملی طور پر تدریس سے وابستہ ہیں بہت آسانی سے کرسکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ادب اطفال ایک وسیع اور بسیط موضوع ہے۔ بہت سارا کام ہوا ہے لیکن اب بھی بے شمار امکانات موجود ہیں۔ یہ ہمارے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ ہماری ہر آنے والی نسل کا ادب سے پہلا واسطہ ادب اطفال سے ہی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ میں اردو ادب کے ہر طالب علم اور ہر اختراعی اور تخلیقی ذہن کو اس جانب سنجیدگی سے متوجہ ہونے اور اس دشت امکاں کی سیر کی دعوت دیتا ہوں۔

Refrences:

1) Mitchell Diana- 2003 - Childrens Literature : An Invitation to the world. Boston : Pearson Educatiom Inc.
2) Wikipedia - 2018 : Children Literature (http://ex.wikipedia.org) accessed March 2018.
3) Smith Lillian - 1953 : A Critical Approach to Childrens Literature. American Library Association. P.7.
4) www.childrens-stories.net.
5) www.cugujrat.ac.in

■

Dr. Saleem Mohiuddin,
Asso. Professor & Head,
Dept. of Urdu,
Shri Shivaji College,
Parbhani-431401 (M.S.)
Email : saleempbn@gmail.com
Cell:9923042739

سید اسرار الحق سبیلی

عصرِ حاضر میں بچوں کی کہانیاں

کہانی نسلِ انسانی کی سب سے قدیم صنف ادب ہے، تحریری اور زبانی شکل میں کہانی دنیا کے ہر خطہ میں پائی جاتی ہے، بچے اور بڑے دونوں اسے پسند کرتے ہیں، کہانی سے نسلِ انسانی کی دل چسپی ایک فطری امر ہے، دنیا کا کوئی ایسا معاشرہ، ملک یا خطہ ارض نہیں جہاں کہانی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو، البتہ جو قومیں ترقی کے مدارج سے گزر چکی ہیں، ان کی کہانیاں ان کے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئی ہیں، اور ہم ان میں سے اکثر کہانیوں کو اپنی اپنی زبان میں پڑھ بھی سکتے ہیں، ڈاکٹر سیفی پریمی نے دنیا کی چند قدیم کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے:

''دنیا میں کہانی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، مصر و بابل کے افسانے، الیسپ کی کہانیاں، (حکایاتِ لقمان) کافی مشہور ہیں، اپنشد میں ایک تمثیل ملتی ہے کہ کتوں نے جمع ہو کر ایک سردار کو چنا اور کھانا مانگنے کے لیے شور کرنا شروع کر دیا، کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی لکھی ہوئی کہانی ہے، اس کے علاوہ مہابھارت میں بہت سی کہانیاں درج ہیں، اس کے بعد جاتک کہانیاں ملتی ہیں، یہ وہ پالی کہانیاں ہیں جو گوتم بدھ سے منسوب کی جاتی ہیں، حیوانی کہانیوں کے لیے جاتک کے بعد سنسکرت کی مشہور کتاب 'پنچ تنتر' ملتی ہے۔''[1]

کہانی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب نفسیاتی ہے، بچہ کسی بھی واقعے کو اسی صورت میں قبول نہیں کرتا جیسا وہ اس کے سامنے آتا ہے، وہ اس کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش کرتا ہے، بچے کا یہ تجسس کہ پھر کیا ہوا؟ کہانی کی جان ہے۔

بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں وہ کئی طرح کی ہوتی ہیں، جیسے: طلسمی کہانیاں، مذہبی کہانیاں، اخلاقی کہانیاں، جاسوسی کہانیاں، سائنسی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، جن بھوت، جادوگر اور راکشسوں کی کہانیاں وغیرہ۔

بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانیوں کی افادیت کے تعلق سے دانش ور، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ نفسیات اور ادیب الاطفال وغیرہ کے خیالات و نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسے:

☆ ایک حلقہ ادب اطفال میں سے راجہ رانی کی کہانیاں ہٹا دینا چاہتا ہے، کیوں کہ ان کے مطابق یہ سامراجی ذہنیت کی مظہر ہوتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آج جب شہنشاہیت کا نظام ہی نہیں تو اس نظام کو لے کر بیٹھنے سے کیا فائدہ؟

☆ ایک حلقہ مذہبی کہانیوں کو ختم کر دینے کی حمایت کرتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مذہبی کہانیاں یونگا پنتھی سکھاتی ہیں۔

☆ کچھ اور کا خیال ہے کہ پریوں کی کہانیاں بے پر کی اڑاتی ہیں، خیالی دنیا میں لے جاتی ہیں، اس زمانے میں ان کہانیوں کا کوئی جواز نہیں ہے۔

☆ تاریخی کہانیاں ماضی کا راگ الاپتی ہیں، جبکہ حال ماضی سے کہیں زیادہ اہم ہے، اس پر توجہ دینی چاہیے۔

☆ بھوت پریت کی کہانیاں ضعیف الاعتقادی بڑھاتی ہیں، جو اس سائنسی دور میں قابلِ قبول نہیں۔

☆ جاسوسی کہانیاں صرف بحث اور مباحثے پر منحصر ہوتی ہیں۔

☆ لوک کہانیاں من گڑھت ہوتی ہیں، زمانے کے

ساتھ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اصل میں متن کہیں غائب ہوتا ہے۔''[2]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا سے آج تک چلی آنے والی کہانیوں کو ادب سے خارج کر دیا جائے تو کہانی کے نام پر کیا باقی رہے گا؟

مذکورہ رائیں بچوں کی کہانیوں میں صرف منفی پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں، جب کہ ان میں زیادہ تر مثبت پہلو بھی ہیں، جن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کے ادب کے پہلے محقق، بچوں کے ادیب اور کہانی نویس ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بچوں کی نفسیات، پسند اور رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیا ہے:

''بچہ زیادہ تر ایسی ہی کہانیوں کے پڑھنے میں دل چسپی لیتا ہے، جن میں مافوق الفطرت واقعات اور کردار ہوں، جیسے: جن، پری، دیو وغیرہ۔

وہ ایسی کہانیوں کا دل دادہ ہوتا ہے جن میں جنگل اور پہاڑوں کا تذکرہ ہو، ایسے بہادروں اور سچے انسانوں کا ذکر ہو جو مصائب اور پریشانیوں کو بہادری سے برداشت کرتے ہوں، ہولناک اور خوں خوار جانوروں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دیتے ہوں، مہمات سر کرتے ہوں، اور انسانوں کو برائی اور ظلم سے نجات دلاتے ہوں۔''[3]

بچوں کی ایک اہم ادیبہ، کہانی نویس، ناول نگار اور ڈرامہ نویس ڈاکٹر بانو سرتاج نے پریوں کی کہانیوں کی افادیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

''بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں، ان کا سب سے اہم مقصد ہے تفریح۔ دوسرا مقصد تلاش کرنا حماقت ہے، بچوں کی کہانیوں میں تفریح کا فیصد 95 ہونا چاہیے، بقیہ 5 فی صد دیگر باتیں یعنی سبق، نصیحت، معلومات وغیرہ ڈالی جائیں، اس نظریے سے دیکھا جائے تو پریوں کی کہانیاں آج بھی بامقصد اور مفید ہیں۔[4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کے عروج کا دور ہے، اور اس دور میں ایسی باتیں جو سائنس سے متصادم ہوں، نا قابل اعتبار اور جہالت قرار دی جاتی ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ زبان و ادب اور سائنسی و سماجی علوم میں مہارت و بصیرت محض سائنسی ذرائع سے حاصل ہو جائے؟ زبان و ادب تمام علوم میں مہارت و بصیرت حاصل کرنے کا سرچشمہ ہے، اگر ادب کو ہم محض سائنٹفک انداز و اسلوب میں سیکھنا سکھانا چاہیں تو ہمیں نہ ادب آئے گا اور نہ ہم سائنسی مضامین میں بصیرت حاصل کر پائیں گے۔ غلام الثقلین نقوی سائنسی دور میں بچوں کی جبلّت اور ذہنی ارتقا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سائنسی دور میں شاید لوگ کہیں کہ جنوں اور پریوں کی طلسماتی گرفت سے بچوں کو آزاد کرانا لازمی ہے، تاکہ ان میں سائنسی ذہن پیدا ہو سکے، لیکن کیا کیا جائے کہ ابھی انسان کا ذہنی ارتقا اس نقطے پر نہیں پہنچ سکا جہاں وہ قطعاً معروضی ہو کر رہ جائے، اس کا بچپن تو خاص کر بہت ضدّی ہے، اور تخیل کی اس دنیا سے نہیں نکل سکا ہے، جہاں اب بھی اڑن کھٹولوں اور کل کے گھوڑوں پر پرواز کے مواقع ملتے ہیں، تخیلاتی دنیا کی یہ فرضی سیر اس کی جبلت کا ایک ایسا جزو لاینفک بن چکی ہے، جو ہوا باز جہاز اور چاند گاڑی پر اڑنے کے باوجود جوں کا توں قائم ہے۔''[5]

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ متوازن غذا کی طرح بچوں کی کہانیوں میں بھی توازن برقرار رکھا جائے، ان کے ذوق، پسند اور رجحان کا خیال رکھا جائے، اور ان کی ذہنی، شعوری، فکری اور تخیلاتی نشو و نما کے لیے جو کہانیاں مفید ہوں، ان سے ان کو روکا جائے، البتہ جب کہانیوں سے ضعیف الاعتقادی، بدعقیدگی، بداخلاقی، توہم پرستی، ڈر اور خوف وغیرہ پیدا ہوں، اور جن سے ان کی نفسیات، جذبات اور کردار پر منفی اثر پڑتا ہو، ایسی کہانیوں سے انھیں دور رکھا جائے، اور ایسی کہانیاں تحریر کرنے سے گریز کیا جائے۔ ذیل میں ان خصوصیات کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا بچوں کی کہانیوں میں ہونا ضروری ہے:

☆ کہانی میں بچوں کی ذہنی، علمی اور لسانی استطاعت و لیاقت کا خیال رکھا جائے۔
☆ بچوں کی کہانی میں تحیّر و تجسس لازمی ہے۔
☆ کہانی میں مثبت نظریہ فکر پر زور ہو۔
☆ کہانی بچوں کی قوت متخیلہ کو مہمیز کرنے والی ہو۔
☆ کہانی کے واقعات بچوں کے دماغی و ذہنی نشو و نما میں مدد کرنے والے ہوں۔
☆ کہانی میں ایسے واقعات بیان کیے جائیں جو بچوں کے ذہن پر منفی اثر نہ ڈالیں، ایسا نہ ہو کہ کہانی میں دہشت انگیز عنصر کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ بچہ دہشت زدہ ہو جائے۔
☆ کہانی کا تخیلی ہونا اچھی بات ہے، لیکن لکھنے والے کو اس انداز سے پیش کرنا چاہیے کہ سننے اور پڑھنے والے اسے جھوٹ نہ سمجھیں۔

عصر حاضر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، مکتبہ الحسنات رام پور، رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی وغیرہ اداروں نے بچوں کے لیے رنگارنگ موضوعات کے تحت کہانیاں شائع کی ہیں، جیسے:

اخلاقی کہانیاں، سبق آموز کہانیاں، اصلاحی کہانیاں، تربیتی کہانیاں، لوک کہانیاں، اساطیری اور روایتی کہانیاں، مہماتی و جاسوسی کہانیاں، حیوانی کہانیاں، تفریحی کہانیاں، مزاحیہ کہانیاں، مترجم کہانیاں، ماخوذ کہانیاں، ننھے منے بچوں کی کہانیاں، باتصویر کہانیاں اور سوانحی کہانیاں وغیرہ۔

عصر حاضر میں بچوں کے کہانی نویس کی حیثیت سے مندرجہ ذیل قلم کار صف اول میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں: انور کمال حسینی، ڈاکٹر خوشحال زیدی، تسکین زیدی، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، محمد قاسم صدیقی، اشرف صبوحی، ایم یوسف انصاری، ظفر محمود، اسد رضا ادریس خان وغیرہ۔ [6]

جب کہ مندرجہ ذیل حضرات دوسری اصناف میں شہرت کے باوجود بچوں کے اہم کہانی نگار ہیں: ڈاکٹر بانو سرتاج، وکیل نجیب، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر مشتاق اعظمی، نذیر احمد یوسفی، ڈاکٹر انور ادیب، عابدہ محبوب، ادریس صدیقی، عابد علی خاں مالیرکوٹلوی، تمنا مظفر پوری، محمد صدیق انصاری، اسحاق خضر، آفتاب حسنین، ایچ ایم یاسین ملی، عاتقہ شبلی، ہم ندیم اور طیبہ بیگم وغیرہ۔

بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنے کا مبارک کام کئی نیک توفیق ادیبوں نے بڑے خلوص کے ساتھ انجام دیا ہے، جن میں افضل حسین، خواجہ عابد نظامی، ظفر محمود، سید عبید اشرف، صفیہ سلطانہ صدیقی، ڈاکٹر انور ادیب، نور الحسن انصاری، فہیم عالم مصحفی اور مرزا مقبول بیگ بدخشانی وغیرہ ممتاز ہیں، ان کی کہانیوں میں خلوص، محبت، دین داری، امانت داری، ہم دردی، ایثار و قربانی، سچائی، انصاف، خوف خدا، جانوروں پر رحم، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک، وعدہ و عہد کی پاسداری، وفاداری، غریب پروری، بھائی چارہ اور قناعت وغیرہ جیسی اعلیٰ صفات کے ذریعہ بچوں کی سیرت و اخلاق سازی کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر بانو سرتاج، ڈاکٹر جمیل جالبی، انور کمال حسینی، ڈاکٹر مشتاق اعظمی، نذیر احمد یوسفی اور عابدہ محبوب نے بڑی دل چسپ، سبق آموز اور عبرت خیز کہانیاں لکھی ہیں، ان کی کہانیوں سے بچوں کو مندرجہ ذیل سبق ملتے ہیں: لالچ بری بلا ہے، برائی کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے، بروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے، ماں کی نصیحت پر عمل کرنے سے بڑا فائدہ ہوتا

ہے، جھوٹ اور دھوکا کا انجام بڑا خطرناک ہوتا ہے، دشمن کی پناہ میں کبھی نہیں آنا چاہیے، امتحان میں محنت کرنے کے بجائے پرچے افشا کر کے کامیاب ہونے کی خواہش بڑی مہنگی اور رسواکن ہوتی ہے، آگ سے کھیلنا جسم اور کپڑوں کے ساتھ کبھی مستقبل کو جلا دیتا ہے، بچپن کی شرارت اور ساتھیوں کی ایذارسانی مستقبل کو تاریک کردیتی ہے، دوسروں کے ساتھ سازش کرنے والا خود بھی سازش کا شکار ہو جاتا ہے، استاد کی بے عزتی کرنے پر ایک دن ویسی ہی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وغیرہ۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی، تسکین زیدی، ادریس صدیقی، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، عابد علی خان مالیر کوٹلوی، محمد یونس حسرت اور اسد رضا نے اصلاحی نوعیت کی کہانیاں لکھ کر بچوں کو بری عادتوں سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر خوش حال زیدی نے اپنی بیش تر کہانیوں میں بچوں کو چوری اور جھوٹ سے نفرت دلانے کی کوشش کی ہے، ادریس صدیقی نے اصلاحی کہانیوں کے ذریعہ بچوں اور نوخیز نسلوں کو نشے سے دور رکھنے، ان کی زندگی کو بچانے اور ان کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی نے اپنی کہانیوں میں اسکولی بچوں کو اساتذہ کے ساتھ غلط برتاؤ اور ہم جماعت ساتھیوں کو ستانے سے باز آنے کی نفسیاتی ترغیب بڑے مؤثر انداز میں دی ہے، عابد علی خاں نے اپنے افسانوی مجموعہ ''کوشش'' میں نوجوان بچوں کی بے راہ روی، بے جا غصہ، غیر سماجی سرگرمی اور راتوں رات دولت مند بننے کی خواہش کی اصلاحی کوشش کی ہے، تمنا مظفر پوری نے 'عقلمند بچے' میں توہم پرستی، شرارت اور خاندانی جھگڑے کی اصلاح کے لیے نفسیاتی انداز میں اصلاح کی کوشش کی ہے، اسد رضا نے 'ننھے منوں کی سرکار' میں بچوں کی عام غلطیوں جیسے مادری زبان سے بیزاری، سائیکل چلانے میں بد احتیاطی، کم ہمتی، کام چوری، فلم بینی، سیریلس دیکھنے میں وقت ضائع کرنا، بسیار خوری اور چٹورے پن کی بڑے مناسب انداز میں اصلاح کی ہے۔

ڈاکٹر عبد الرؤف پاریکھ، امینہ فاطمہ، اسامہ بن یوسف، عمران مقصود، صائمہ انیس، غزالہ نورانی اور شیریں مقصود نے بچوں کے لیے جسمانی صفائی، ماحول کی صفائی، صحت، جانوروں اور پرندوں سے محبت اور اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنانے کی خاطر باہمی تعاون کے ساتھ بچوں کے لیے آسان تربیتی سیریز مرتب کی ہیں، اور نورین واسطی و شکیل اعوان نے انھیں دل چسپ تصاویر سے مزین کیا ہے، ان تربیتی سیریز کے علاوہ پروفیسر محمد اسحاق جلال پوری، زبیر طارق، اور عمران خاں نے بھی بڑی دلچسپ تربیتی کہانیاں رقم کی ہیں۔

محمد قاسم صدیقی، پریم پال اشک، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر اطہر پرویز، اور ابصار عبد العلی نے ملک و بیرون ملک اور ریاستوں کی لوک کہانیاں ترتیب دی ہیں، یہ لوک کہانیاں قدیم ہونے کے باوجود اتنی دل چسپ اور رنگارنگ ہیں کہ بچے ان میں کھو کر ماضی کی حسین وادیوں میں پہنچ کر خوشی و مسرت محسوس کرتے ہیں، وہ ان کہانیوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں چھپی ہوئی حکمت و مصلح کی باتیں اور تجربات کو اپنے لیے مشعل راہ بناتے ہیں۔

اشرف صبوحی، محمد صدیق انصاری، ایم یوسف انصاری اور ڈاکٹر اطہر پرویز نے بطور خاص اساطیری اور روایتی کہانیوں کی طرف توجہ دی ہے، مؤخر الذکر نے الف لیلہ کے کئی قصوں کو از سر نو تحریر کیا ہے، یہ کہانیاں پریوں کی داستانوں، بہادر شہزادے، شہزادیوں کے حیرت انگیز کارناموں اور مہم سر کرنے کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان کہانیوں میں حقیقت اور تخیل کی آمیزش ہے، ان کہانیوں سے بچوں کے تخیل کی تربیت ہوتی ہے، ان میں ایمان داری، بہادری، صبر و تحمل، مسائل سے نبرد آزما ہونے، سخت محنت اور جد و جہد کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اور باطل، جھوٹ اور ظلم سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کے اندر کچھ زیادہ ہی تجسس ہوتا ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی غور کرتے ہیں، جن کی طرف بڑے دھیان نہیں دیتے، بچوں میں بڑوں سے زیادہ ہمت اور مہم جوئی کا جذبہ ہوتا ہے، وہ اپنی نادانی، سادگی اور معصومیت میں ایسی مہم سر کر لیتے ہیں جن کو سر کرنے کی ہمت بڑوں میں نہیں ہوتی ہے، اس لیے بچوں کو مہماتی اور جاسوسی کہانیاں پسند آتی ہیں، ان کہانیوں سے بچوں میں بلند ہمتی، شجاعت، حق تک رسائی، مظلوموں کی مدد، صبر اور مشکلات پر قابو پانے کا جذبہ و حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اس صنف پر بچوں کے ادیبوں نے کم توجہ دی، تاہم ایم یوسف انصاری، ظفر محمود، ثریا فرخ، ریاض احمد خاں، اور ادریس خاں اس صنف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

جانوروں سے بچوں کو غیر معمولی دل چسپی ہوتی ہے، وہ جانوروں کو دیکھ کر مچل جاتے ہیں، اس لیے جانوروں اور ان کے شکار سے متعلق کہانی بڑے شوق سے سنتے ہیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی 'خالق چچا نے شکار کھیلا' ریحان احمد عباسی کی 'جنگل کی ایک رات' آفتاب حسنین کی 'کہانیاں جانوروں کی' اور اسحاق خضر کی 'راجا رانی ایک کہانی' حیوانی کہانیوں کے اہم مجموعے ہیں۔

بچوں کے ادب کا اصل مقصد تفریح طبع ہے، جو دل چسپ اور پرکشش تحریر سے حاصل ہوتا ہے، اگر ادب پارہ میں بچوں کی تفریح اور دل چسپی کا خیال نہ رکھا جائے تو بچے اسے رد کر دیتے ہیں، بچوں کے بہت سے ادیبوں نے اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے دل چسپی سے پر خالص تفریحی کہانیاں لکھی ہیں، تاکہ بچے اپنی مرضی سے ادب کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں، جیسے: قدسیہ زیدی کی 'گلابو چوہیا اور غبارے' اشرف صبوحی کی 'شریر شیر' اسلم فرخی کی 'قلفی والی سائیکل' غلام حیدر کی 'آخری چوری' اور رفیع الدین مجاہد کی 'عقل مند لڑکا' وغیرہ۔

بچوں کو مزاح سے بہت دل چسپی ہوتی ہے، وہ مزاحیہ لطیفے، چٹکلے اور کہانیاں بہت پسند کرتے ہیں، بچوں کے رسالہ پھول کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج نے ''چچا چھکن'' کے مزاحیہ کردار سے اس کی ابتدا کی، ادریس خاں نے اس میں بڑی توسیع کی ہے، سید اسد رضا نقوی (چاند نگر کی سیر) ایچ۔ ایم۔ یاسین ملی (چچامیاں) اور ایم مبین وغیرہ کے ذریعہ بچوں کے ادب میں ہنوز یہ سلسلہ حسن و خوبی کے ساتھ جاری ہے۔

اقوام کے درمیان سماجی، سیاسی، معاشی، علمی، فکری، ادبی، اور تہذیبی رابطہ میں ترجمہ کا بڑا دخل ہے، ترجمے کے وسیلے سے ہی ایک قوم دوسری قوم کی علمی و تہذیبی خصوصیات سے واقف ہوتی ہے، ادب شناس اور دوسری زبان سے واقف باصلاحیت افراد دوسری زبانوں سے اپنی مادری زبان میں ترجمہ کر کے مادری زبان کو علمی و ادبی اعتبار سے وسعت دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں، چنانچہ بچوں کے ادب میں بھی دوسری زبانوں کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو میں بچوں کے ادب کو وسعت بخشنے کی کوشش جاری ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اس موضوع پر اچھا کام کیا ہے، ان اداروں نے زیادہ تر انگریزی اور ہندی ادب سے اردو میں بچوں کی کہانیاں مختلف اہل علم و ادب سے ترجمے کرا کے شائع کی ہیں، جن میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام نمایاں ہیں: نامی انصاری، پروفیسر ظفر احمد نظامی، صفدر حسین، اطہر پرویز، عتیق مظفر پوری، کلیم اللہ، انیس اعظمی، نجمہ نقوی، صفدر نقوی، خسرو متین اور اقبال مہدی وغیرہ جب کہ انفرادی طور پر بچوں کی کہانیوں کا ترجمہ کرنے والوں میں احفاظ الرحمٰن، غلام فرید شیخ، ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی اور عادل اسیر دہلوی کے

نام قابل ذکر ہیں۔

عالمی ادب میں کچھ کتابیں ایسی لافانی اور شاہکار ہوتی ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں ہوتا، ایسی کتابیں اخذ و ترجمے کے واسطے سے پوری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں، بچوں کے ادب میں بھی ایسی کتابیں ہیں جو دوسری زبانوں سے اخذ و ترجمہ کے توسط سے بچوں کے ادب میں شامل کی گئی ہیں اور بچوں کے لیے حد درجہ مفید اور لائق مطالعہ ہیں، ان میں سعدی شیرازی کی بوستان و گلستاں اور فردوسی کی شاہنامہ قابل ذکر ہیں جنھیں بالترتیب عاقلہ شبلی، امیر حسن نورانی، عادل اسیر دہلوی اور آصف نعیم صدیقی نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

بچوں کی تشکیلی عمر کا اگر جائزہ لیا جائے تو پیدائش سے ڈھائی سال کی عمر تک بچے شیرخوارگی کے عہد میں ہوتے ہیں، جسے سمعی و بصری دور بھی کہا جاتا ہے، اس عمر میں بچے صرف دیکھ کر اور سن کر اپنے ماحول سے واقف ہوتے ہیں، والدین، رشتہ دار اور ہمدردوں کی پہچان کرتے ہیں، بنیادی ضرورتوں سے آشنا اور استعمال میں آنے والی چیزوں سے واقف ہوتے ہیں، آس پاس کے جانور اور پرندوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اور ان سے کھیلنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، ان کی فطرت میں چلبلے پن کے علاوہ تجسس بھی ہوتا ہے، وہ ہر انجانی چیز سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ اپنے کھلونے کے کل پرزے تک الگ کر دیتے ہیں، ان کے ذہن میں سوالات جاگتے ہیں، لوریاں انھیں تسکین پہنچاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ان کے تجسس کو بڑھاوا دیتی ہیں، یہ وہ دور ہوتا ہے، جس میں بچوں کے تصویری ادب کے ذریعے جانوروں، چڑیوں، پھلوں، پھولوں وغیرہ کی پہچان کرائی جاسکتی ہے، جن سے انھیں مسرت حاصل ہوتی ہے، اس منزل کے آخری چھ مہینوں میں ان ہی حوالوں کے ذریعے حرف تہجی کی پہچان بھی کرائی جاسکتی ہے، شیرخوارگی کے اس تقلیدی دور کے لیے تصویری ادب ترقی یافتہ ملکوں کی زبان میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے، اردو میں یہ صفر کے برابر ہے، اردو والوں کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ 7

شیرخوارگی کے بعد ماقبل مدرسہ کا دور شروع ہوتا ہے، جو عام طور پر ڈھائی تا پانچ سال کی عمر پر مشتمل ہوتا ہے، یہ دور بچوں کی ذہنی ترقی کا بہت اہم دور ہے، اس عمر میں بچے بتدریج ابتدائی لسانی مہارتیں حاصل کرتے ہیں، نرسری اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں، گویائی کی پختگی کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں انھیں یاد کرائی جاتی ہیں، جن سے ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ بھی ہوتا ہے، اس عمر میں بچے چھوٹی چھوٹی کہانیاں جو چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہوں اور جن میں توضیحی تصویریں بھی دی گئی ہوں، پڑھنا بہت پسند کرتے ہیں۔ 8

چھوٹے بچوں کی اس خواہش کی طرف عبدالواحد سندھی اور مکتبہ جامعہ کے مصنفین نے توجہ دی ہے، عبدالواحد سندھی نے ایسے بچوں کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں لکھی ہیں: ہپو چپو، بندر اور نائی، بی مینڈکی اور کوا، تاک دنادن تاک، چل مرے مٹکے ٹمک ٹم، تارا دھری تارا، اور مکتبہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے اس طرح کی کئی کہانیاں شائع کی ہیں، جیسے: مزہ چکھائیں گے، ننھا فرشتہ اور ننھا جھبرو وغیرہ۔ 9

اسی طرح قومی کونسل اور مکتبہ جامعہ نے ننھے بچوں کے لیے بہت سی باتصویر کہانیاں ترجمہ و تصنیف کرائی ہیں، جن میں پچاس تا اسی فیصد تصاویر ہیں، قومی کونسل نے مختلف مصنفین کی جو باتصویر کتابیں ترجمہ کرائی ہیں، ان میں چند کے نام یہ ہیں: چڑیا اور راجا، سونالی اور دوست، ہاتھی اور پانی کی ٹنکیاں، پسند، اشوک کی پتنگ اور وائی اور بھوت وغیرہ۔ مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع کردہ باتصویر کہانیوں کے نام یہ ہیں: بطخ اور لڑکا، شہزادی، ناگ راجا، چیونٹی، سونے کا پودا، شیر اور بکری، چاند کی بیٹی، بھیڑیے کا گانا، جادو کی ہنڈیا، چالاک بلی، دم کٹی لومڑی اور کوے کا خواب وغیرہ، نیز سرکاری ادارہ راجیو ودیا مشن متحدہ آندھرا پردیش نے ریاست کے اسکولی طلبہ و طالبات میں اردو زبان و ادب سے دل چسپی اور ذوق مطالعہ کو فروغ دینے کے لیے ضلعی سطح پر قائم سرکاری ڈی ایڈ کالج (DIET) کے تعاون سے مندرجہ ذیل باتصویر مواد شائع کر کے ہر اسکول کو روانہ کیا ہے: (1) باتصویر کہانی کتب 75 کتابیں (2) ہندی سے ترجمہ شدہ باتصویر کہانیاں 'شبنم کی بوندیں' 40 کتب (3) باتصویر کہانی کارڈ 100 کارڈ۔

بچوں کے لیے سائنسی کہانیاں بھی مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے توسط سے منظر عام پر آئی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں: آرٹ کی کہانی (سیما پرویز) یہ کیسا بخار ہے؟ (ظفر محمود) کیمیا کی کہانی (سید شہاب الدین دسنوی) انوکھی پہیلی (شمس الاسلام فاروقی) حیوانات کی دل چسپ دنیا (محمد خلیل) پتنگ ایک قدیم سائنسی کھیل (محمد خلیل)۔ مذکورہ کتابوں میں دل چسپ کہانی کے انداز میں سائنسی مضامین کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ دوسری بہت سی کتابوں میں مضامین کا سا انداز اختیار کیا گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں سائنسی کہانیوں کی کمی اور تنگ دامانی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ بچوں کے ادب کے پہلے محقق ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بھی توجہ دلائی ہے:

"ہمارے یہاں جو سائنس فکشن لکھے جارہے ہیں، ان میں سے بیش تر میں جان نظر نہیں آتی اور بچے سائنسی استعداد کی کمی کے سبب اس کے منفی اثرات قبول کررہے ہیں، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ہمارے یہاں سائنسی تجربات تاحال اولین مرحلے میں ہیں، ایسا ماحول دستیاب نہیں ہے کہ سائنس فکشن عمومی دل چسپی کی چیز بن سکے، محض مغربی ادب کی نقالی کرنے سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوگا، خصوصی مہارت رکھنے والے مصنفین کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔" 10

اس عمومی جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عصر حاضر میں بچوں کی کہانیوں کی حالت عمومی اعتبار سے اطمینان بخش ہے، البتہ بچوں کے سائنس فکشن کی طرف ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اگر اس کمی پر جلد سے جلد قابو پالیا جائے تو اردو میں بچوں کی کہانیاں ترقی یافتہ زبانوں کی کہانیوں کے ہم پلہ آسانی سے قرار دی جائیں گی۔

حواشی:

(1) ڈاکٹر سیفی پریمی: حیات اسماعیل 221 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1976

(2) دیکھیے: ادب اطفال ایک مطالعہ: 27از ڈاکٹر بانو سرتاج، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2015

(3) ڈاکٹر خوشحال زیدی: اردو میں بچوں کا ادب: 144 دار بزم خضر راہ کانپور 1989

(4) حوالۂ سابق، صفحہ 45

(5) ڈاکٹر بانو سرتاج: ادب اطفال ایک مطالعہ 28-27

(6) بچوں کا ادب اور اخلاق ایک تجزیہ: 116از ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2015

(7) بچوں کے ادب کی تاریخ 67-66از ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2016

(8) حوالۂ سابق، صفحہ 68-67

(9) بچوں کا ادب اور اخلاق ایک تجزیہ 173

(10) ڈاکٹر خوشحال زیدی۔ بچوں کا ادب اکیسویں صدی کی دہلیز پر 66، ادارہ بزم خضر راہ نئی دہلی 2007

Dr. Syed Asrarul Haque Sabeeli
Asst. Prof & Head Dept of Urdu
Govt Digree PG College
Siddipet - 502103 (Telangana)

محمد زبیر

پروفیسر ظہور الدین
ایک ہمہ جہت شخصیت

سال 2019 کی شروعات کے کوئی چار دن پہلے یعنی 27 دسمبر 2018 کو اردو دنیا کی ایک عہد ساز شخصیت پروفیسر حامدی کاشمیری کے سانحۂ ارتحال کا دکھ ابھی تازہ ہی تھا کہ 2 فروری 2019 کو پروفیسر ظہور الدین نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر اردو دنیا کو بالعموم اور ریاست جموں و کشمیر کو بالخصوص مغموم کر دیا۔ وہ بیک وقت ایک نقاد، محقق، ڈرامہ نگار، عمدہ صحافی، افسانہ نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک بھی تھے۔ دراز قد، گورا بدن، پتلی ناک، کشادہ پیشانی، کلین شیو، اور متانت و سنجیدگی ٹپکاتے گول چہرے والے پروفیسر ظہور الدین کی شخصیت بڑی پرکشش اور جاذب نظر تھی۔ خالقِ کائنات نے انھیں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ نیک سیرتی سے بھی نوازا تھا۔ وقت کے پابند، با اصول و با کردار اور حلیم اور بردبار طبیعت کے مالک تھے۔

پروفیسر ظہور الدین کی ولادت 27 مئی 1942 کو تحصیل رام نگر کے علاقے بسنت گڑھ کے ایک گاؤں کھنیڈ میں ہوئی۔ ان کے والد خواجہ خضر الدین کا نوکری کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر تبادلہ ہوتا رہا اس لیے پروفیسر ظہور الدین کا بچپن مختلف جگہوں پر گزرا اور مختلف اسکولوں میں انہوں نے تعلیم بھی حاصل کی۔

ان کی ابتدائی تعلیم اور پرورش میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ 1947 میں ان کی تعلیم کا آغاز گاؤں کھنیڈ کے ایک پرائمری اسکول سے ہوا۔ خاندان کے لوگ پڑھے لکھے اور ذی شعور تھے اس لیے اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو گھریلو زندگی کی تربیت میں آداب و اخلاق و اطوار بھی سکھائے جاتے رہے۔

والد صاحب ایس ایچ او کی حیثیت سے تھانہ رام نگر میں تعینات ہوئے اور اپنے خاندان کو بھی ساتھ لے آئے۔ یہاں دوسری جماعت میں موصوف تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ والد کا تبادلہ بسوہلی ہو گیا۔ چنانچہ دوسری سے چوتھی جماعت تک کی تعلیم انھوں نے بسوہلی سے حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ پرائمری اسکول امپھلہ جموں سے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد چھٹی سے دسویں جماعت تک کی تعلیم رام نگر میں حاصل کی۔ ظہور صاحب 1958 میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جموں آ گئے اور گاندھی میموریل آرٹس کالج (جو آج مولانا آزاد میموریل کالج کے نام سے جانا جاتا ہے) میں انٹرمیڈیٹ کے سال اول میں داخل ہوئے۔ 1960 میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے اسی کالج میں بی۔ اے سال اول میں داخلہ لیا۔ ابھی بی اے فائنل میں ہی زیرِ تعلیم تھے کہ محکمہ پولیس میں ان کا تقرر بہ حیثیت اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہو گیا۔ ملازمت ملنے کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور کشمیر یونیورسٹی سے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ 1965 میں موصوف نے پولیس کی ملازمت چھوڑ کر جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو (جو اسی سال قائم ہوا تھا) میں ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے اردو کی جماعت میں موصوف واحد طالب علم تھے۔ حالانکہ شعبے کے قیام کے بعد وہاں داخلہ لینے والا پہلا شخص وی پی سوری تھا۔ لیکن داخلہ لینے کے کچھ ہی عرصے بعد وی پی سوری کا جموں یونی ورسٹی میں ہی بہ حیثیت اسسٹنٹ رجسٹرار تقرر ہو گیا تھا۔ اس طرح پروفیسر موصوف اکیلے طالب علم رہ گئے تھے اور پروفیسر گیان چند جین واحد استاد اور صدر شعبہ تھے۔ 1967 میں انھوں نے ایم اے اردو کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد جموں یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں داخلہ لے لیا اور 1969 میں ایم اے انگریزی کی ڈگری بھی مکمل کر لی۔

موصوف چونکہ اردو اور انگریزی دونوں موضوعات میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کر چکے تھے اور دونوں زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے تھے اس لیے اب ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کون سے موضوع میں ڈاکٹریٹ کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے دانشوروں کے صلاح مشوروں کے ساتھ ساتھ اپنی ذہانت کا خوب استعمال کیا۔ انگریزی داں طبقے کی طرف سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کرنے کی ترغیب ملی جب کہ اردو داں طبقے نے انھیں اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے استاد پروفیسر گیان چند جین سے ملے انہوں نے بھی اردو میں ہی پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی ساتھ شعبہ اردو میں خیر مقدم بھی کیا۔ استاد کی بات کو اپنے مزاج کے موافق مانتے اور جانتے ہوئے بالآخر انھوں نے اردو میں ہی پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کیا۔

پروفیسر ظہور الدین کا پی ایچ ڈی کے لیے موضوع پہلے اردو کی سوانحی ڈکشنری منتخب ہوا تھا لیکن بعد میں بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز کی میٹنگ میں یہ موضوع تبدیل کر کے 'بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات' طے پایا۔ چوں کہ موصوف انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے تھے اس لیے وہ کوئی

ایسا موضوع رکھنا چاہتے تھے جس میں دونوں زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکے۔ چنانچہ مذکورہ موضوع آپ کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ 1972 میں ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی اور اس طرح آپ جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے پہلے ڈاکٹر آف فلاسفی ہوئے۔ ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی اپنے ایک مضمون میں موصوف کے شعبۂ اردو کے پہلے پی ایچ ڈی ہونے کے متعلق رقم طراز ہیں:

''شعبۂ اردو سے پی ایچ ڈی کے لیے جمع کیا جانے والا پہلا مقالہ پروفیسر ظہور الدین نے لکھا، جس کا عنوان ہے 'بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات' جو پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں لکھا گیا۔ اس پر 1972 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔''

(پروفیسر ظہور الدین اور شعبۂ اردو، ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی، مشمولہ دریا بہ دریا جو بہ جو، ص 79)

ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی کے تعاون سے 1978 میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

1972 میں جب پروفیسر موصوف نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی اس کے چند ماہ بعد وہ جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس وقت پروفیسر گیان چند جین شعبہ کے صدر تھے جو موصوف کی قابلیت اور صلاحیت کو ان کی طالب علمی کے دور سے ہی پہچان گئے تھے۔ موصوف ایم اے میں پروفیسر گیان چند جین کے شاگرد رہے اور آگے چل کر پی ایچ ڈی بھی ان ہی کی زیرِ نگرانی مکمل کی۔ اپنے استاد اور نگراں کی شفقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

''یوں تو تعلیم کے طویل دور میں کئی اساتذہ سے روشنی حاصل کی لیکن میرے مستقبل کو بنانے میں سب سے زیادہ رول جس استاد نے ادا کیا وہ ڈاکٹر گیان چند جین ہیں۔ ان ہی کی قیادت میں، میں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور ان ہی کی کوششوں سے میرا تقرر شعبۂ اردو میں ہوا۔ اب بھی جب کہ میں اسی عہدے پر فائز ہوں جس پر میرے استاد فائز تھے، میں ان سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا رہتا ہوں۔''

(پروفیسر ظہور الدین سے ایک ملاقات، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی، مشمولہ دریا بہ دریا جو بہ جو، ص 171)

پروفیسر ظہور الدین تعلیم کے دوران ہی زبان و ادب کے حوالے سے ذی شعور اور پڑھے لکھے طبقے میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ لیکچرار بننے کے بعد ان کی ترقی کی رفتار کو اور بھی پر لگ گئے۔ وہ ریڈر، پروفیسر اور پھر صدر شعبہ بنے۔ پروفیسر ظہور الدین کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے دور سے ہوا۔ جب انھوں نے ساحر کی شاعری بالخصوص 'پرچھائیاں' کا مطالعہ کیا تو خود بھی نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ گویا ساحر کے زیرِ اثر انھوں نے نظمیں لکھیں جو اس وقت جموں کے مشہور اخبار 'سندیش' میں گمنام شائع ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے افسانے لکھنے شروع کیے اور پہلی کہانی 1961 کے اوائل میں 'تلافی' کے نام سے لکھی۔ 1965 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'تلافی' کے نام سے ہی شائع ہوا۔ 1976 میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'تفکرات' چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد 1976 میں 'محروم کی شاعری' 1978 میں طویل افسانہ 'اوڈی سوز'، 1978 میں 'بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات'، 1981 میں افسانوی مجموعہ 'کینی بلز'، 1984 میں 'حقیقت نگاری اور اردو ڈرامہ' 1985 میں 'ڈیولپمنٹ آف اردو لینگویج اینڈ لٹریچر ان جموں ریجن' 1988 میں 'جدید اردو ڈرامہ' 1991 میں 'تعلیل و تاویل' 1993 میں 'ارمغانِ آزاد' (مرتب، اس کتاب میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد پر لکھے گئے تنقیدی اور تحقیقی مقالے شامل ہیں) 1999 میں 'کہانی کا ارتقا' چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد 'جموں و کشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے لیے بارہ نصابی مشترکہ تالیفات' پر کام کیا، 2005 میں جموں و کشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے لیے ماحولیات کی کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی۔ 2006 میں 'جدید ادبی و تنقیدی نظریات' شائع ہوئی۔ 2006 میں ہی 'فن ترجمہ نگاری'، 2006 میں 'فن صحافت''، 2007 میں 'تنقیدی مباحث و تجزیے'، 2009 میں تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'نئے پرانے مضامین' کے نام سے شائع ہوا۔

یو جی سی کے ایک پروجیکٹ کے لیے انہوں نے ڈرامے کی تاریخ پر پینتیس لیکچر لکھ کر دیے۔

علاوہ ازیں پروفیسر موصوف کے بیس کے قریب افسانے، سو سے زائد غزلیں اور نظمیں اور چھ ڈرامے غیر مطبوعہ ہیں۔ معاصر لسانی اور ادبی تناظر، لگا رہا ہوں مضامین کا جو انبار، (دو جلدوں میں، تحقیق و تنقید) منٹو کی تنقید اور علامہ اقبال پر انگریزی میں کتاب بنام Reflections on Iqbal غیر مطبوعہ ہیں۔ اردو زبان کی صنف وار تاریخ لکھنے کا قصد رکھتے تھے جس کا ذکر انہوں نے راقم الحروف سے کیا تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ قصد بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

پروفیسر ظہور الدین کو ان کی علمی و ادبی کاوشوں پر مختلف انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کی تصانیف تفکرات، محروم کی شاعری، حقیقت نگاری اور اردو ڈرامہ، کینی بلز، جدید اردو ڈرامہ اور تعلیل و تاویل پر بالترتیب 1976، 1977، 1985، 1986، 1988، اور 1990 میں یوپی اردو اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں سماج کے تئیں ان کی گوناگوں خدمات پر مختلف محکموں اور انجمنوں نے تقریباً پندرہ سے زائد اعزازات سے نوازا۔

مذکورہ بالا تصانیف موصوف کے وہ معرکہ آرا کارنامے ہیں جن کے ذریعے ان کی تنقیدی اور تحقیقی کاوشیں اجاگر ہوئی ہیں۔ مغربی اور مشرقی اصول نقد سے وہ خوب واقف تھے۔ انگریزی ادبیات اور اصول نقد کے گہرے مطالعے کی وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً تنقیدی نظریات میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی مختلف کتب سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مختلف تنقیدی دبستانوں سے اکتساب فیض کیا لیکن کسی

خاص دبستان کے رنگ میں رنگنے سے ہمیشہ باز رہے۔ تاہم ادب میں مقصدیت کے وہ قائل ہیں اور بغیر مقصد کے کسی فن پارے کے وجود میں آنے کی نفی کرتے ہیں۔ وہ ایک انٹرویو کے دوران بتاتے ہیں:

''میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے وہ کسی تحریک سے وابستہ ہوکر نہیں لکھا، میں مزاجاً ترقی پسند ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ انسان اس کائنات میں قادر مطلق کی سب سے بڑی تخلیق ہے۔ اسی لیے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ انسان کی بقا و ترقی ہی سے یہ دنیا حسین بن سکتی ہے، چنانچہ میں نے ہمیشہ عالم انسانیت ہی کے تحفظ کے لیے اپنے قلم کو استعمال کیا ہے کسی مذہب طبقے یا علاقے کی اگر بات ہوتی بھی ہے تو اس کا مطلب بھی انسانی فلاح و بہبودی ہے۔''

(پروفیسر ظہور الدین سے ایک ملاقات، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی، دریا بہ دریا جو بہ جو، ص 177)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کوئی فن کار اس وقت تک کسی فن پارے کی تخلیق نہیں کر سکتا جب تک اس کے ذہن میں اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ انہوں نے دنیا کے قدیم ادب میں جھانک کر یہ بات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیا ادب بغیر کسی مقصد کے تخلیق ہوا ہے یا نہیں۔ دنیا

کے قدیم ادب اور ادیبوں کو پڑھ کر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہر دور کے ادب کا کوئی نا کوئی مقصد ضرور رہا ہے۔ یونان، روم، فرانس، اطالوی، روسی جرمنی، فارسی، ہندی، اور اردو ادب کی غائیت و غرض کی نشاندہی کر کے وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کا ہر ادب کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہی وجود میں آیا ہے۔ اس لیے وہ ادب کی عمارت کے لیے مقصد کو بنیادی چیز تصور کرتے ہیں اور اُن فن کاروں کی رائے کی نفی کرتے ہیں جو اپنے فن پاروں کو مقصد سے عاری ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ادب کی عمارت مقصد کی بنیاد کے بغیر کھڑی نہیں کی جا سکتی چاہے وہ بنیاد اخلاقی و تعمیری ہو یا محض جمالیاتی۔ جو ادیب اپنے فن پاروں کے مقصد سے عاری ہونے کا دعوی کرتے ہیں وہ خود کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ فن کار اپنے ذہن کو خالی تصور کر کے چاہے کیسے ہی ٹیڑھے ترچھے خاکے کیوں نہ کھینچتا رہے ان سے اس وقت تک کوئی صورت پیدا نہ ہو پائے گی جب تک ایسا کرنے کے لیے شعور کا سہارا نہ لیا جائے۔ شعور کی چنگاری ہی مقصد کا الاؤ روشن کرتی ہے۔''

(پروفیسر ظہور الدین، جدید ادبی و تنقیدی نظریات، ص 12)

پروفیسر ظہور الدین نے جہاں علمی و ادبی خدمات میں اپنا الگ مقام بنایا ہے وہیں بحیثیت منتظم بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ 1994 میں صدر شعبہ بننے کے بعد ان کی انتظامی صلاحیت ہر کسی پر عیاں ہو گئی۔ شعبے کے نظم و ضبط اور ترقی و ترویج کے چرچے ہونے لگے۔ ہر کام منظم طریقے سے انجام پانے لگا۔ پروفیسر موصوف نے شعبہ اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے بہت محنت، لگن اور تندہی سے کام کیا۔ انھوں نے بڑی جدوجہد کے بعد شعبہ اردو میں ایم اے اردو پروفیشنل نام سے ایک نیا کورس شروع کروایا جو اردو کے طلبا کے لیے نہایت ہی مفید ہے۔ 1996 کو ان کا تقرر ناظم امتحان کے طور پر ہوا۔ گویا صدر شعبہ کے ساتھ ساتھ وہ ناظم امتحانات بھی رہے۔ 18 اکتوبر 1996 سے لے کر 31 جولائی 1998 تک انھوں نے ناظم امتحانات یعنی (controller of examaminations) کی خدمات انجام دیں۔ 1998 میں موصوف جموں یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام رتن شرما نے حکم نامہ جاری کیا جس کے تحت یکم اگست 1998 سے ان کو یونی ورسٹی آف جموں کا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ اس طرح اکتوبر 1998 سے دسمبر 2001 تک انھوں نے جموں یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں وہ درج ذیل عہدوں پر بھی فائز رہے۔

سکریٹری جموں یونیورسٹی کونسل، معتمد جموں یونیورسٹی سنڈیکیٹ، معتمد اکیڈمک کونسل جموں یونیورسٹی، معتمد فائنانس کمیٹی جموں یونیورسٹی، ڈائریکٹر اسپورٹس جموں یونیورسٹی، چیف ایڈیٹر جموں یونیورسٹی نیوز بلٹن، اردو ریسرچ جرنل 'تسلسل' کے مدیر اعلیٰ، کل ہند کالج و یونیورسٹی

پروفیسر ظہورالدین نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزار دی۔زندگی کی چھیتر عارضی بہاریں دیکھ کر 2فروری 2019 کی صبح طلوع آفتاب کے وقت اردو دنیا کا یہ آفتاب اپنے نشیمن بمقام ملک مارکیٹ جموں میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔اسی دن عصر کی نماز کے فوراً بعد انہیں ریہاڑی (جموں) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اردو ٹیچر ایسوی ایشن کے معتمد اعلیٰ، انجمن ترقی اردو کی شاخ جموں کے معتمدِ اعلیٰ، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں کے سرپرستِ اعلیٰ، جموں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی جموں کے چیئر مین، بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) جموں یونیورسٹی کے کنوینر، مسلم کوآرڈینیشن کمیٹی کے صدر، آل انڈیا کالج اور یونیورسٹی اردو ٹیچرس ایسوی ایشن کے صدر رہے۔

من حیث المجموع پروفیسر ظہور الدین ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اچھے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اچھے منتظم بھی تھے۔ خوبصورت، نیک سیرت، با اخلاق، باکردار، سچے اور ایماندار شخص تھے۔ جموں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی ان کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''ظہور الدین صاحب ایک سنجیدہ، متین شخصیت کے مالک ہیں جیسا کہ ایک صاحب علم اور اسکالر ہونا چاہیے۔ کم گو لیکن خوش مذاق، سنجیدہ لیکن دلنواز، کم سخن لیکن فعال غرض کہ مختلف خوبیوں کی حسین آمیزش نے انھیں ایک مکمل انسان اور اس سے زیادہ بہتر اسکالر بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ پوری اردو دنیا میں ان کی شخصیت عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔''

(علی احمد فاطمی، مشمولہ دریا بہ دریا جو بہ جو، ص 145)

پروفیسر ظہور الدین نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزار دی۔ زندگی کی چھیتر عارضی بہاریں دیکھ کر 2 فروری 2019 کی صبح طلوع آفتاب کے وقت اردو دنیا کا یہ آفتاب اپنے نشیمن بمقام ملک مارکیٹ جموں میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اسی دن عصر کی نماز کے فوراً بعد انھیں ریہاڑی (جموں) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

■

Mohammad Zubair
MH-K. Room No. 321, South campus
University Of Hyderabad, 500046 (Telangana)
Contact:9469864219,6005137633.

شخصیت

شان الحق حقی

محمد فرحان دیوان

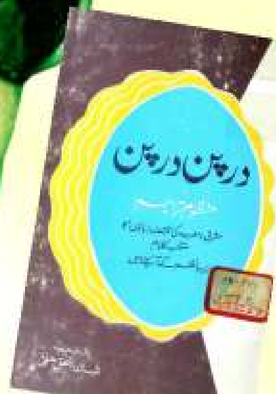

> **کسی بھی ادیب ومحقق کی شخصیت کومقبول ومعروف کرانے میں اس کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نگارشات کا کلیدی کردار ہوتا ہے جن سے چشم پوشی روا نہیں کیونکہ انہی نگارشات کے باعث کوئی شخص اعتبار واستناد کے درجے کو پہنچتا ہے۔**

ماہر لسانیات، لغت نویس اور معروف شاعر وادیب شان الحق حقی کا شمار اردو ادب کے دانشوروں میں ہوتا ہے۔ ہندوپاک کے اردو ادب کا روشن ستارہ شان الحق حقی نے جس طرح سے ادب کی خدمات انجام دی ہیں اس کے لیے اردو ادب ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک شان الحق حقی نہ صرف یہ کہ اعلیٰ پائے کے شاعر، مترجم، نقاد، افسانہ نگار، خاکہ نویس اور صحافی تھے بلکہ ماہر لسانیات اور لغت نویس کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل ہیں علاوہ ازیں انھوں نے پہیلیاں اور کہمکر نیاں وغیرہ کہہ کر اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔

شان الحق حقی کی علمی وادبی خدمات کثیر جہتی ہیں۔ انھوں نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اس کے بعد تنقید وتحقیق، لغات، افسانے، خاکے، پہیلیاں و کہمکر نیاں وغیرہ کے ساتھ ساتھ مختلف زبان وادب کے دانشوروں کی اعلیٰ تصانیف کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ غرض یہ کہ کوئی شعبۂ ادب ایسا نہیں جس میں شان الحق حقی نے اپنے علم اور اپنی ذہانت کے نقوش نہ چھوڑے ہوں مثلاً جب انھوں نے شاعری کی تو تقریباً ہر صنف میں اظہار خیال کیا یہاں تک کہ بعض ایسی اصناف کو بھی ذریعۂ اظہار بنایا جو مدتوں پہلے پردۂ خفا میں تھیں۔ تراجم کی طرف آئے تو سیکڑوں متفرق ترجموں کے ساتھ ساتھ ضخیم کتابوں کے منظوم ومنثور تراجم اس شان سے کیے کہ ان میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی۔ شان الحق حقی کے تراجم کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے ترجمے کے مآخذ کسی ایک زبان یا علاقے تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے مغرب ومشرق، شمال وجنوب اور مقامی زبانوں کی اعلیٰ کتابوں کے ترجمے کرکے اردو ادب کے دامن میں وسعت وکشادگی پیدا کی ہے۔

کسی بھی ادیب ومحقق کی شخصیت کومقبول ومعروف کرانے میں اس کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نگارشات کا کلیدی کردار ہوتا ہے جن سے چشم پوشی روا نہیں کیونکہ انہی نگارشات کے باعث کوئی شخص اعتبار واستناد کے درجے کو پہنچتا ہے۔

شان الحق حقی کی پیدائش 15 ستمبر 1917 کو دہلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان میں ہوئی۔ شان الحق حقی کے پردادا مفتی اکرام الدین، دادا خان بہادر مولوی انوار الحق کا شمار دہلی کے چند معروف علماء میں ہوتا ہے۔ دادا مولوی انوار الحق 'سرسید' کے دوست اور ان کی تحریک کے حامی تھے۔ شان الحق حقی کے والد محترم مولوی احتشام الدین اپنے وقت کے مشہور ادیب اور لغت نویس تھے انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ 'لغت کبیر' مولوی عبدالحق کی نگرانی میں مکمل کیا۔

شان الحق حقی نے اپنے اجداد کی طرح ہی ادب کی خدمات انجام دیں، وراثت میں ملی علم وادب کی دولت کو مزید ترقی دے کر بین الاقوامی سطح پر خاندان کا نام روشن کیا۔ شان الحق حقی کی والدہ سعیدی بیگم، ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے ڈاکٹر مشرف کی بیٹی تھیں اور ڈاکٹر مشرف ڈپٹی نذیر احمد کی صاحبزادی 'صغریٰ بیگم' کے فرزند تھے مجموعی طور پر کہا جائے تو شان الحق حقی کا خاندان علم وادب کا گہوارا تھا جس نے ادب کی خوب تر خدمات انجام دیں۔ شان الحق حقی نے 1934 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرے میں انھوں نے اردو ادب کے معروف شاعر مرزا غالب کی زمین میں غزل کہہ کر خوب داد وتحسین لی۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں ؎

آمیزشِ کرم ہے کس کی نگاہ میں
ایسے میں ایک لغزشِ بے جا کرے کوئی

شان الحق حقی کی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1940 میں ہوا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور سماجی شعور رکھنے والا ہر شاعر وادیب زور شور سے ترقی پسند

تحریک کی نمائندگی کر رہا تھا۔شان الحق حقی کی شاعری پر بھی اس کے کچھ اثرات نظر آتے ہیں لیکن پورے طور پر وہ اس تحریک سے وابستہ نہیں رہے کیوں کہ شان الحق حقی اپنے اجداد کی طرح ادب کی خدمت منفرد انداز میں کرنا چاہتے تھے جو انھوں نے بخوبی انجام بھی دی۔ان کے چار شعری مجموعے تار پیراہن، حرف دل رس، دل کی زبان اور'پھول کھلے ہیں رنگ برنگے' منظر عام پر آئے۔ سبھی مجموعے ان کی شخصیت، قلم کی وسعت، گہرے مشاہدے کی جھلک اور ان کے عہد کی شاعری کا منفرد انداز میں ذائقہ دیتے ہیں۔

تقسیم ہند اور پاکستان ہجرت نے شان الحق حقی کی شاعری کو بے حد متاثر کیا۔ان واقعات و حادثات اور قتل و غارتگری کو انھوں نے اپنی چشم نم سے دیکھا تھا۔وہ جس کرب کو دل میں لیے وطن سے رخصت ہوئے اُس کا بے ساختہ اظہار انھوں نے لاہور پہنچ کر کچھ اس طرح کیا تھا:

اُس کوئے آشنا سے اٹھے قدم تو اٹھے
کن راحتوں نے روکا کن بازوؤں نے گھیرا

شان الحق حقی کو غزل سے خاص دلچسپی تھی وہ شاعری میں حسن بیان کے قائل تھے۔الفاظ کے بے تکے جوڑ توڑ اور محض قافیہ پیمائی کی وہ تائید نہیں کرتے تھے اور نہ ہی انھیں کلام میں ابہام وایہام گوئی پسند تھی۔شاعری میں معنی آفرینی، تاثیر اور حیرت انگیزی کو ضروری خیال کرتے تھے۔شان الحق حقی کے تنقیدی مضامین اور ان کی شاعری کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ گروہ بندی کی بنیاد پر ایسی شاعری کی مدح سرائی سے بھی انکار کرتے نظر آتے ہیں جو فکری جہت یا معنویت سے عاری ہو۔وہ جدیدیت کی انتہا پسندی، تنہائی اور حصارِ ذات کے بھی بے جا قائل نظر نہیں آتے بقول ان کے'اپنی ذات سے ماورا کچھ بھی نہیں' شان الحق حقی غزل کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں غزل کا اس لیے قائل ہوں کہ اس نے محبت کے تصور کو زندہ رکھا ہے۔یہ ہر موضوع پر محبت کی اصطلاحوں میں بات کرتی ہے جو اس کا بنیادی حوالہ ہے بلکہ شاعری کا اصل جواز بھی محبت ہے مجھے حیرت ہے کہ بعض لوگ اپنی شاعری سے تغزل کو خارج کرکے اس پر فخر کرتے ہیں۔محبت ساری دنیا کی شاعری کا مشترک دھرم ہے اور شاعری کی شناخت ہے۔''[1]

شان الحق حقی کی شاعری میں فکری عناصر ابتدا ہی سے موجود ہیں اسی وجہ سے ان کی شاعری میں حسن وعشق کے ساتھ فکر اور نصیحتوں کی کثرت نظر آتی ہے۔مناظر قدرت، قوم کے حالات، جدوجہد کرنے کی تلقین اور کلاسیکی شاعروں کی تخلیقی شان کے مطابق ان کی شخصیت پر غزلیں کہنا ان کو بخوبی آتا تھا۔جس کے سبب انھوں نے ولی، میر اور سودا وغیرہ کے لیے غزلیں کہہ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔مثالیں ملاحظہ کریں۔

نذر ولی کے عنوان سے لکھتے ہیں

جس نے اک خس کے لیے صحرا کو چھانا ہوئے گا
کون ہوگا کوئی ہم سا ہی دوانہ ہوئے گا
تم کو دل کی راہ سے خلوت میں آنا ہوئے گا
چشم وا میں تو بجز سارا زمانہ ہوئے گا
اور نکلتے اک طرف کھلتا نہیں اس تل کا بھید
تم کہو حقی بھلا کچھ تم نے جانا ہوئے گا

نذر میر میں لکھتے ہیں

دل اور ہی بندھن میں وہ عہدِ وفا چاہیے
پہلو جو بچا لوں تو دامن نہ بچا چاہیے
ہستی میں حقیقت کا کیا کھوج لگا چاہیے
کچھ دیر میں ہستی خود افسانہ ہوا چاہیے

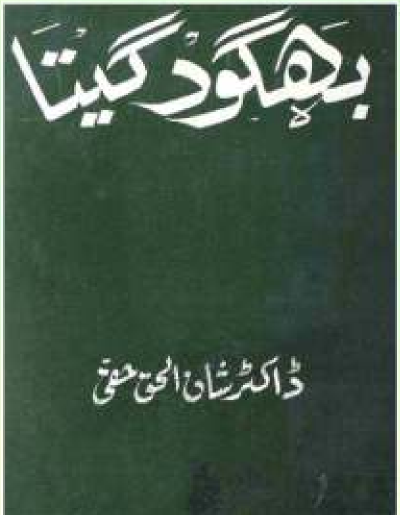

شان الحق حقی کی شاعری روایت وجدت کا حسین امتزاج ہے۔ان کی شاعری ایک طرف داخلی کیفیت کی ترجمان ہے تو دوسری جانب زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ۔ شان الحق حقی نے بہت ہی خوبی سے غزل کے کلاسیکی انداز اور اس کی مثبت اور اعلیٰ شعری روایات کو دور جدید کے موضوعاتی سروکار اور تخلیقی تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اپنی شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔بقول احمد ہمدانی

''حقی صاحب زندگی کے رسیا ہیں۔وہ زندگی کو حسن، خیر وانبساط سے ہمکنار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اپنی اس خواہش کے خلاف وہ جب زندگی کو نڈھال اور ملول پاتے ہیں تو گہری فکر میں ڈوب جاتے ہیں یہ گہری فکر ان کے احساس کی صورت گری کرتی ہے جو آخر کار لفظوں میں اپنا اظہار کرتی ہے۔''[2]

ادب میں ترجمہ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں کیوں کہ اس سے مختلف قوموں کے خیالات، افکار و نظریات، رسم و رواج اور ادب تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ترجمہ کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے اس سلسلے میں درپیش مسائل ومشکلات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور خصوصی طور پر منظوم ترجمہ تو بہت ہی مشکل عمل ہے۔شان الحق حقی تراجم کے سلسلے میں عائد شرطوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''جس طرح تخلیق میں فکری آزادی کے ساتھ ساتھ کچھ حدود بھی عائد ہوتی ہیں مثلاً قواعد ومحاورے کی بنیادی پابندی (یا آرٹ میں مخصوص میڈیم کی حدود) اور پھر وزن وقافیہ کی پیروی۔اسی طرح ترجمے میں یہ قید بھی موجود رہتی ہے کہ اصل سے انحراف نہ ہو اور یہ بہت کڑی شرط ہے۔''[3]

شان الحق حقی نے منظوم ومنثور تراجم کے اعلیٰ نمونے پیش کیے بلکہ ان تراجم میں تخلیقی شان پیدا کی ہے۔شان الحق حقی کے قلم سے کاغذ پر بکھرے ہوئے موتیوں کی شکل میں عمدہ ترجمے ہمارے سامنے آتے ہیں۔انھوں نے مختلف زبانوں کے شاہکار ادب کا ترجمہ کرکے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔شان الحق حقی نے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی تخلیقات و تصنیفات کے منظوم ومنثور ترجمے کیے ہیں۔شان الحق حقی نے منظوم تراجم میں سب سے پہلے بنگالی شاعر' قاضی نذرالاسلام' کی نظموں کا ترجمہ'صورِ اسرافیل' کے عنوان سے کیا۔اس کے بعد عالمی ادب کی مختلف زبانوں کی ایک سو پچیس نظموں کا ترجمہ'درپن درپن' کے نام سے شائع کیا۔ساتھ ہی مغربی ادب کے عظیم فنکار'ولیم شیکسپیئر' کے طویل لافانی ڈرامہ'انطونی اینڈ کلوپطرہ' کا ترجمہ'قہرِ عشق' کے عنوان سے کیا۔منظوم تراجم کی آخری کڑی میں ہندو مذہب کی اہم کتاب'بھگود گیتا' کا ترجمہ کرکے اردو ادب میں اضافے کا کام کیا ہے۔

منظوم تراجم کے بعد شان الحق حقی نے نثر میں پہلا ترجمہ'آچاریہ کوٹلیہ چانکیہ' کے'ارتھ شاستر' کا کیا۔اس کے بعد انگریزی ناول نگار جیک شائفر (Jack Schaefer) کے لافانی ناول'شین' (Shane) کا ترجمہ 'انجان راہی' کے عنوان سے کیا۔نثر میں شان الحق حقی نے آخری ترجمہ Third World Foundation 'تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن' کے لیے'تیسری دنیا: وسائل ومسائل' کے

شخصیت

عنوان کے تحت کیا۔

صور اسرافیل، درپن درپن، قہر عشق اور 'بھگود گیتا' زبان و بیان، ماحول، تہذیب، تحریر اور کہیں نہ کہیں صنف کے اعتبار سے بھی مختلف نوعیت کی کتابیں تھیں مثلاً ''صور اسرافیل'' قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کا مجموعہ ہے، 'درپن درپن' خاص طور سے اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہ کسی ایک زبان یا علاقے کی شاعری کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ عالمی ادب کی مختلف زبانوں کا ترجمہ کی شکل میں اردو انتخاب ہے۔ جس میں عربی، فارسی، ہندی، سندھی، پنجابی، جرمن، بنگالی، ترکی، پشتو، بلوچ، انگریزی اور ہسپانوی وغیرہ زبانوں کے عمدہ کلام کو شان الحق حقی نے ترجمہ کیا ہے۔ 'قہر عشق' شان الحق حقی نے مغرب کے معروف شاعر، فکشن نگار، اداکار، ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کے لافانی ڈرامہ 'انطونی اینڈ کلوپطرہ' کا مثنوی کی ہیئت میں کیا گیا ترجمہ ہے، جس کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔

شان الحق حقی کے منظوم تراجم میں 'بھگود گیتا' اہم مقام رکھتی ہے کیونکہ یہ قدیم سنسکرت میں لکھی گئی لافانی تصنیف ہے جسے شان الحق حقی نے اردو میں اس طرح ترجمہ کیا کہ اس کی طرز اور اس کے اسلوب کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ بھگود گیتا کے چند شعر اردو ترجمہ کی شکل میں ملاحظہ کیجیے جس میں شری کرشن جنگ کے درمیان ارجن کو کچھ نصیحتیں کر رہے ہیں:

کرو وہ کام حاصل جس سے ہو وشنو کی خوشنودی
بکھیڑوں سے زمانے کے نہ حاصل ہوگی بہبودی
یہ نامردی تجھے پھبتی نہیں اے جائے پرتھا کے
کہاں کی بُزدلی اُٹھ بیٹھ میداں مارنے والے

جس طرح شان الحق حقی نے اردو کو مختلف زبان و ادب کا بیش قیمتی سرمایا منظوم تراجم کی شکل میں عنایت کیا ہے اسی طرح انھوں نے نثر میں بھی اعلیٰ تصنیفات کو اردو میں منتقل کر کے اردو کا دامن کشادہ کیا ہے۔ نثری تراجم میں سب سے پہلے 'اچاریہ چانکیہ کوٹلیہ' کی عالمی شہرت یافتہ تصنیف 'ارتھ شاستر' کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ارتھ شاستر جیسی لافانی تصنیف کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیوں کہ یہ جتنی ضخیم ہے اتنی ہی زبان و بیان اور موضوع و اسلوب کے اعتبار سے پیچیدہ بھی۔ اردو نثر میں شان الحق حقی نے اس کے بعد 'انجان راہی' اور 'تیسری دنیا' کے نام سے دو ترجمے کیے۔ 'انجان راہی' امریکی ناول نگار جیک شائفر' کا شاہکار ناول 'شین' کا ترجمہ ہے۔ ناول جس طرح سے جیک شائفر نے لکھا تھا بالکل اسی انداز میں شان الحق حقی نے اسے اردو ترجمہ کی شکل عطا کی ہے۔ زبان و بیان اور مکالمے ضرور اردو میں ہیں لیکن تھیم، پلاٹ، قصہ در قصہ کہانی اور ناول کی فضا اصل کی روح میں سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔

'تیسری دنیا: وسائل و مسائل' Translation of Essays on Politics and Economy کا ترجمہ ہے جسے 'تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن' نے اپنے سہ ماہی انگریزی جریدے 'تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن' میں سلسلہ وار شائع کیا تھا۔ شان الحق حقی نے اس رسالے کی پہلی جلد کے چند مضامین کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جسے الطاف گوہر نے مرتب کر کے تیسری دنیا کے ہی عنوان سے شائع کیا۔ تیسری دنیا میں چند انٹرویو، مضمون نگار حضرات کا تعارف اور تقریباً 14 مضامین شامل ہیں جن میں جدید تعلیم کے مسائل و حل، شمال و جنوب کے مذاکرات پر مشتمل دو انٹرویو، جنوبی ایشیا کی معاشی ترقی اور باہمی تعاون، مغربی جمہوریت اور تیسری دنیا کے نظام وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

اردو زبان کے رموز پر شان الحق حقی کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ لسانی موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین نہ صرف یہ کہ اہمیت کے حامل ہیں بلکہ دیر پا اثر مرتب کرنے کے وصف سے مزین بھی ہیں. حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے سخت اور خشک موضوع کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر مقالہ پڑھنے میں خاص دلچسپی رکھتا ہے. شان الحق حقی کے نزدیک زبان وسیلہ آشتی بھی ہے اور دوریوں کو نزدیکیوں میں بدلنے کا عمل بھی.اس سے مختلف افراد, متضاد قومیں اور ان کی تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں.

شان الحق حقی کے تنقیدی مضامین کے متعلق اگر بات کی جائے تو انھوں نے غیر جانبدار ناقد ہونے کا پورا حق ادا کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین زبان و بیان، لسانیات اور ادیبوں و شاعروں کے فن وغیرہ پر تحریر کیے گئے ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے انوکھے اسلوب اور تنقیدی نقطۂ نظر سے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب اور شاعری کی صحیح جانچ اور پرکھ کرنے کی صلاحیت انھیں ورثہ میں ملی تھی، بات کی تہہ تک پہنچنے کا ہنر انھیں بخوبی آتا تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ نکتہ ہائے راز کو افشاں کرنے کی صلاحیت ان کے معتبر نقاد ہونے کی دلیل ہے جو ان کی گہری ادبی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ شان الحق حقی اپنی رائے کبھی مسلط نہیں کرتے ان کے مضامین میں نہ ہٹ دھرمی ہوتی ہے اور نہ ہی سختی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے قارئین کا وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ سیدھے سیدھے غیر جانبداری سے اپنی رائے رکھتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون 'زبان کے معیار کا مسئلہ' میں وہ فرماتے ہیں کہ:

''اگر چہ ہمارے بڑوں کو عیار اور ٹکسال پر بڑا اصرار رہا اور سند کے لیے اگلوں ہی کی طرف دیکھا جاتا رہا، پھر بھی فصاحت کا معیار دور بدور بدلتا رہا ہے۔ اصولاً شاعری کی زبان بول چال کی نسبت سست رَو اور قدیم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو میر و مرزا کی زبان وہ نہیں جو ذوق و غالب کی زبان تھی، اور پھر حالی، شبلی، اقبال اور ان کے ہم عصروں کی زبان اور بھی مختلف ہوگئی۔ اس سے آگے تو اتنے نئے اثرات پڑے کہ اگلے لوگ ہماری باتیں شاید بالکل ہی نہ سمجھ پائیں، اور شیخ امام بخش ناسخ تو صبح محشر کی طرح گریباں چاک کر کے رہ جائیں۔''[4]

شان الحق حقی نے تنقیدی مضامین لکھنے میں وہ زبان استعمال کی ہے جس کا تنقید تقاضہ کرتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان بے تکلف اور تصنع سے عاری ہے وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں صاف شفاف الفاظ میں کہتے ہیں اسی لیے ان کے مضامین بوجھل نہیں ہونے پاتے، ان کا طرزِ تحریر محض سادگی اور حقیقت نگاری پر مبنی ہوتا ہے۔ شان الحق حقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'نکتۂ راز، نقد و نگارش اور لسانی مسائل و لطائف' اردو ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان تصانیف میں شامل مضامین کیفیت، کمیت، تنوع اور لطافت میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

اردو زبان کے رموز پر شان الحق حقی کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ لسانی موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین نہ صرف یہ کہ اہمیت کے حامل ہیں بلکہ دیر پا اثر مرتب کرنے کے وصف سے مزین بھی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے سخت اور خشک موضوع کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر مقالہ پڑھنے میں خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ شان الحق حقی کے نزدیک زبان وسیلہ آشتی بھی ہے اور دوریوں کو نزدیکیوں میں بدلنے کا عمل بھی۔ اس سے مختلف افراد، متضاد قومیں اور ان کی تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں۔ یعنی زبان، خیالات، احساسات اور جذبات کو پیش کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

اگر شان الحق حقی کے کل کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی زبان دانی کے جلوے، لسانی نکتۂ راز کی جھلکیاں ہر جگہ نظر آئیں گی۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کے مختلف

میدانوں میں طبع آزمائی کی اور ہر میدان میں کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔

شان الحق حقی عمدہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ 'شاخسانے' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ 'نذر خسرو، فرہنگ تلفظ اور اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری' شان الحق حقی کی جرأت مندانہ کوششوں کے سبب منظر عام پر آئیں۔

شان الحق حقی نے 'فرہنگ تلفظ' میں تقریباً (30000) تیس ہزار الفاظ کو جمع کیا ہے جس میں لفظ کی صحیح ادائیگی کے ساتھ معنی ومفاہیم بھی بیان کیے گئے ہیں۔فرہنگ تلفظ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اختلافی تلفظ بھی بالالتزام درج کیے گئے ہیں ساتھ ہی قواعدی علامات اور معنی کے اندراج پر بھی توجہ دی گئی ہے۔فرہنگ تلفظ کے متعلق شان الحق حقی فرماتے ہیں کہ:

''اردو زبان کی جامع لغت جس میں معنی کے علاوہ الفاظ کا رائج فصیح تلفظ بھی ،حسب موقع اصل تلفظ کے ساتھ ساتھ،اعراب نیز الفاظ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔''5

افتخار عارف فرہنگ تلفظ کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس لغت میں بنیادی توجہ الفاظ کے اندراج پر دی گئی ہے۔محاورہ اور روزمرہ شامل کر کے اسے بلاوجہ طوالت کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔اردو اصطلاحیں شامل ہیں لیکن اگر یہ اصطلاحیں انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں تو ان کے سامنے انگریزی مترادف بھی درج کردیے گئے ہیں۔''6

مثال کے طور پر فرہنگ تلفظ سے لفظ 'چشم' کے معنی ومفاہیم کے ساتھ ان کے ہم پلہ معنی دیکھیے جس سے یہ واضح ہوجائے کہ کیوں فرہنگ تلفظ دوسری لغات سے منفرد ہے:

چشم: فت چ،سک ش۔امث۔آنکھ،نظر،نگاہ، توقع،امید، چھید،سوراخ، **چشم باطن** تخیل، وجدان، **چشم بیں** (ی مع،غنہ) ڈاکٹروں کا آنکھ کے معائنے کا اوزار جو اپنی آنکھ پر چڑھا کر اس کے سوراخ میں سے آنکھ پر روشنی ڈال کر دیکھتے ہیں۔[انگ: Opthalmoscope] **چشم پوشی** (سک م،و مج) درگزر،دانستہ نظر انداز کرنا۔ **چشم داشت** توقع،امید۔ **چشم رمدی** دکھتی آنکھ۔ اند۔ چشم زخم (سک م،فت ز) فک اضافت مقلوب۔ زخم، چشم، نظر بد کا اثر **چشم زدن** (سک م،فت ز د) پلک جھپکنا،چشم سوزن (کس مج م،و مج فت ز) سوئی کا ناکہ۔ **چشم ضیغم** ایک چمکدار، رنگین، پتھر جو تعمیرات میں کام آتا ہے۔امث۔ **چشم نمائی** (سک م،ضم ن) تنبیہ،سرزنش۔7

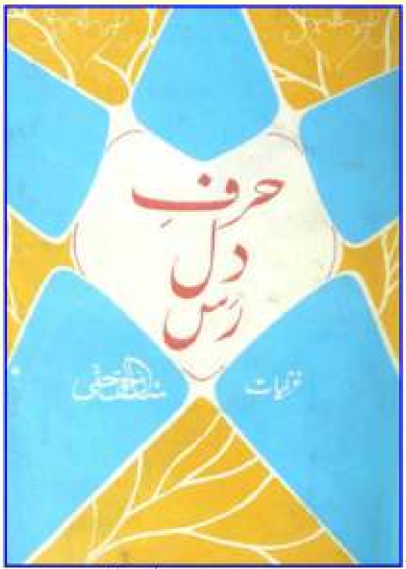

لغات کے سلسلے میں شان الحق حقی نے پاکستان کے ڈکشنری پروجیکٹ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے اپنا شاہکار کارنامہ 'اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری' کو شبانہ روز کی محنت ومشقت کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔جسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی نے 2003 میں شائع کیا۔ 2100 صفحات پر مشتمل اس لغت میں انگریزی زبان کے تقریباً سوا لاکھ الفاظ کے اردو معنی ،مطالب اور بین الاقوامی علامتوں میں انگریزی لفظ کا تلفظ بھی دیا گیا ہے۔شان الحق حقی ڈکشنری کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''یہ اب تک کی سب سے مکمل انگلش اردو لغت ہے جس میں نئے دور کے تازہ ترین موضوعات،علوم جدیدہ اور تکنیکی شعبوں سے تعلق رکھنے والے نئے الفاظ کا بھی، جیسے کمپیوٹر، برقیات، ہوابازی، نفسیات، جینیات، سیاسیات وغیرہ کی اصطلاحیں خاطر خواہ طور پر احاطہ کیا گیا ہے... املا، تلفظ اور محاورے کے اختلاف کی وضاحت کے علاوہ مخصوص مقامی یا علاقائی الفاظ بلکہ ناظرین کی آگاہی کے لیے مبتدل تحقیر یا طنز آمیز القابوں وغیرہ کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے جو بعض حلقوں میں ناپسندیدہ اور قابل اعتراض ہوسکتے ہیں۔8

شان الحق حقی نے غالباً 8 سال کی مدت میں 'اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری' کو 1998 میں مکمل کیا۔ڈکشنری میں U سے Z تک کا ترجمہ 'محمد سلیم الرحمٰن' نے کیا تھا لیکن اس حصہ پر بھی شان الحق حقی کو نظر ثانی کرنی پڑی تاکہ پوری لغت کے مزاج کو یکساں رکھا جاسکے۔ڈکشنری کی ناشر 'امینہ سید' (مینیجنگ ڈائریکٹر اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، پاکستان) لغت کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری جو اس وقت آپ کے سامنے ہے اکیس سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور بلاشبہ اپنے ہم عصروں پر ہر اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے۔ یہ جامع لغت آج کی رائج انگریزی کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔انگریزی الفاظ کے مطالب ومفاہیم اردو زبان میں نہایت واضح،صاف اور غیر مبہم انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔انتہائی مشکل اور پیچیدہ الفاظ بھی نہایت صاف اور عام فہم انداز میں سمجھائے گئے ہیں۔''9

بہر کیف راقم الحروف کو یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ شان الحق حقی اردو ادب کے ایک منفرد وممتاز صاحب طرز ادیب،شاعر،نقاد اور ماہر لسانیات ولغت نویس ہیں۔جس طرح سے انھوں نے ادب کی خدمات انجام دیں اور بعض متروک اصناف کو جلا بخشی وہ انھیں کا حصہ تھی۔انھوں نے جس صنف پر قلم اٹھایا اسے بام عروج عطا کیا پھر چاہے وہ شاعری ہو یا ترجمہ نگاری یا پھر تنقید ولسانیات اور لغت نویسی۔

برصغیر ہندوپاک کے اردو داں طبقہ نے ہی نہیں بلکہ عالم ادب نے بھی ان کی ادبی شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔شان الحق حقی نے اپنی 88 سالہ زندگی میں بے شمار کارنامے انجام دیے اور کینسر جیسی موذی بیماری کے سبب 11 اکتوبر 2005 کو دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

حواشی

1. شان الحق حقی کی ادبی خدمات، سارہ خالد، جی سی یونیورسٹی، لاہور پاکستان 2005،ص 30
2. دیباچہ،دل کی زبان، شان الحق حقی،مکتبہ اسلوب کراچی، پاکستان 1987،ص 9
3. بھگود گیتا،شان الحق حقی،انجمن ترقی اردو نئی دہلی 2011،ص 31
4. نقد ونگارش، شان الحق حقی، مکتبہ اسلوب کراچی، پاکستان، ص 126,127
5. فرہنگ تلفظ، شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، پاکستان،ص 1995 (ابتدائی صفحہ)
6. پیش لفظ،فرہنگ تلفظ،شان الحق حقی،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، پاکستان،ص 1995
7. فرہنگ تلفظ، شان الحق حقی،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، پاکستان،ص 1995،ص 410,411
8. پیش لفظ،اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری،شان الحق حقی،اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، پاکستان 2003،ص ix
9. عرض ناشر،اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری،شان الحق حقی،اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، پاکستان 2003،ص vii

Md Farhan Deewan
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh -202001 (UP)

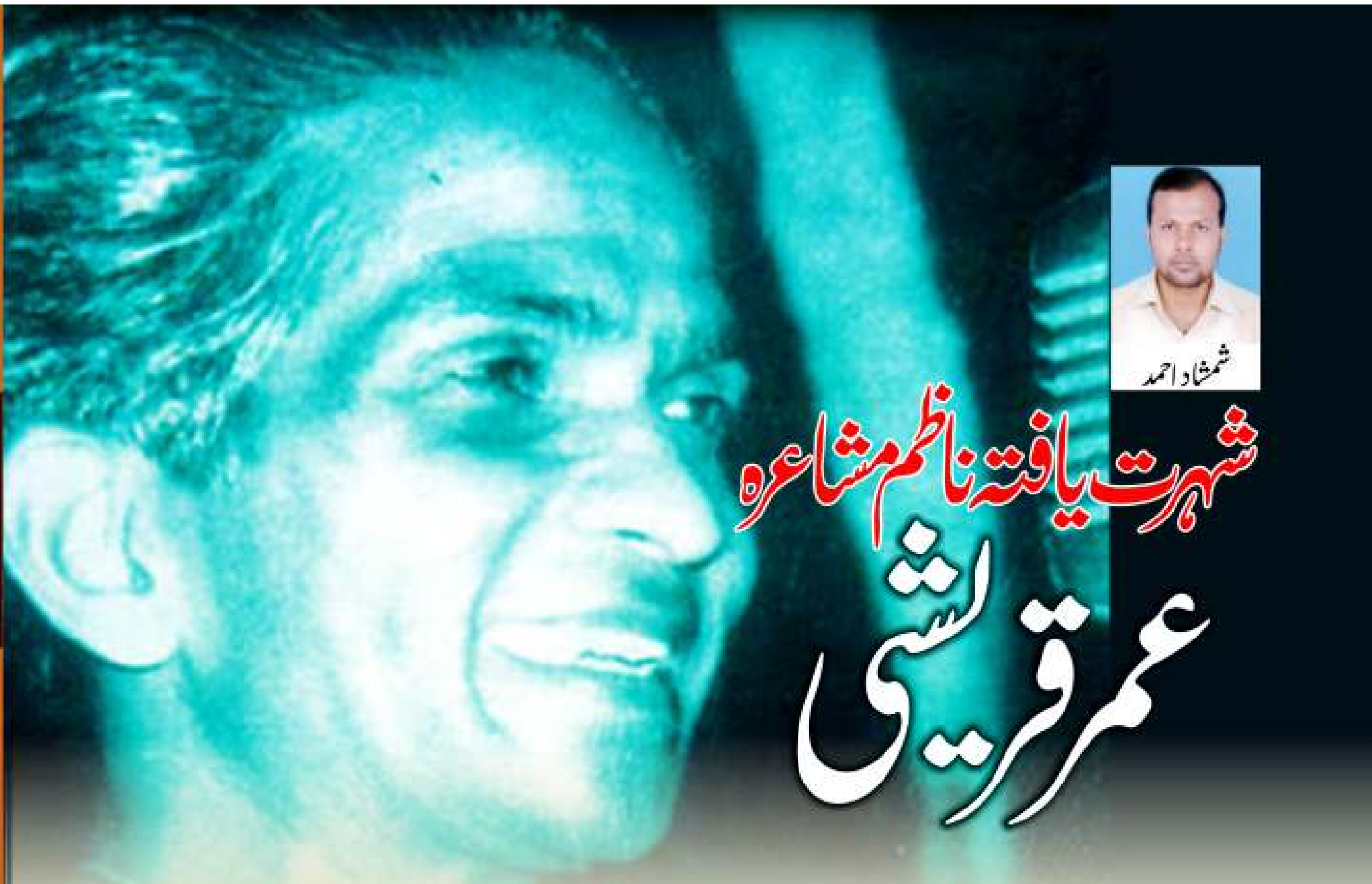

شمشاد احمد

شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ

عمر قریشی

عمر قریشی کی ولادت صوبہ اتر پردیش کے ضلع گورکھپور کے محلّہ خونی پور میں 16 ستمبر 1924 کو ایک معزز لیکن مفلس اور غریب خاندان میں ہوئی۔ جب ان کی عمر 5 سال کی ہوئی تو ان کے والد محترم نے ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں داخلہ کرایا جہاں آپ نے اردو فارسی کی تعلیم مولانا ضمیر احمد قدسی مرحوم، مولانا محمد صدیق، مولوی انوار الحسن انوار، مولوی ابومحمد وغیرہ جیسی علمی و ادبی شخصیتوں کی سرپرستی میں حاصل کی۔ مغربی تعلیم کے لیے جارج اسلامیہ کالج میں داخلہ ہوا۔ لیکن گھر میں مالی پریشانی ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکے آپ نے پرائیویٹ طریقہ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور پاس کرتے ہی ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ محنت و جفاکشی اور دیانت داری کی وجہ سے آپ ترقی کرکے این ای مشرقی ریلوے میں کلرک سے سینئر اسٹور افسر کے عہدے پر مامور ہوئے اور ریلوے بورڈ نے دیانت داری کی وجہ سے دوسری دفعہ 1982 میں کلاس ون افسر کی فہرست میں ان کو شامل کیا اور اسی سال آپ ریٹائر ہوگئے اور اس دنیا سے 18 مئی 2010 کو دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔

زمانہ طالب علمی ہی سے ان کا ذہن و رجحان شعر و ادب کی طرف مائل تھا۔ مضمون نویسی کا امتحان ہو یا پھر تقریری مقابلے ہوں یا طلباء کی شعری نشستیں ہوں ان سب میں حصہ لینا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ یعنی شعور کو پہنچ کر یہی ادبی ذوق ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا۔ گورکھپور کے ممتاز شعرا کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں نوجوان لڑکوں کی صف میں بڑی ہی خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر اپنے شعری ذوق کی تشنگی کو بجھایا کرتے تھے اور اپنے اندر چھپے ہوئے شعری شعور کو بیدار کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے آپ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور قومی سطح پر آپ نے اپنی پہچان بنالی۔ آپ کے شعری مجموعے بالترتیب اس طرح ہیں:

(1) شہرِ صدا 1988، (2) زخمِ احساس 1990، (3) شہرِ نگاراں 1990، (4) شہرِ صلیب 1993، (5) شہرِ آرزو 2006

عمر قریشی نے شعر و شاعری کا آغاز غزل سے کیا کیونکہ یہ صنفِ سخن فکر و فن کے لحاظ سے جس قدر مشکل دکھائی دیتی ہے اس لحاظ سے شعر گوئی کی ابتدا کے لیے آسان بھی ہے۔ روایتی بنیادوں کے سہارے مبتدی یا نوآموز شعراء ذہنی و فکری بے راہ روی کی وجہ سے لب و رخسار، عارض و گیسو، گل و بلبل، جام و مینا، شراب و ساقی، رنج و غم وغیرہ موضوعات کو سامنے رکھ کر غزل کا نقشہ تیار کرتے ہیں۔ اسی روایت کے مطابق عمر قریشی نے بھی ابتدا میں اسی انداز کی شاعری کی۔ عمر قریشی نے اپنے اندر کا کرب، معاشرہ میں پھیلی ہوئی مفلسی و ناداری، مفاد پرستی، خود غرضی، چور بازاری، اونچ نیچ کی جنگ، ذات برادری کا تصور فتنہ و فساد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ عمر قریشی نے کم و بیش چالیس سال تک شعر کہے اور غزل ہی کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا۔ ان کی غزلوں میں لہجہ نہیں نہیں بلکہ توانا اور بلند آہنگ ہے۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف اظہار کو ہی شاعری نہیں سمجھتے بلکہ نفسِ موضوع کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدّت خیال کے ساتھ ساتھ فنی نزاکتوں پر بھی ان کی نگاہ ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں تاریخی حالات اکثر و بیشتر دکھائی دیتے ہیں اور عوام کے سامنے اسی تاریخی منظر کو آئینے کی طرح دکھا دیتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

صلیب و دار کے تم واقعات بھی لکھنا
غزل میں شہر کے کچھ حادثات بھی لکھنا

ان کا کلام نہ تو ہنگامی ہے اور نہ ہی عارضی۔ عمر قریشی نے شاعری کو وسیلہ تفریح نہیں بنایا بلکہ زندگی کا ترجمان بنایا ہے۔

صداقت ہو نہ جس میں زندگی کی
عمر باز آؤ ایسی شاعری سے

ان کا ہر مصرعہ لہو کی ایک بوند ہے اور ان کا ہر شعر درد کا مجسمہ ہے ان کی غزلوں میں خود کلامی کے بجائے ہم کلامی کا انداز ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اختر بستوی:

''حضرت عمر قریشی اپنے عہد و ماحول کے گونا گوں عیوب و آلام کی سوزش و تپش کا شدید احساس رکھتے ہیں۔''

ان کے دوسرے مجموعہ 'زخمِ احساس' میں شاعر کا اصل سرمایہ موجود ہے جس میں پیکروں کی نمود شباب پر نظر آتی ہے۔ آزادی کے بعد سیاسی و تہذیبی سطح پر جو

تبدیلیاں رونما ہوئیں اس نے غزل کو نہ صرف لب ولہجہ عطا کیا بلکہ فکری اعتبار سے وسعت بخشی اور غزل کو نئی سمت سے آشنا کیا۔ اسی عہد کی عمر قریشی کی شاعری ہے انھوں نے اس عہد کو دل سے سمجھا اور محسوس کیا اور اپنی شاعری میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔

یزید وقت کی نظریں ہیں میرے خیموں پر
مجھے وہ عزم شہ کربلا عطا کردے
مرے محلے کی مسجد ہے منتظر میری
مجھے نماز کی لذت سے آشنا کردے
یہ اسلحہ جو تیرے ہاتھ میں چمکتا ہے
ترے ہی بچوں کو اک دن یتیم کردے گا
جو قوم آئی تھی پیغام زندگی لے کر
وہ قوم ہوگئی مردہ یہی تحیر ہے

عمر قریشی کا تیسرا مجموعہ کلام 'شہر نگاراں' ہے جس میں صرف عہد شباب ہی نہیں مچلتا بلکہ بعض مقامات پر عشق کی محرومی سے شاعر زندگی کرنے کا ہنر بھی حاصل کرتا ہے۔

کر گئے روشن چراغ زندگی
دے گئے داغ الم اچھا ہوا

ان کا یہ مجموعہ روایتی انداز کی شاعری اور شعری اسلوب کا حامل ہے۔ لب ولہجہ کی بنا پر روایتی انداز و اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کا سفر 'کوئے جاناں' سے ہوکر صلیب و دار کی منزل پر ختم ہوتا ہے۔ کسی بھی شاعر کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لیے اس کے جملہ ادبی کارناموں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسی لحاظ سے عمر قریشی نے مزید نکھار اور مستقبل کے لیے اپنی الگ راہ متعین کی۔

ان کا چوتھا مجموعہ کلام 'شہر صلیب' ہے جو حالات حاضرہ سے متاثر غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے ہر شعر کی تخلیق کے پیچھے حالات حاضرہ کا کوئی نہ کوئی المیہ موجود ہے۔

ان کا پانچواں مجموعہ 'شہر آرزو' ہے جو حالات کی روشنی میں ہے۔ بقول پروفیسر محمود الٰہی:

''عمر قریشی کو معاصرین کے مطالعے کا جتنا موقع ملا اتنا مشکل سے کسی کو ملتا ہے یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں انفرادیت ہے قابل رشک انفرادیت۔ یہی انفرادیت اب قمر قریشی کی پہچان بن گئی ہے۔''

بقول پروفیسر ملک زادہ منظور احمد:

''جب آپ بیتی جگ بیتی بن جائے اور غم ذات غم کائنات میں تبدیل ہوجائے تو شاعر معتبر ہوجاتا ہے اور اس کا ایک لفظ اس کے عہد کی دستاویز بن جاتا ہے عمر قریشی اسی کلیہ پر پورے اترتے ہیں۔''

عمر قریشی زندگی کے شاعر ہیں ان کا فن تمام تر روح

کے اضطراب سے سرشار ہے۔ ان کی غزلوں میں مخصوص تہذیبی میلانات کے ساتھ زبان و بیان کے قدیم و جدید پیرائے پائے جاتے ہیں اور رنگا رنگ تجربات و مشاہدات میں رچی بسی زندگی کا حسین منظرنامہ سامنے آتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عہد کو سمجھا اور محسوس کیا بلکہ اس زبان کا بھی مطالعہ کیا وہ زبان جو سادہ ہوتے ہوئے بھی معنی خیز ہے اور اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار ان شعراء کے صف میں ہوتا ہے جو زمانے اور زندگی کے ہر مسئلے سے الجھتے ہیں اور دامن نہیں بچا پاتے ہیں بلکہ اشیاء اور صورت حال کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

عجب سفر ہے کہ صدیوں سے چل رہا ہوں مگر
نہ کوئی شام نہ اب تک کوئی سحر آئی
جینے نہ دے گی دنیا میں یہ تیری بزدلی
ہمت اگر ہے تجھ میں تو میدان مار لے
دشمن ہے تیری تاک میں اب مورچہ سنبھال
خیمے کو اپنے چھوڑ رہ کارزار لے
مرے وطن کا پتہ مجھ سے پوچھنے والو
جہاں پہ دفن میں ہوں گا وہی وطن ہے مرا
نہ چھو سکا مرا احساس بھی جسے اب تک
اسی کی خوشبو میں گم ہوں وہ گل بدن ہے مرا

بقول انور جلالپوری:

''عمر صاحب کی گل افشانی گفتار پر تبصرہ کرنے میں جوان ادھیڑ اور بوڑھے ایسی عمروں کے فرق کو بھول گئے تھے۔ نادر شاہ نے کبھی دلی کو لوٹا ہوگا مگر اس دن تو عمر صاحب میرے دیار سخن فہموں کا دل لوٹ کر چلے گا۔''

عمر قریشی طرز گفتگو کے ڈرامائی انداز اور بیان کے ہنر کی اسکندری سے واقف ہیں۔ انھیں مجمع کی ہنگامہ خیزی پر اپنی گرفت رکھنے میں مہارت حاصل تھی اور شور وغل کے ماحول پر ان کی آواز کی کھنک بھاری پڑ جاتی تھی۔ یہ لفظوں کو گلاب اور جملوں کو گلدستہ بنا دینے میں ماہر تھے۔ جب وہ اپنے انداز میں تعارف پیش کرتے یا گفتگو کے درمیان مناسب ترین اشعار پیش کرتے تھے تو سننے والا چونک جاتا تھا ٹھیک اسی طرح جیسے کسی نے سادہ انگوٹھی میں نگینے جڑ دیے ہوں اس وقت عمر قریشی کی شخصیت مرصع ساز بن کر چمکنے لگتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک مصرعہ یا ایک شعر سے سامعین کو جذباتی، برہمی کو سکوت اور اطمینان میں بدل کر اس طرح مطمئن ہوکر بیٹھے تھے کہ لوگ پکار اٹھتے تھے کہ یہ شخص پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر تراشنا جانتا ہے۔ اس طویل عرصے میں عمر قریشی کی انکساری اور عالی ظرفی نے مشاعروں کے اسٹیج پر جن ذروں کو ستارے اور جن ستاروں کو آفتاب و مہتاب بنا دیا اور حالات کی سخت دھوپ اور وقت کے تیز اور بے رحم تھپیڑوں نے انھیں ان کی اصل جگہ پر واپس کردیا مگر ان کی شخصیت آج بھی مہر نیم روز کی طرح روشن اور تابناک ہے ان کی شخصیت نے مشاعروں کے اسٹیج کی ترتیب و تہذیب اور تزئین و آرائش اسی طرح کی ہے۔ جیسے آرائش خم کاکل کی جاتی ہے ان کے مزاج کی نرگسیت اور ان کی طبیعت کی ریشمیت زندگی کی روحانی قدروں پر ایمان تازہ کردیتی ہے۔ عمر قریشی کی شخصیت اسٹیج سے چالیس سال تک وابستہ رہی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ظرف میں کوہ قراقرم کی سربلندی اور ان کے احساس میں سمندروں کی اتھاہ گہرائی ہے۔ وہ اپنی حدود سے واقف تھے۔ ان کی زندگی میں کرب تو ہے مگر ساری زندگی کو کربلا بننے سے بچانے کی جدوجہد میں بھی وہ شریک ہیں۔

یہی غم جاناں اور یہی غم دوراں عمر قریشی کی شاعری کے بنیادی افکار ہیں۔ عمر قریشی کی شخصیت مجنوں گورکھپوری کی دانشوری کے سائے میں پروان چڑھی ہے یہ صرف اس عہد کے ناظم مشاعرہ ہی نہیں بلکہ ایک باکمال اور باوقار شاعر بھی ہیں جن کے افکار کے نقوش گورکھپور کے درودیوار پر صدیوں تک قائم رہیں گے اور آنے والے وقتوں میں ادب کا کوئی بھی ناقد اور تذکرہ نگار انھیں نظرانداز نہیں کرسکے گا۔

■

Shamshad Ahmad
Research Scholar, Dept of Urdu
DDU Gorakhpur University, Civil Lines
Gorakhpur - 273009 (UP)
Mob.:9648221963

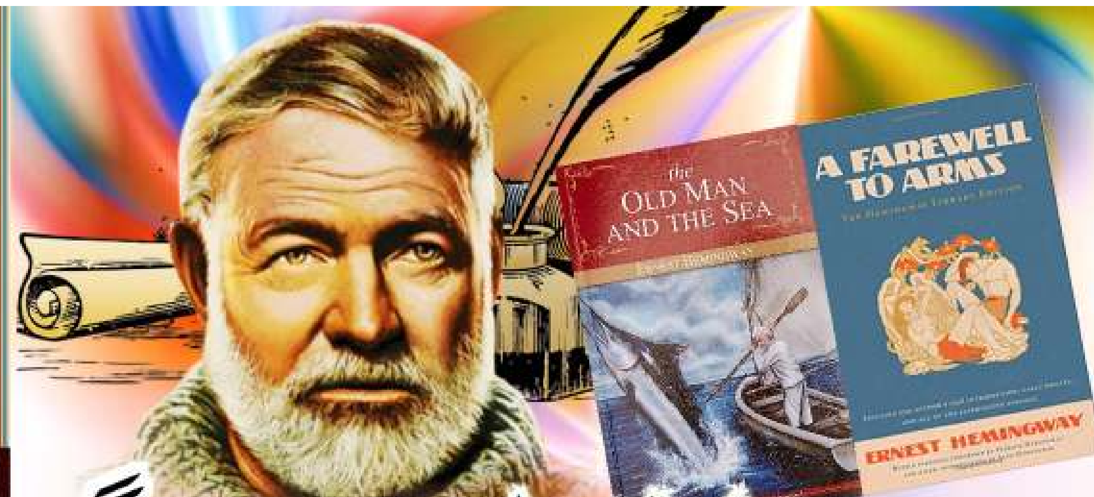

اقبال برکی

نوبل لاریٹ ارنیسٹ ہیمنگوے
ایک منفرد ناول نگار

ادب کا مایہ ناز نوبل انعام حاصل کرنے والے امریکی ادیبوں کی طویل فہرست میں نمایاں ترین ناموں میں سے ایک نام ارنیسٹ ہیمنگوے کا بھی ہے۔ شخص اور ادیب، فرد اور فنکار، دو جداگانہ ہیمنگوے یا سکے کے دو رخ ہیں، ایک دوسرے سے الگ اور مخالف، ایک پیچھے دوسرا آگے یا ایک کے پس پشت دوسرا! یعنی بہت کم امریکی ادیب اور شاعر ہوں گے جو ہیمنگوے کی شخصیت کے تضادات کی ہمسری کرسکیں۔ ایک طرف تو عوام کے دل و دماغ پر ایک ہیرو بن کر چھا جانے والا کھلنڈرا ہیمنگوے، شیروں کا شکار کرنے والا ایک بہادر شکاری، ایک نڈر اور جان جوکھم میں ڈال کر گہرے سمندر پر مچھلی کے شکار کا شوقین، اور ایک بے خوف بل فائٹر جو کہانیوں کے شہزادوں کی طرح تصورات پر مدت تک چھایا رہے تو دوسری طرف اس کی نجی زندگی کا اسرار جس پر کئی کئی پردے پڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک ذرا سا بھی اُٹھتا ہے تو نظر آنے والا منظر اپنے متعلق اور زیادہ جان لینے کی بے سود مگر فطری خواہش کو بری طرح گدگدا کر برانگیختہ اور متحرک کر دیتا ہے۔ اس کی نجی زندگی جس پر اسرار سائے کی طرح لہراتے ہیں جب کھلتے ہیں تو دیکھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ہیمنگوے کی زندگی کا یہ بھی ایک رخ تھا۔ وہ جب کوئی کہانی یا ناول کا کوئی پلاٹ اپنے ذہن میں لیے اسے خامہ و قرطاس کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہوتا تو گھنٹوں پہلے تنہائی میں بیٹھ کر درجنوں پنسلوں کو چھیل کر ان کا ڈھیر جمع کر لیتا اور جب کسی صورت سے لکھنا شروع کر دیتا تو گھنٹوں گزر جاتے اور اسے ہوش نہ رہتا۔ لیکن جب وہی تحریر شائع ہوتی تو قاری کے ہوش اڑاتی۔ جیسے اس کا مشہور اور اپنے طرز نگارش میں منفرد خصوصیات کا حامل اور بہت کم ضخامت رکھنے والا ناول 'بوڑھا اور سمندر' The Old Man And The Sea شائع ہوتے ہی بحری و بری سرحدوں کو پھلانگتا ہوا پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اسی کے ساتھ ہیمنگوے کا نام بھی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ ہیمنگوے کی تحریریں اس کے زمانے اور اُس کے بعد آنے والے ایام میں بھی ادیبوں اور مصنفوں کو متاثر کرتی رہیں اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ اس کا مثالی اور منفرد اسلوب ایک زمانے تک قابلِ تقلید رہا ہے اور آج بھی وہ امریکہ کے کلاسیکی ادب میں ایک اہم نام تصور کیا جاتا ہے۔

ہیمنگوے کا بچپن اور لڑکپن بہت شاندار تھا۔ کھاتے پیتے اور صاحبِ ثروت والدین کا اولین چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے اس کا یہ زمانہ بڑے ناز و نعم سے گذرا۔ اس کے والدین امریکی ریاست الینوائے Illinoi کے شہر اوک پارک (Oak Park) کے باشندے تھے اور معززین میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے والد کلیرنس ایڈمنڈ ہیمنگوے (Clarens Edmund Hemingway) پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے جب کہ والدہ گریس ہال (GreeceHall) ایک ماہر موسیقار تھی۔ دونوں شہر میں ایک مقام و مرتبہ رکھتے تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ہیمنگوے کا پورا نام ارنیسٹ ملر ہیمنگوے (Earnest Miller Hemingway) تھا۔ وہ 21 جولائی 1899 کو اوک پارک میں پیدا ہوا۔ بچپن ماں باپ کی نگرانی میں بہت اچھا گذرا۔ اس کے والد باوجود بہت مصروف ہونے کے جب بھی موقع ملتا کچھ وقت اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ضرور گذارتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو مختلف علوم کی تعلیم اور کئی ہنر مندیوں کو سیکھنے میں اس کی مدد کی اور مناسب تربیت بھی دی۔ جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ بیٹے کو لے کر مشی گن کی شمالی جھیلوں پر چلے جاتے اور مچھلیوں کے شکار کے طریقے سکھاتے یا کبھی جنگلوں میں قیام کرنے اور جنگلی جانوروں خصوصاً چیتے یا شیر کے شکار سے متعلق اس کی تربیت کرتے۔ اس طرح وہ اپنے والد کے ساتھ کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ دوسری طرف اس کی والدہ کو یہ در در بھٹکنے اور ویران جنگلوں یا سمندر کی طوفانی موجوں پر جان جوکھم میں ڈالنے کے یہ خطرناک شوق ناپسند تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا ارنیسٹ ملر بھی اس کی طرح ایک ماہر اور نامور موسیقار بنے اور اسی میں سارا زور لگائے اور اسی کو پیشے کے طور پر اپنائے۔ ماں باپ کے طبائع کا یہ بعد المشرقین نزاع کا باعث بنتا اور گھر کا ماحول کشیدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ نو عمر ارنیسٹ اس ماحول سے بڑی کوفت محسوس کرتا تھا۔

ہیمنگوے کی ابتدائی تعلیم اوک پارک (Oak Park) میں ہی ہوئی تھی۔ اسے 1913 میں ریور فارسٹ ہائی اسکول The River Forest High School میں داخل کیا گیا تھا۔ یہاں وہ 1917 تک زیرِ تعلیم رہا۔ تعلیم کے دوران ہی اس نے اپنی مادری زبان پر کافی دسترس حاصل کر لی تھی۔ وہ انگریزی مضمون میں ہمیشہ دوسروں سے آگے اور نمایاں رہتا تھا۔ یہیں سے اسے خامہ فرسائی کا شوق ہوا اور پھر زندگی کے ساتھ رہا۔ یہیں سے اس نے چھوٹے چھوٹے مضامین اور کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔ اسکول سے نکلنے والے جریدے ٹریپیز اینڈ ٹیبولا Trapeze and Tabula میں وہ مختلف عنوانات کے تحت کچھ نہ کچھ تحریر کرتا ہی تھا۔ مطالعہ کا شوق بھی اسے اسی زمانے سے ہوا اور بڑھتا رہا۔ وہ بے تحاشہ مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ مختلف کھیلوں سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کھیل کھیلتا تھا بلکہ ان کے مقابلوں میں بھی شد و مد سے حصہ لیتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے دوڑ کے مقابلوں، باکسنگ، واٹر پولو، اور فٹ بال کے مقابلوں میں کئی انعامات اور تمغے جیتے تھے۔ ہائی اسکول سے فارغ ہوتے ہی وہ 'کنساس سٹی اسٹار' نامی معروف رسالے سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں اگرچہ اس کی مدتِ کار بہت مختصر یعنی صرف چھ مہینہ کی تھی مگر اس قلیل عرصے میں بھی صحافت سے

متعلق اس نے کئی مفید اور اہم گر سیکھے جو اس کی آئندہ زندگی میں بہت سود مند اور کارگر ثابت ہوئے۔ ان تجربات نے اس کے منفرد اسلوب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔

اس کی شخصیت کے تضادات اس کی آئندہ زندگی کی راہوں کو متعین کرنے میں بھلے ہی بنیاد نہ بنے ہوں لیکن یہ تضادات حیرت انگیز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ ایک طرف تو اس کی شخصیت صریر خامہ کے سحر سے مسحور ہوتی تھی اور وہ کئی کئی دن عزلت گزینی اور گوشہ گیری میں اس نوائے سحر انگیز کا اسیر رہتا اور تنہائی میں گزار دیتا تو دوسری طرف اس کی افتادِ طبع نت نئے خطرات مول لینے اور زندگی بار بار داؤ پر لگانے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ وہ کبھی افریقہ کے جنگلوں میں شیر کے شکار کے لیے نکل جاتا اور مہینوں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا تو کبھی اسپین میں سانڈ کشتی یا Bullfighting کے کھیل میں حصہ لیتا اور اپنی زندگی کا دشمن بن جاتا اور کبھی کبھی وہ فلوریڈا کے انتہائی گہرے سمندر اور دور دراز کے علاقے میں جہاں عام طور پر لوگ جانے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، مچھلی کا شکار کرنے نکل جاتا اور ہفتوں گھر نہ لوٹتا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم عالمی منظر نامے کے انقلاب کی بھی نقیب تھی۔ اس کے آغاز کے ساتھ ہی عالمی سیاست، معیشت، معاشرت اور انفرادی و اجتماعی افکار میں بھی انقلاب رونما ہوئے۔ ہیمنگوے کی زندگی نے بھی پلٹا کھایا۔ کھلنڈرا اور جوشیلا ہیمنگوے بہت پیچھے رہ گیا اور اس کی جگہ ایک سنجیدہ، متین اور حساس قلمکار نے لے لی تھی جو انسانی آلام و مصائب کو محسوس کر سکتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوتے ہی اس نے امریکی راحت رسانی کی خدمات انجام دینے والی ریڈ کراس سوسائٹی کی رکنیت حاصل کر لی۔ ریڈ کراس کے ایمبولنس ڈرائیور کی حیثیت سے اسے اٹلی کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ زخمیوں کی مدد اور کام آنے والے سپاہیوں کی لاشوں کو ڈھونے کے دوران وہ خود بھی بری طرح زخمی ہوا لیکن اپنے زخموں سے بے پرواہ وہ دوسرے زخمیوں کی بروقت امداد رسانی اور ان کی حفاظت کا کام بڑے حوصلے اور بہادری سے انجام دیتا رہا۔ اطالوی حکومت ریڈ کراس ایمبولنس کے اس دلیر اور بہادر ڈرائیور اور اس کے قابلِ ستائش کارناموں سے بہت متاثر ہوئی اور آخر کار اس نے ارجینٹ ملر ہیمنگوے کو اطالیہ کے 'سیمیں میڈل' سے نوازا۔ محاذِ جنگ پر اس نے جو مشاہدات کیے اور جن تجربات سے وہ گذرتا رہا، وہ سب اس کی آئندہ زندگی میں بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوئے۔ اس کا ناول A Farewell To Arms اس کی عمدہ مثال ہے جس میں اس نے اطالوی شہر ملان (Milan) کے محاذِ جنگ کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جن مناظر کو پیش کیا ہے وہ قاری کو ان سے بہت قریب کر دیتا ہے بعض مناظر تو ایسے ہولناک اور ذہن و فکر کو متاثر کرنے والے ہیں کہ قاری برسوں انھیں فراموش نہیں کر پاتا اور وہ مدت دراز تک اس کی نظر کے سامنے ناچتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان واقعات اور مناظر کے پس منظر میں ابھرنے والی اس کی انسان نوازی، رشتوں کی اہمیت اور ان کی پاسداری اور بنی نوعِ انسان کے لیے اس کا بے پناہ جذبۂ ترحم جیسی لاثانی قدریں ایسے راستوں سے قاری کے دل میں گھر کر لیتی ہیں کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور جب مدت بعد وہ اپنے مطالعہ پر نظرِ ثانی کرتا ہے تو یہی جذبات و اقدار کی سوغات اسے سب سے اوپر اور نمایاں نظر آتی ہیں۔

1919 میں وہ اپنے جسم پر زخموں کو سجائے گھر لوٹ آیا۔ گھر لوٹتے ہی اس نے فوراً ٹورنٹوں میں ایک دوسری ملازمت اختیار کر لی۔ ایک فری لانس صحافی کی حیثیت سے وہ 'ٹورنٹو اسٹار ویکلی' (Toranto Star Weekly) میں مسلسل لکھتا رہا۔ بیرونی نامہ نگار کی حیثیت سے 1920 میں جب وہ شکاگو منتقل ہو گیا تب بھی اپنی کہانیاں اس ادارے کو ارسال کرتا رہا۔ 1921 میں ٹورنٹو اسٹار کے دفتر نے ہیمنگوے سے ایک معاہدہ کیا اور اپنے نامہ نگار کے طور پر اسے فرانس کے دارالحکومت پیرس بھیج دیا۔ پیرس کا قیام اس کی زندگی کے خوشگوار ترین دنوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے اندر کا ادیب اور کہانی کار انگڑائی لے کر نمایاں ہو گیا اور صحافی ہیمنگوے پر غالب آ گیا۔ ایک افسانہ نگار کے طور پر اس کی شناخت قائم ہو گئی اور ایک اچھے اور منفرد اسلوب کے ادیب کے طور پر اس کی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ پیرس میں صرف بیس مہینوں کے قیام کے دوران اس نے تقریباً 88 کہانیاں تحریر کیں۔ ترک یونان جنگ نے ایک بار پھر اسے محاذ پر کھینچ بلایا اور وہ اس جنگ کے احوال کا تازہ ترین منظر نامہ اپنے اخبار کے دفتر کو روانہ کرنے لگا۔ اس کی وجہ سے اسے مختلف خطوں اور علاقوں سے بھی گذرنا پڑا اور بار بار سفر بھی کرنا پڑا۔ ان اسفار کے مشاہدات اور تجربات بھی وہ گاہے بہ گاہے سپردِ قلم کرتا رہا۔ ان شذرات کو وہ دیگر رسائل و اخبارات میں بھی بغرض اشاعت بھیجتا رہا۔ پیرس میں قیام کے دوران اس نے جو کہانیاں لکھی تھیں ان میں سے تین کہانیاں پہلی بار 1923 میں 'تین کہانیاں اور دس نظمیں' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئیں۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی اس کے لیے بڑی بار آور ثابت ہوئی۔ ان دو دہائیوں میں اس کا اسپ قلم سرپٹ دوڑتا رہا۔ اس کی کہانیوں کے کئی مجموعے اور ناول زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے اور منظرِ عام پر آئے۔ ان تخلیقات میں

(1) Death In The Afternoon, (2) The Short Happy Life Of Francis Macmber, (3) To Have Or Not To Have,

کے علاوہ مشہور ناول For Whom The Bell Tools خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ادیب صحافی یا ایک صحافی ادیب نے مختلف علاقوں، لوگوں اور جنگوں اور محاذِ جنگ پر ناقابلِ بیان سچائیاں دیکھیں انسانی عظمت کے بے مثال نمونے دیکھے اور حیوانیت کے شیطان کا رقصِ جنون بھی دیکھا۔ جنگ کے ان بدترین ایام میں اس نے انسانی بلندی و پستی کا جو مشاہدہ کیا وہ اس کے طائرِ تخئیل کو زمین پر کھینچ لانے کے لیے کافی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات حقیقی اور زمین سے وابستہ رہتی ہیں اور عام انسانی تجربہ بن جاتی ہیں۔ ہیمنگوے کی یہ کہانیاں آنے والے زمانے میں بھی عرصے تک پڑھی جاتی رہیں گی۔

ہیمنگوے کا ناول The Old Man And The Sea 1951 میں پہلی بار شائع ہوا۔ خود کلامی کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں شدید جذبات کی اونچی لوجن کی روشنی انسانی رشتوں اور ان کی پاسداری، کی اہمیت کو نمایاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ فکر انگیزی اور انسان نوازی کی خوبی سے معمور یہ ناول شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس ناول کی اشاعت نے نوبل انعام اور ہیمنگوے کے درمیان کی ساری خلیجوں کو پاٹ کر رکھ دیا۔ اسی ناول کی بنیاد پر بالآخر 1954 میں اسے ادب کے نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہا۔ اس نے ایک دنیا کی سیر کی اور اپنے شوق پورے کیے لیکن ایک فرد کی حیثیت سے اس کی نجی زندگی بہت زیادہ کامیاب نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی طبیعت کا ہرجائی پن اس کے لیے مشکلات، مصائب اور صدمات کے پہاڑ کھڑا کرتا رہا۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں صحت بھی جواب دے گئی تھی۔ مایوسی اور شکستہ دلی نے اسے آدبوچا تھا۔ جگر کے عارضے کے ساتھ ہی ہائی بلڈ پریشر بھی اس کے لیے سوہانِ روح ہی ثابت ہو رہا تھا۔ بالآخر 2 جولائی 1961 کی صبح اس نے اپنے ہی پستول سے سر میں گولی مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ ہیمنگوے نے بھلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہو لیکن اس کی کہانیاں، اس کے ناول اور ان میں موجود توانا انسانی رشتوں کی پاسداری، انسان نوازی اور انسانیت کے لیے بے پناہ جذبۂ ترحم جیسی بے مثال قدریں اسے اور اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے اور جب تک ادب پڑھا جاتا رہے گا ہیمنگوے کی تحریریں قاری کو انھیں پڑھنے پر مجبور کرتی رہیں گی۔

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHADA, Noor Bagh
Malegaon - 423203
Distt.: Nasik (Maharashtra)

حسام الدین فاروقی

سوشل میڈیا اور اردو زبان

پچھلے کچھ سالوں میں ذرائع ترسیل و ابلاغ میں 'سوشل میڈیا' نے بہت تیزی سے اپنا دائرہ بڑھایا ہے۔ کوئی دو دہائی پہلے تک ماس کمیونی کیشن کے تحت ہم مندرجہ ذیل میڈیم کو ہی ذرائع ترسیل و ابلاغ یعنی ماس کمیونی کیشن کے تحت گنتے اور پڑھتے رہے۔

1. **پرنٹ میڈیم:** اسی میڈیم کے تحت اخبارات کے ساتھ رسالے، کتابیں وغیرہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اشتہارات و پمفلیٹ کو بھی اسی میڈیم کے تحت پڑھایا گیا اور اس کے فائدے اور نقصانات و کمیاں گنائی گئیں۔

اس میڈیم کے تحت اردو زبان کو بہت طاقت ملتی رہی۔ اخبارات شائع ہوئے۔ خود اردو زبان و ادب کے تحت کتابوں کی اشاعت ہوئی اور کتابوں کے ذریعے اردو گیت کی علیحدہ سے لائبریریاں قائم ہوئیں۔ اردو پڑھی اور پڑھائی گئی تو نوکریوں کے لیے اردو زبان ذریعہ بنی۔ اس سے کافی پہلے تک اشتہارات کے ساتھ ہورڈنگ (Hordings) اور پمفلیٹ (Pamphlete) وغیرہ سے بھی پیغامات (Massage) یہاں سے وہاں بھیجے گئے اور لوگوں کو جانکاریاں ملتی رہیں۔

2. **ریڈیو: آل انڈیا ریڈیو (آکاش وانی)** کے مقامی ریڈیو بھی کھولے گئے۔ ماس کمیونی کیشن کے تحت ریڈیو کے یعنی اس میڈیم کے فائدے اور کیا پڑھائی اور سمجھائی گئیں اور لوگ ریڈیو کے ذریعے پیغامات، خبریں، اشتہارات اور یہاں تک کہ فلم سے متعلق جانکاریوں اور گیتوں کی شکل میں تفریح کا کل لطف بھی اٹھاتے رہے۔ غور طلب ہے کہ ریڈیو میں ہمیشہ اردو زبان کو اور اردو جاننے والے حضرات کو ترجیح ملتی رہی۔ وجہ تھی اردو کی سادگی، زبان کی خوبی اور عوامی زبان ہونے کی خوبی کہ بنا دیکھے بھی ریڈیو پر بولنے والے اپنی بات کو سامعین تک آسانی سے جلدی اور بہتر طریقے سے سمجھا سکتے تھے۔

3. **ٹیلی ویژن:** اس میڈیم میں تصاویر کی مدد سے بولنے والے کی حرکات و سکنات سے عوام کو اپنی بات اور بھی بہتر طریقے سے پہنچائی جا سکتی تھی۔ خبروں اور سیریل وغیرہ کے لیے بھی یہ میڈیم اثر کاری رہا لیکن یہاں بھی زبان کا سہل ہونا ضروری سمجھا گیا اور اردو زبان کو اہمیت ملتی رہی۔ 2009 میں راقم الحروف نے پی ایچ ڈی کے موضوع کے حوالے سے تفصیلی بات کی جس تھیسس کو بعد میں کتابی شکل میں چھپوایا بھی گیا۔ موضوع تھا 'اردو کے فروغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا حصہ'

4. **فلمیں:** فلموں کو بھی ماس کمیونی کیشن کے تحت پڑھایا گیا اور اس کی تکنیک کو جس میں فلمی تحریر کے مضامین بھی شامل رہے پڑھائے گئے۔ مثلاً فلموں کے لیے کہانی، مکالمے، اسکرین پلے یا فلمی گیت وغیرہ میں زبان کی مہارت کی ضرورت پڑی اور فلموں میں اردو زبان کی ہی اہمیت بنی رہی۔ گو کہ فلم ایک منہگا میڈیم ہونے کے تحت ایک خاص حد تک اپنے پیر پسار سکا لیکن فلموں کے ذریعے عوامی مسائل اور موضوع آسان زبان کے ساتھ عوام تک پہنچائے جاتے رہے اور اردو اس کے لیے کارگر زبان مانی گئی۔

2016 میں فلمی گیتوں میں اردو زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے ایک کتاب لکھی۔ 'فلمی گیتوں میں تخلیقیت' اتر پردیش اردو اکادمی نے اسے انعام سے نوازتے ہوئے ادبی تخلیق بھی تسلیم کیا۔

آیئے اب سوشل میڈیا کی بات کی جائے۔

سوشل میڈیا:

نئے ذرائع ترسیل و ابلاغ (Medium of Mass Communication) میں سوشل میڈیا نے کم وقت میں ہی بہت تیزی سے عوام تک اپنی پہنچ بنائی ہے۔

اب آپ کی اور ہماری جیبوں میں رکھا ہوا موبائل، ہماری اپنی ذاتی جانکاریوں سے لے کر اخبار کی تمام جانکاریوں کو اپنے اندر سمیٹے رکھتا ہے۔

تعلیم؟ یا میڈیکل، گھریلو پکوان کی بات ہو یا سلائی کڑھائی کا فن، کھیل، کثرت کی بات ہو یا صحت و تندرستی کی بات سبھی سے متعلق مشورے اور تفصیلات اس موبائل میں موجود ہوتی ہیں۔

ہمیں گھر میں کارپینٹر چاہیے یا پلمبر، مستری چاہیے یا ٹیوشن کے لیے ٹیچر، سب ہمیں اپنے موبائل کے ذریعے مل سکتے ہیں۔

علم کی بات ہو، تعلیم کی بات ہو، کھیتی کسانی کی جانکاری ہو، یا سفر اور سیر سپاٹے کی، موبائل ہمارے لیے مددگار ہے آپ کا ہمارا موبائل گھر پر ٹیکسی بلا سکتا ہے یا ضرورت کے وقت ایمبولینس، گھر میں پکوان کا یا استعمال کا سامان منگوانا ہو یا کسی مدد کے لیے پڑوسی کو بلانا ہو آپ کا موبائل آپ کے لیے مددگار رہتا ہے۔

ہر میدان کی نئی نئی خبریں اور جانکاریاں ہمیں اپنے موبائل میں سمائی نظر آتی ہیں۔ علم و تعلیم کا میدان ہو، سیاست یا کھیتی و زراعت سے متعلق خبریں، موسم کے مزاج کی بات ہو یا ریل و جہاز کی آمد و رفت کے اوقات کی— موبائل کارآمد ہے۔ اپنے شہر سے لے کر دنیا کے تمام شہروں کی ترقی کے نئے میدان یا ان کی کمیاں آپ موبائل سے جان سکتے ہیں۔ شہر میں ہونے والے کلچرل پروگرام سے لے کر مسئلے مسائل پر ہونے والی بیٹھک کی جانکاری آپ کو موبائل سے مل جاتی ہے۔

> **ہر میدان کی نئی نئی خبریں اور جانکاریاں ہمیں اپنے موبائل میں سمائی نظر آتی ہیں۔ علم و تعلیم کا میدان ہو، سیاست یا کھیتی و زراعت سے متعلق خبریں، موسم کے مزاج کی بات ہو یا ریل و جہاز کی آمد و رفت کے اوقات کی — موبائل کار آمد ہے۔اپنے شہر سے لے کر دنیا کے تمام شہروں کی ترقی کے نئے میدان یا ان کی کمیاں آپ موبائل سے جان سکتے ہیں۔ شہر میں ہونے والے کلچرل پروگرام سے لے کر مسئلے مسائل پر ہونے والی بیٹھک کی جانکاری آپ کو موبائل سے مل جاتی ہے۔**

'سوشل میڈیا' نے دراصل ٹیلی فون جیسے آلہ کے ساتھ ماس کمیونی کیشن کے تمام میڈیم کو اپنے اندر سمو لیا ہے جیسے کہ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن یا فلم سبھی میڈیم کی کمی کو 'سوشل میڈیا' دور کرتا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ ان تمام ذرائع ابلاغ کو سوشل میڈیا نے فوری اور رواں تبصرے کی روانی دی ہے۔ آپ کہیں بھی کسی بھی مقام یا موقعے پر ویڈیو یا فلم بنا سکتے ہیں۔ کسی مقام خاص سے متواتر خبریں آگے بڑھا سکتے ہیں یعنی اخبار سے زیادہ کام کہیں سے بھی ہونے والے واقعات کا رواں تبصرہ دے سکتے ہیں یعنی ریڈیو کو آسانی سے سہولت کے ساتھ ذاتی طور پر آپ سے جوڑ دینا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ خود ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہونے والی 'براڈ کاسٹ' آپ کو سیدھے موبائل پر ملنے لگی ہے۔ یعنی آپ نے ریڈیو اور ٹی وی کو بھی اپنے جیب میں رکھے موبائل میں قید کر لیا ہے۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ 'سوشل میڈیا' نے دیگر تمام ذرائع ترسیل کے میڈیم کے ساتھ— متعلقہ میدان میں اپنی خدمات انجام دینے کا کام بھی کیا ہے۔ مثلاً بینک سے پیسہ نکالنا ہو، کسی دوسرے مقام پر ٹیکسی پہنچانا ہو، گھر پر سامان منگانا ہو، اسکول یا کالج میں داخلہ لینا ہو، پاسپورٹ بنوانا ہو، یا ریل و ہوائی جہاز کا ٹکٹ بنوانا ہو، ہر طرح کی خدمات موبائل کی مدد سے آپ کے ہاتھوں میں موجود رہتی ہیں۔

اب آیئے 'سوشل میڈیا سے اردو کا رشتہ جوڑا جائے۔ دراصل موبائل، تصاویر و کارٹون کی زبان کے ساتھ ٹائپ کی زبان سمجھتا ہے یا اس کی سہولت دیتا ہے۔ آپ کمپیوٹر میں جو زبان جس طرح ٹائپ کر سکتے ہیں قریب قریب یہی سہولت و طریقہ موبائل میں موجود ہوتا ہے تو کیا سوشل میڈیا کے تمام چینل وہاٹس اپ، ٹویٹر، بلاگ، فیس بک پر) اردو میں ٹائپ کر سکتے ہیں۔ اگر ہاں تو اردو زبان جاننے والوں کی تعداد میں اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ دوسرا، اردو زبان کا رشتہ سوشل میڈیا سے، خود اردو زبان و ادب کے

> **'سوشل میڈیا' نے دیگر تمام ذرائع ترسیل کے میڈیم کے ساتھ— متعلقہ میدان میں اپنی خدمات انجام دینے کا کام بھی کیا ہے۔ مثلاً بینک سے پیسہ نکالنا ہو، کسی دوسرے مقام پر ٹیکسی پہنچانا ہو، گھر پر سامان منگانا ہو، اسکول یا کالج میں داخلہ لینا ہو، پاسپورٹ بنوانا ہو، یا ریل و ہوائی جہاز کا ٹکٹ بنوانا ہو، ہر طرح کی خدمات موبائل کی مدد سے آپ کے ہاتھوں میں موجود رہتی ہیں۔**

Content کو فیڈ (Feed) کرنے کا ہے۔ تمام لائبریریوں کے خزانے اور ذخیرے کیا ہم سوشل میڈیا پر ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس سے اردو کے فروغ میں مدد ملے گی۔

اردو شاعری کو سوشل میڈیا کے بہوتیرے چینل پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعری کو سکھانے اور ترغیب دینے کے پروگرام بھی مختلف چینل پر مزید بڑھائے جا سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے حال ہی میں یوٹیوب (You tube) پر 'فلموں کی جادوئی دنیا' کے نام سے کچھ Download کیا ہے ان میں فلموں سے اردو کے رشتہ کی بھی بات کی گئی ہے یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔

حالانکہ 'جشن ریختہ' جیسی ادبی تنظیموں نے سوشل میڈیا پر نمایاں پہچان بنائی ہے۔ مختلف مشاعرے اور ادبی پروگراموں کی تفصیل بھی ہمیں مختلف جگہوں پر سوشل میڈیا کے ذریعے دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

'جہانِ اردو' اور 'کتابوں کی دنیا' کے ذریعے اردو کتب کی جانکاریاں اور اُن کے خرید و فروخت کے راستے میں مدد کی جا رہی ہے۔ 'جہانِ اردو' میں اردو سے متعلق بات و بحث کا چینل ہمیں یقیناً ملتا ہے۔ لیکن ان تمام راستوں کی بھی محض شروعات جیسی ہے۔ ہمیں سوشل میڈیا پر اور سوشل میڈیا کے ذریعے اردو کے استعمال کے تمام راستے ڈھونڈھنے اور اپنانے کی ضرورت باقی ہے۔

■

Dr. Hisamuddin Farooqui
Indu-302, Chinar Fortune City
Hoshangabad Road
Bhopal - 462026 (MP)
Mob.: 7247579389

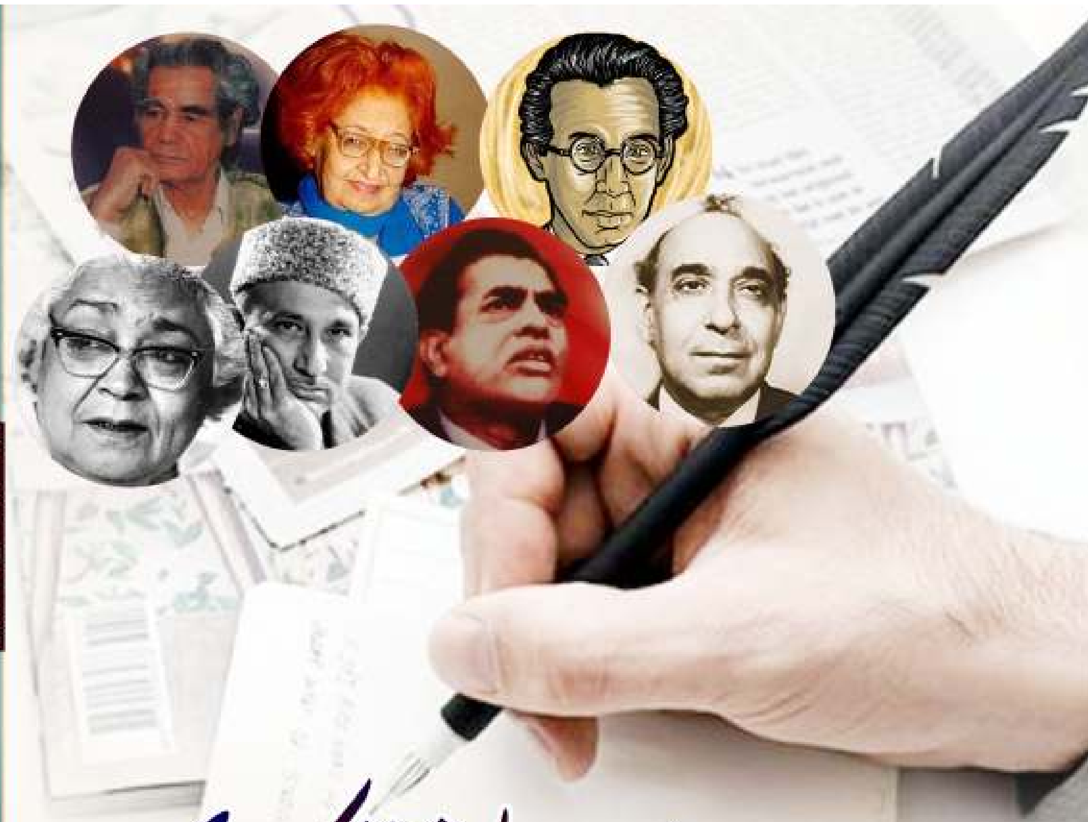

محمد رضا

رپورتاژ نگاری

وصی اللہ کھوکھر تحریر کرتے ہیں کہ:

"چشم دید واقعات کا ایسا بیان جو حقیقت کو مسخ کیے بغیر پر تخیل ادب کی تعریف میں آسکے۔" اسے رپورتاژ سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل لفظ رپورتاژ فرانسیسی زبان کے لفظ 'Rapportage' کی تاریدہے جس کے معنی خفیہ رپورٹ کے ہیں۔ (جہانگیر اردو لغت، وصی اللہ کھوکھر، ص 809)

انگریزی زبان 'Reportage' سے اردو میں تصرف کے ساتھ داخل ہوا۔ عربی رسم الخط میں بطور اسم مستعمل ہے۔ رپورتاژ اسم معرفہ۔ مذکر ہے۔

(http://urdulughat.info/words/3304)

علی سردار جعفری 'رپورتاژ' کے بارے میں اپنے تاثرات کا اس انداز میں اظہار کرتے ہیں:

"یہ صنف ادب رپورتاژ بالکل نئی ہے۔ لیکن بے انتہا اہم ہے۔ یہ صحافت اور افسانہ کی درمیانی کڑی ہے۔ اور اس سے ہمارے ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ رپورتاژ ہمارے مقاصد کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔"

(علی سردار جعفری، پیش لفظ، خزاں کے پھول از عادل رشید، ص 11)

جس وقت ر زمانے میں قلمکار تحریر کر رہا ہے اس وقت کی بولی جانے والی زبان کا بھی استعمال اچھی رپورتاژ نگاری کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جو زبان ہم استعمال کریں وہ عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے الفاظ کے ساتھ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ واقعات اور حادثات میں متروک الفاظ وکلمات کا بکثرت استعمال کریں۔ غیر مستعمل الفاظ سے پرہیز کرتے ہوئے مستعمل اور ایسے جدید الفاظ کی مدد سے تزئین کاری کریں جو گزرے ہوئے وقت کی عکاسی کرتا ہو۔

رپورٹر کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ سامنے کی بات نیز سطحی باتوں کے ذریعہ فوراً نتیجہ اخذ کر لیتا ہے جبکہ آنے والے دنوں میں سچائی جب اس کے برعکس ہوتی ہے تو رپورٹرس معذرت کر کے بات کو ختم کر دیتے ہیں۔ اب تو عام سی بات ہو گئی ہے کہ تازہ رپورٹ کے مطابق یوں ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر رپورتاژ نگار کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ واقعات وحادثات کو سطحی نظر سے دیکھ کر فیصلہ کر دے بلکہ گزرے ہوئے واقعات، لمحات کی تہہ تک جائے اور تمام نکات کو عمدہ طریقہ سے تحقیق کر کے تجزیہ کرے۔ یہ بات بھی ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ جو تجزیہ ہم کر رہے ہیں اس کو سادگی کے پیراہن میں بالکل نہ پروئیں بلکہ اچھے، پرلطف اور دل کو موہ لینے والے انداز میں پیش کریں۔ بات کی تہہ تک جانے کے بعد ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے جیسے کہ رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد۔ 'حنا' رپورٹر کے مثل ہے اور گھسنے کے بعد جو رنگ آتا ہے وہ رپورتاژ ہے۔

جملے کی ہیرا پھیری سے، تخیلات کی تبدیلی سے بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ ایک واقعہ، ایک ہی منظر کو الگ الگ انداز میں پیش کر کے اپنی تحریر کے رنگ دوبالا بنا سکتے ہیں۔ ہاں تو آپ متوجہ ہیں! دیکھیے یہ وہ عجیب منظر!

- خونخوار شیر ہرن کا شکار نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی عاجزی کی علامت ہے۔
- چالاک ہرن نے برق رفتاری سے اپنی تیز رفتار چوکڑی کی مدد سے شیر کو مات دے دی۔
- شیر نے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا۔ جس کا فائدہ ہرن کو جیون دان کی شکل میں ملا۔
- شیر اپنے لنچ کے لیے دوڑ رہا تھا اس لیے ہار گیا۔ ہرن اپنی زندگی کے لیے بھاگ رہا تھا اس لیے وہ جیت گیا۔
- ہرن کی زندگی کے سامنے شیر کی بھوک نے دم توڑ دیا۔

یہاں اگر غور کیا جائے تو واقعہ ایک ہے مگر بیان اور رپورٹر کا انداز بالکل مختلف اور برعکس ہے۔ مختلف رپورتاژوں نے واقعات کی صداقت کو نظریات، تخیلات کے ذریعہ اپنے اپنے دلچسپ انداز میں پیش کر کے قارئین، ناظرین کو باندھے رکھا۔ اب عوام کے اوپر منحصر ہے کہ کس کو کس انداز میں پسند کرتا ہے۔

ڈاکٹر احتشام حسین کے نزدیک صنف رپورتاژ ادب کا حصہ تو ہے مگر اس کی شکل وصورت ابھی تک واضح نہیں ہو سکی ہے۔ تاجور سامری کی رپورتاژ ''جب بندھن ٹوٹے'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''رپورتاژ کو ہم واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔ ادب کی شکل نہ تو واضح ہے اور نہ اتنی پرانی کہ اس کے حدود متعین کیے جائیں گے۔''

(تاجور سامری، جب بندھن ٹوٹے، تعارف احتشام حسین ص 5)

لکھنؤ کی تاریخ، واقعات، حادثات، بلندی اور تنزلی کے مناظر کو بہت سے لوگوں نے قلمبند کیا مگر بعض کو شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے نیز کچھ خاص تحریر ایسی ہیں جن کو مکمل پڑھے بغیر سکون نہیں ملتا، کچھ تو ایسی ہیں جن میں بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے جب کہ وہ عمدہ اور تحقیقی ہوتی ہیں۔ تاریخ لکھنؤ میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے حوالے مرزا جعفر حسین نے لکھا اور ان کا انداز کچھ اور ہے۔ یہی تاریخ لکھنؤ اور اجڑتا ہوا اودھ کو'یادوں کی برات' میں جوش ملیح آبادی کی تحریر کا مطالعہ کریں تو ان کا انداز بالکل دلکش ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو پسند بھی آتا ہے کیونکہ انہوں نے تحریر کو نوک جھونک، نرالے انداز کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی حال رپورتاژ کا ہے ہمیں اس انداز میں لکھنا چاہیے کہ رپورتاژ مکمل ہو جائے تشنگی بھی باقی رہے نتیجہ تصور کی منزل میں نہ ہو بلکہ تصدیق ہو جائے۔

ڈاکٹر خلیق انجم 'اردو میں رپورتاژ نگاری' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اردو میں باقاعدہ رپورتاژ نگاری کا ارتقا ترقی پسند مصنفین کے ہاتھوں ہوا۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں لکھا ترقی پسند مصنفین کے ان جلسوں کی تفصیلی روداد اور ان کی فضا کو حمید اختر بڑی خوبی کے ساتھ قلم بند کرتے تھے۔ ہر جلسہ میں وہ بحیثیت سکریٹری انجمن کے گزشتہ ہفتے کی روداد پڑھتے تھے۔ عام طور سے سکریٹری کی رپورٹ ایک خشک اور رسمی سی چیز ہوتی ہے لیکن حمید اختر نے ان رپورٹوں میں بھی ادبی رنگ پیدا کر دیا اور اس طرح غالباً وہ ایک نئی ادبی صنف کے موجد سمجھے جا سکتے ہیں۔''

(مقدمہ، اردو میں رپورتاژ نگاری، ص 7)

رپورتاژ کو حا دثات، گزرے ہوئے واقعات کا ثمرہ کہا جا تا ہے۔ اس کا مطلب یوں سمجھ لیجیے کہ حیات انسانی کے ہر پہلو واقعہ، حا دثہ اور رنج و غم خو شی و فرحت کو آنکھوں دیکھا حال کی اس طرح منظر کشی کر نا کہ جذبات کی پوری طرح سے ترجمانی ہوجائے۔ منظر یا ما حول کا نقشہ دلکش انداز میں اجا گر ہو جائے۔ رپو رتاژ کے لیے یہ لا زمی ہے کہ فروعی اطلاعات کو چھو ڑتے ہوئے اصول اطلا عات کو لفظ بہ لفظ، ہو بہو یعنی جس طرح، جس شکل میں، جس وقت، جس ساعت، جس لمحہ میں دیکھیے اس کو بعینہ بیان کرے تبھی صحیح معنی میں رپو رتاژ کا حق ادا ہو گا۔ یا یوں کہا جائے تو کوئی مبا لغہ آرائی نہیں ہو گی کہ رو نما ہو نے والے واقعہ و حادثہ میں شمہ بھر بھی تبدیلی کے بغیر بیان کر دے۔

رپورتاژ کو حادثات، گزرے ہوئے واقعات کا ثمرہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یوں سمجھ لیجیے کہ حیات انسانی کے ہر پہلو واقعہ، حادثہ اور رنج وغم خوشی وفرحت کو آنکھوں دیکھا حال کی اس طرح منظر کشی کرنا کہ جذبات کی پوری طرح سے ترجمانی ہو جائے۔ منظر یا ماحول کا نقشہ دلکش انداز میں اجاگر ہو جائے۔ رپورتاژ کے لیے یہ لازمی ہے کہ فروعی اطلاعات کو چھوڑتے ہوئے اصول اطلاعات کو لفظ بہ لفظ، ہو بہو یعنی جس طرح، جس شکل میں، جس وقت، جس ساعت، جس لمحہ میں دیکھیے اس کو بعینہٖ بیان کرے تبھی صحیح معنی میں رپورتاژ کا حق ادا ہوگا۔ یا یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ رونما ہونے والے واقعہ و حادثہ میں شمہ بھر بھی تبدیلی کے بغیر بیان کر دے۔

شرر نے اجتماع کی اس روداد کے بارے میں لکھا جو 9 رمئی بروز یک شنبہ 1887 کو قیصر باغ لکھنؤ کے تاریخی میدان میں انجمن دار السلام کی جانب سے منعقد ہوا تھا۔ جس میں شرر کے مطابق بیس سے پچیس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ انھوں نے آنکھوں دیکھے مناظر زمانہ حال میں لکھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان پر شوق آنکھوں نے کیا دیکھا، ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی، نہیں دیکھا، نہیں دیکھ رہی ہیں۔ ہم ایک وجد کے عالم میں جھوم رہے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان خطیبوں کی معجز بیانیاں دلوں میں آگ لگائے دیتی ہیں۔ ایک طرف جناب منشی امتیاز احمد صاحب جوش وخروش کے ساتھ تقریر کر رہے ہیں، غصے میں ابھرنے والے خون کی طرح اسلامی جوش رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور بے ساختہ وجد میں آ کر مسلمانوں کے پر جوش ہجوم سے سبحان اللہ، جزاک اللہ۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ دوسری جانب مرزا محمد ہادی رسوا صاحب اپنی عالمانہ تقریر سے ایک بہت بڑی جماعت کو اسلام کا جان فروش خادم بنائے دیتے ہیں۔'' (دلگداز، اپریل 1888، ص 59)

رپورتاژ نگاروں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہرگز ہرگز یہ نہ دیکھے کہ اس کی رپورتاژ نگاری سے عوام یا زمانہ یا آئندہ وقت میں اس کے اثرات کیا مرتب ہوں گے۔ ہمت مرداں مدد خدا کے اصول پر چلتے ہوئے حق بیانی اور علمی لیاقت، فنی صلاحیت، تحریری مہارت، قلمی قوت سے گزشتہ مناظر کو رقم کر دے۔ رپورتاژ کے لیے سب سے عمدہ اور حالات حاضرہ میں بخوبی سمجھی جانے والی مثال کنٹری ہے۔ تمام شائقین ریڈیو رٹی وی پر برسوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ کرکٹ میں دلچسپی رکھنے والا ہر انسان کنٹری کو سنتا ہے مگر کبھی آپ نے غور کیا کہ کنٹری کو ہم اتنی غور سے کیوں سنتے ہیں؟ اس کی طرف ہمارا رجحان اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ کمانٹیٹر ایسے انداز میں اور موجودہ وقت کے کچھ طنز و مزاح کے ساتھ، تاریخ میں اس سے متعلق گزرے ہوئے واقعات کو شامل کرتے ہوئے کنٹری کرتا ہے یہ اس کی حسن بیانی ہے۔ جبکہ اگر آپ غور کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کھلاڑی تو اپنے سادہ انداز میں کھیل رہا ہے اس طرح کا کچھ مظاہرہ نہیں کر رہا ہے مگر کمانٹیٹر کھلاڑیوں کے حرکات وسکنات کو پر لطف انداز میں پیش کرتا ہے اور سامعین اور ناظرین خوشی سے جھوم جاتے ہیں۔ رپورتاژ نگاری کے فن کو سمجھنے کے لیے کنٹری بہترین مثال ہے۔

ترقی پسندوں نے رپورتاژ کے فن کو بہت دلچسپ بنا کر پیش کیا اور اس فن کو ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت دی گئی۔ جنہوں نے رپورتاژ لکھے ان کی باقاعدہ طور پر ماہنامہ رسالے رجریدے میں اشاعت ہوئی بعد میں جو طویل رپورتاژ تھے وہ کتابی شکل میں منظر عام پر آ گئے۔ اس بات کی تائید میں ہم عبدالعزیز کی کتاب کو بطور ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے مقدمے میں کچھ یوں تحریر ہے:

''سید سجاد ظہیر، کرشن چند، ابراہیم جلیس، تاجور سامری، عادل رشید، فکر تونسوی، جمنا داس اختر، انور عظیم، پرکاش پنڈت، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، شاہد احمد دہلوی، قرۃ العین حیدر اور نئے لوگوں میں قاضی عبدالستار،

سید ضمیر حسن دہلوی نے اہم مختصر، طویل رپورتاژ لکھے جو مختلف رسائل مثلاً 'شاہراہ'، ماہنامہ 'کتاب' وغیرہ میں شائع ہوئے۔طویل رپورتاژ مثلاً 'پودے'، 'خزاں کے پھول'، 'جب بندھن ٹوٹے'، 'ستمبر کا چاند' وغیرہ علیحدہ کتابی صورت میں سامنے آئے۔''

(اردو میں رپورتاژ نگاری، عبدالعزیز، ص 8)

قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ 'ستمبر کا چاند' کا مطالعہ کیا جائے تو اک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ میدان جنگ کے مختلف واقعات اوراس کی ہولنا کیاں، اقتدار کی عروجیت وشکست کے ہی مناظر نہیں پیش کیے ہیں، بلکہ جنگ کے اختتام پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ دیگر متعدد موضوعات ہیں جس پر رپورتاژ لکھے گئے ہیں مثلاً خشک سالی، آسمانی آفات، زلزلہ، وبائی بیماری وغیرہ وغیرہ میں جو تباہ کاریاں وجود میں آتی ہیں ان پر بھی رپورتاژ لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں۔

بامقصد رپورتاژ نگار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ زمان و مکان کا تعین اس انداز میں پیش کیا جائے کہ جو حقیقت بعض کی نظروں میں نہیں تھی وہ سب پر عیاں ہو جائے۔ رپورتاژ لکھنے کا سبب ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے گزری ہوئی صداقت کو دوسرے تک پہنچا سکے۔ یعنی عینی شاہد خیالوں میں اس مقام تک پہنچ چکا ہوتا ہے جہاں وہ واقعہ یا سانحہ رونما ہو چکا ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ہی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخی ترتیب بھی رپورتاژ کے لیے ضروری نہیں ہے۔اسی سلسلے میں کشمیری لال ذاکر 'یہ صبح زندہ رہے گی' میں رقمطراز ہیں:

''میں روزنامچہ یا تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں کہ تاریخ وار اپنی روداد تحریر کروں، میں تو صرف ایک رپورتاژ لکھ رہا

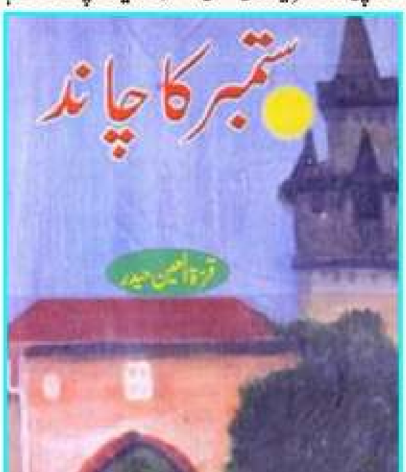

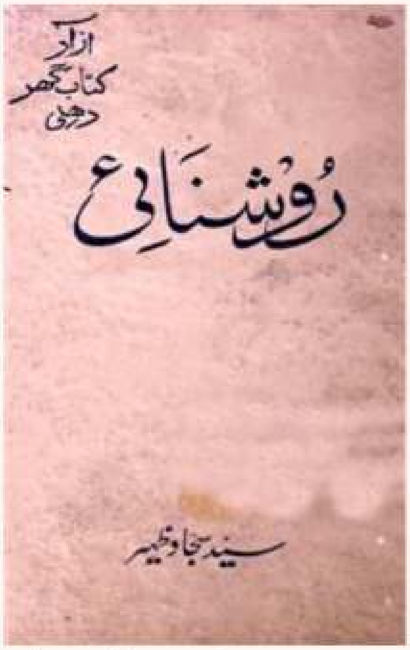

ہوں۔ اس میں تاریخوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے، جتنی شخصیات کی اور میرے تاثرات کی ہے۔لہٰذا تاریخوں پر میری توجہ کم رہے گی۔

(یہ صبح زندہ رہے گی، کشمیری لال ذاکر، ص 22)

مگر سچ تو یہ ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی اطلاع موصول ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات ضرور آتی ہے اور اسے وہ تلاش کرنے کی پوری کوشش کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ یا سانحہ کب اور کس جگہ رونما ہوا ہوگا۔قاری کے مطالعہ میں تیزی آجاتی ہے اور وہ بے چین سا رہتا ہے جب تک اسے زمان اور مکان کا پتا نہ مل جائے۔اگر اسے اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے تو وہ پرسکون حالت میں واپس آجاتا ہے۔اگر اسے وہ چیز دستیاب نہیں ہوتی تو وہ عالم تصور میں چلا جاتا ہے۔اسے قصہ یا کہانی سے تشبیہ دینے لگتا ہے ٹھیک اسی وقت رپورتاژ کا مقصد پامال ہو جاتا ہے۔جب سجاد ظہیر کا رپورتاژ جسے 'یادیں' کے نام سے جانا جاتا ہے اوراس کو اردو کا پہلا رپورتاژ مانا جاتا ہے۔اس کا آغاز ہی تاریخ سے ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔

'' 1935 عجب سال تھا۔ میں اس زمانے میں لندن میں اپنی طالب علمی کے آخری دن گزار رہا تھا۔''

(یادیں، سجاد ظہیر)

جبکہ ثریا حسین رپورتاژ کی وضاحت کرتی ہوئی تحریر کرتی ہیں:

''چند سال قبل ایک اردو روزنامے میں شعبہ اردو کے ڈاکٹر رفیق حسین نے لکھا تھا کہ اگرچہ کرشن چندر کے 'پودے' کو اردو کا پہلا ناول رپورتاژ کہا جاتا ہے لیکن یلدرم کے 'سفر بغداد' کو جو 1904 میں شائع ہوا، اردو کا اولین رپورتاژ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔زیارت قاہرہ وقسطنطنیہ 1911 یلدرم کا دوسرا رپورتاژ تھا۔''

(انتخاب سجاد حیدر، ص 20)

اس کے علاوہ اگر آپ اظہار اثر کو مطالعہ میں لائیں تو یہ بھی تاریخ کو اہمیت دیتے ہوئے قاری کو بھروسہ دلانے اوران کے اعتماد کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے رپورتاژ 'ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس' کی ابتدا کرتے ہوئے کچھ اس انداز میں مصروف تحریر ہیں:

''اور آخر ہندوستان کی دلہن دلی کا دل 17/ اپریل 1976 کو جگمگا اٹھا۔ دلی کا یہ دل جدید وقدیم تہذیبوں کا گنگا جمنی سنگم، بستی نظام الدین کا علاقہ ہے۔''

(ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس۔اظہار اثر)

رپورتاژ نگار کو کسی بھی رپورتاژ رقم کرنے سے پہلے صرف قوت سامعہ پر نور ایقان نہیں کرنا چاہیے بلکہ بصیرت پر اعتماد کرنے کے لیے نفسیاتی بصیرت کی مدد لینی چاہیے کیونکہ موجودہ وقت میں برقی رو کے ذریعے جو آواز فضا میں گونجتی ہے اس کو سننے کے لیے ایک خاص قسم کا آواز گیر آلہ ہوتا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سماعت پر نہیں بصارت سے کام لینا چاہیے۔ جیسا کہ طلعت گل اپنی کتاب 'اردو میں رپورتاژ کی روایت' میں تحریر کرتی ہیں:

''رپورتاژ نگار اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دل سے محسوس کرتا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ سنے سنائے واقعات وحادثات پر بھی رپورتاژ لکھا جاسکتا ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ رپورتاژ میں مصنف کا موضوع سے براہ راست تعلق بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور رپورتاژ کا بیان مستند مانا جاتا ہے۔''

(اردو میں رپورتاژ کی روایت: طلعت گل، ص 27، اپریل 1992)

محققین کے مطابق رویت حقیقتاً نظروں سے نہیں عقل سے ہوتی ہے۔ حواس خمسہ میں بصارت بھی شامل ہے جو بعض دفعہ دھوکا دے جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی بلند مقام یا پہاڑ کی اونچائی سے کسی انسان کو دیکھیں تو وہ ماچس کی ڈبیا کے مانند نظر آئے گا تو کیا رپورتاژ نگار اس کو بعینہٖ رقم کر دے جب کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل نے محسوس کیا ہے۔ جی نہیں بلکہ یہاں پر عقل سے کام لینا پڑے گا۔ یا یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ یہاں پر عقلی بصارت کی ضرورت ہے۔

■

Mohd Raza
Poora Rani, Near Iqra Public School
Mubarakpur
Azamgarh -276404 (UP)

رفیع الدین ناصر

آبی جانوروں کی دلچسپ دنیا

ہمارے اطراف میں ہمہ اقسام کے جاندار موجود ہیں جنھیں ہم مجموعی طور پر Bio-Diversity کہتے ہیں۔ ان میں جانور ہماری فطرت اور قدرت کی نیرنگی کے درمیان ایک پل ہیں جو اپنے وجود سے مسرتوں کی دنیا آباد کرتے ہیں اور ہمارے وجود کو خوشیوں سے مالا مال کرتے ہیں۔ خالق کائنات نے انسانوں کے ساتھ کئی ہزار کروڑ قسم کے پرندوں، چرندوں، حشرات الارض اور آبی حیوانات کو پیدا کیا اور ہر ایک کو الگ الگ خصوصیات سے نوازا جن کا مشاہدہ قدم قدم پر خالق کائنات کی بے کراں صناعی کو ظاہر کرتا ہے۔

ہمارے اطراف میں موجود سمندر عجیب وغریب جگہ ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں عجیب وغریب راز پنہاں ہیں جس میں سے آج بھی بیشتر راز ہماری دسترس سے دور ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں موجود چاند، تاروں کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں لیکن سمندری ثروت سے آج بھی ہم بہت دور ہیں۔ سمندر کے تعلق سے ایک بہت دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس میں حیاتی تنوع یعنی Bio-Diversity بہت وسیع ہے جو سمندر کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ یہ سمندری زندگی مختلف اقسام کی مچھلیوں وفقری اور غیر فقری حیوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ حیوانات بہت ہوشیار، چالاک اور ذہین ہوتے ہیں۔

آیئے ہم آپ کو سمندر کی گہرائیوں کی سیر کرا کر ان حیوانات سے متعارف کرانا چاہتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ یہ اس لیے دلچسپ ہیں کیونکہ یہ اپنی ذہانت اور ہوشیاری کی وجہ سے عجیب وغریب حرکات وسکنات کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سمندر کی Bio-Diversity کا انحصار بہت حد تک مچھلیوں پر ہے۔

ان ہی مچھلیوں میں سے ایک بہت مشہور مچھلی ہے 'ڈولفن'۔ اس مچھلی کا نام 'ڈولفن' ایک یونانی لفظ سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی 'رحم والی مچھلی' (Fish with Womb) ہے۔ اس کو عربی میں 'دفس' کہا جاتا ہے۔ 340 قبل مسیح میں ارسطو نے اس کو پستانیوں کی جماعت میں شامل کیا۔ ڈولفن کو یونانی لوگ مقدس مچھلی کہا کرتے تھے۔ یونانی دیو مالائی کہانیوں میں ڈولفن کو انسان کا دوست قرار دیا گیا ہے۔ سمندر میں جب کشتی آفت میں پھنس جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ جاندار کشتی کو کنارے پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ مشہور ادیب قزوینی نے بھی اپنی کتاب 'عجائب المخلوقات' میں اس طرح کا ایک قصہ نقل کیا ہے۔ یونان کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک شاعر Arion جب سمندر میں ڈوب رہا تھا تو ایک ڈولفن نے اس شاعر کو بحفاظت کنارے پہنچایا۔ ڈولفن ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ یہ بحر ہند میں انڈونیشیا سے آسٹریلیا اور بحر احمر کے تقریباً سارے علاقے میں موجود ہے۔ ڈولفن عجیب جانور ہے۔ اس کے جسم پر سوائے چند ایک مقامات کے بال نہیں پائے جاتے۔ ڈولفن کا دماغ سائز میں بڑا اور نوعیت میں پیچیدہ ہوتا ہے۔ انسانی حلقوں میں اس جاندار کی ذہانت معروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جاندار آئینے میں دیکھ کر خود کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعض سائنسدانوں نے انسان کے دماغ کے بعد کئی ایک وجوہات کی بنا پر ڈولفن کے دماغ کو دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ ڈولفن کی قوت سامعت، بصارت اور پیغامات پہنچانے کا نظام بہت ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ ڈولفن وہ سماجی جانور ہے جو گروپ کی شکل میں رہتے ہیں جن کو 'اسکول' کہا جاتا ہے۔ اس گروپ میں ان کی تعداد تقریباً 12 یا اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جاندار کسی بھی عمل کو تیزی سے سیکھ جاتے ہیں۔ یعنی بہترین نقال ہوتے ہیں اور کسی بھی زبان کے احکامات کو کسی قدر یا ضرورت کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ ڈولفن کی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے کرتب کے مظاہرے کیے جاتے ہیں جو بہت دلچسپ اور قابل تعریف ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بڑے عجیب وغریب جانوروں کو پیدا کیا۔ ان ہی جانوروں میں سے ایک 'اُڑنے والی مچھلی' بھی ہے جو اپنی شاندار پرواز کے ذریعے دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ پانی چھوڑ کر ہواؤں میں اڑنے والی اس مچھلی کو Flying Fish بھی کہا جاتا ہے۔ اس استخوانی مچھلی کا سائنسی نام Exocetus ہے۔ یہ مچھلی ایک وقت میں تقریباً 10 میٹر سے پون کلو میٹر تک کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس قدر فاصلہ یہ مچھلی صرف 45 سیکنڈس کے مختصر وقفے میں کئی اڑانوں کے ذریعے طے کرتی ہے۔ عام طور پر طے ہونے والے اس فاصلے کا دارومدار سمندری لہروں کی انجانی قوت اور سمندر میں اس مقام پر چلنے والی ہواؤں کی مشترکہ کیفیت پر ہوتا ہے۔ اڑنے کی شروعات میں یہ مچھلی اپنی دُم کی تیز حرکت سے اپنے اندر قوت بھرتی ہوئی اپنی دم کو نہایت طاقت سے پانی کی سطح سے ٹکراتی ہے اور چھلانگ لگانے کی مانند اونچا اڑ جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت اس کی دُم ایک سیکنڈ میں 10 سے زائد مرتبہ حرکت کرتی ہے تاکہ دُم میں قوت بھر جائے اور وہ اونچا اڑ جائے۔ مچھلی کے اڑان بھرنے کے دوران اس کے صدری زعنفے پنکھ بن کر کھل جاتے ہیں۔ جب اس مچھلی کی اڑان ختم ہوتی ہے تو یہ اپنے زعنفوں کو سکیڑ لیتی ہے اور پانی کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

Flying Fish روشنی کو کافی پسند کرتی ہے۔ چونکہ یہ مچھلی روشنی سے بہت حساس ہوتی ہے اس لیے اس کی آنکھیں اس مقصد کے لیے مناسب انداز میں تخلیق کردہ ہوتی ہیں اور روشنی کی موجودگی میں اس جانب راغب ہوتی ہے۔ پھر پانی سے باہر سر نکال کر اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑانے کے لیے تیار کر لیتی ہے۔ یہ بہت قابل دید منظر ہوتا ہے۔ سمندر میں جب مچھیرے یہ کیفیت دیکھتے ہیں تو روزانہ دیکھنے کی عادت رکھنے کے باوجود مبہوت ہو جاتے ہیں اور اس کو پکڑنے کے لیے پانی میں دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ مچھلی عام طور پر ساحلی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ اس مچھلی کی پرواز سے متاثر ہو کر سائنسدانوں نے ہوائی جہازوں کو ترقی دینے کے کئی جتن سیکھے ہیں اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

آپ آکٹوپس (Octopus) سے یقیناً واقف ہوں گے۔ اس میں ایک بہت اہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں اپنے جلد کا رنگ اور نوعیت بدلنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ آکٹوپس اپنی اس صلاحیت کا استعمال کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ ساتھ میں وہ اپنی حفاظت کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

یہ قدرت کی عجیب کاریگری ہے کہ بعض دفعہ خوشنما چیزوں میں زہر بھر دیتا ہے اور ایسی چیزوں کو سکون کا ذریعہ بنا دیتا ہے جو حسن کی دولت سے مالا مال نہیں رہتے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں 28,000 سے

زائد اقسام کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن میں سے 1200 سے زائد مچھلیاں زہریلی ہوتی ہیں۔ اب ہم آپ کو اس طرح کی ایک زہریلی مچھلی کے بارے میں بتانے جارہے ہیں جس کو 'اسٹون فش' (Stone Fish) کہتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام Synanceia trachynis ہے۔ اس مچھلی کا رنگ سبز مائل ہوتا ہے۔ اس مچھلی کی پیٹھ پر 13 عدد کانٹے پائے جاتے ہیں جو نہایت خوشنما ہوتے ہیں لیکن ان کانٹوں میں خطرناک زہر پایا جاتا ہے۔ اسٹون فش عام طور پر آسٹریلیا میں Corel Reefs میں یا اس کے نزدیکی علاقے یا دلدل میں وحشی حالت میں رہتی ہے۔ کبھی کبھی یہ مچھلی ریت میں دبی ہوئی حالت میں بھی پائی جاتی ہے۔ دور سے دیکھنے پر یہ مچھلی پتھر جیسی نظر آتی ہے۔ شاید مسلسل پتھریلے علاقے میں رہنے کے باعث یہ مچھلی پتھر نما نظر آتی ہے۔ اس مچھلی کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اپنے کسی ادا کے تحت زہر کا اخراج عمل میں نہیں لاتی بلکہ جب کسی انسان یا دوسرے جانور کا پیر اس کے کانٹوں پر آجاتا ہے تو یہ مچھلی بلا ارادہ زہر کا اخراج کرتی ہے۔ اس کے ہر ایک کانٹے میں موجود غدود سے زہر کا اخراج ہوتا ہے اور اگر اتفاق سے اس کا کانٹا چبھ جائے تو اس کے زہر کی وجہ سے شدت کا درد پیدا ہوتا ہے۔ زخم کے اطراف کی بافتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ عضلات میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ جسم ڈھیلا ہو جاتا ہے اور انسان تڑپ تڑپ کر صرف دو گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی خدا کا عجیب و غریب انتظام ہے کہ اس کے زہر کے اثر کو اگر فوری زائل کرنا ہو تو 45 ڈگری سینٹی گریڈ گرم پانی سے زخم کو دھو لیجیے۔ زہر کا اثر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی قدرت کا عجیب انتظام ہے۔ اس مچھلی کی دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نہایت تیزی سے شکار کو نوالہ کی شکل میں ہڑپ کر لیتی ہے۔ اس کے لیے اس کو بمشکل تمام ایک سیکنڈ کا صرف 15 واں حصہ درکار ہوتا ہے۔

سمندر کی دنیا عجیب و غریب مخلوقات سے بھری پڑی ہے۔ ان ہی میں سے ایک سمندری گھوڑا یا Sea Horse ہے جس کو سائنسی طور پر Hippocampus کہا جاتا ہے۔ ایک عرصہ تک سائنسدان یہ سمجھتے رہے کہ یہ مچھلی نہیں ہے لیکن بعد کی تحقیقات نے اس کو مچھلی ثابت کیا۔ اس مچھلی کی پہلی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی آنکھیں 360 ڈگری پر گھوم سکتی ہیں اور دونوں آنکھیں اپنا کام علاحدہ علاحدہ انجام دیتی ہیں۔ یہ مچھلی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی جانب تیرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ گھوڑے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اسے سمندری گھوڑا یا Sea Horse کہا جاتا ہے۔ اس کی دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دنیا کا واحد حیوان ہے جس میں نر حمل کی صعوبتوں سے گذرتا ہے اور نئی نسل کی بقاء کرتا ہے جو قدرت میں رائج طریقے کے برعکس ہے۔ لیکن یہ قدرت کی ایک نشانی ہے۔ دورانِ حمل اس کی مادہ مچھلی ہر صبح آ کر 'نر مچھلی' سے ملتی ہے۔ 'نر' کے ساتھ تقریباً پانچ چھ منٹ تک تبادلہ خیال کرتی ہے اور حال چال پوچھ کر رخصت ہو جاتی ہے لیکن دوسری صبح پھر آ کر پہنچتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ انڈے سے بچے باہر نہیں آجاتے۔ مادہ مچھلی کے چلے جانے کے بعد 'نر مچھلی' انڈوں کی پرورش اور اپنی غذا کے حصول کے انتظامات میں لگ جاتا ہے۔

Sea Horse کے خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک اور دلچسپ مچھلی ہے جسے 'سمندری برگی اژدھا' یعنی Leafy Sea Dragon کہا جاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام Pnycoduras eques ہے۔ یہ مچھلی 18 تا 20 انچ لمبی ہوتی ہے جس کے جسم پر نازک پتوں جیسی ساختیں پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے تیرنے کے دوران یہ اژدھے جیسی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس کو سمندری برگ اژدھا Leafy Sea Dragon کہا جاتا ہے۔ اس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سست رفتار سے سمندر میں تیرتی ہے اور جب یہ تیرتی ہے تو بڑی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پتوں بھرا ایک چھوٹا پودا ہے جو خراماں خراماں تیرتا ہوا کہیں چلا جارہا ہے۔

آئیے اب ہم آپ کو ایک اور دلچسپ مچھلی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس مچھلی کو Cleaner Fish کہا جاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام Labroides dimidiatus ہے۔ یہ مچھلیاں گروہ کی شکل میں اپنی رہائش گاہ پر چھ گھنٹے میں تقریباً چھ سو مچھلیوں کی صفائی کا فرض نبھاتی ہیں۔ جو مچھلیاں ان سے اپنا جسم 'گلپھڑے' 'حلق' دانت وغیرہ صاف کراتی ہیں۔ ان میں بڑی خونخوار شکاری مچھلیوں کے علاوہ ان کی معاون طفیلی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن قدرت کی حیرت زدہ کرنے والی یہ عجیب خوبی ہے کہ صفائی کی خدمت کرانے والی مچھلیوں میں کوئی ایک بھی Cleaner Fish کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ وہ تمام صفائی کے وقت بہت تعاون کرکے شرافت کا ثبوت دیتی ہیں۔ یہ مچھلیاں 'بحرالکاہل' بحر ہند کی تہوں میں پائی جاتی۔ کام کے وقت ان کا انداز ایک مشاق رقاصہ کی مانند ہوتا ہے۔ اس مچھلی کی دوسری عجیب و غریب بات یہ ہے کہ یہ ننھی منّی چار انچ لمبی مچھلیاں اپنی طبعی عمر کے درمیان اپنی جنس اور موقعے کے لحاظ سے حالات کے پیش نظر شکل و شباہت بھی بدل لیتی ہے۔ یعنی مادہ مچھلی نر میں تبدیل ہوتی ہے۔ ان ننھی منّی مچھلیوں سے ذراہٹ کر اگر ہم سمندری دنیا پر نظر ڈالیں تو سمندر میں ہمیں ایک بڑا وزنی جانور دکھائی دیتا ہے جو دیکھنے میں ایک دستی تھیلی کی شکل کا ہے جس میں کچھ بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسے 'والرس' کہا جاتا ہے۔ اس کے چہرے کے سامنے ہاتھی جیسے دو دانت موجود ہوتے ہیں۔ اوپری حصے میں سخت قسم کی مونچھیں ہوتی ہیں۔ یہ ایک اچھا تیراک ہے جو سمندر کی تہہ تک غوطہ لگاتا ہے۔ اس کی غذا سمندری مچھلیاں اور پودے ہیں۔ جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو یہ چٹانوں پر آرام کرنے جاتے ہیں۔ سونے کے دوران دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ آپسی میل جول کے ساتھ سوتے ہیں اور جب سب سو جاتے ہیں تو ان میں سے ایک والرس جاگ کر چوکنا رہتے ہوئے پہرے دار بنتا ہے اور خطرے کا احساس ہوتے ہی ایک والرس بھاگتا ہے تو باقی سبھی اس کے پیچھے بھاگ جاتے ہیں۔

سمندری دنیا میں ایک ایسی مچھلی بھی پائی جاتی ہے جو تقریباً 600 سے زائد وولٹ کے کرنٹ کا اخراج کرتی ہے۔ اس لیے اس مچھلی کو برقی مچھلی یا Electric Eel کہا جاتا ہے جس کا سائنسی نام Elechophorus electricus ہے۔ اسی برقی مچھلی میں کرنٹ ان کے جسم میں موجود جوڑی دار اعضا سے خارج ہوتا ہے جس کو Hunters Organ اور Sach's Organ کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان میں 6000 سے زائد ڈسک نما خلیے پائے جاتے ہیں جن میں Electrocytes خلیے پائے جاتے ہیں جس سے یہ الیکٹرک کرنٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ خلیے بیٹری کی طرح جمع رہتے ہیں اور بیٹری کی طرح ہی کام کرتے ہیں۔ یہ خلیہ کم مقدار میں کرنٹ پیدا کرتا ہے لیکن جب سب خلیوں کا کرنٹ جمع ہو جاتا ہے تو اس کی مجموعی شدت 600 وولٹس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس مچھلی کا سر مثبت پول اور دم منفی پول کے طور پر کام کرتی ہے۔ اگر ہم اس مچھلی سے پیدا ہونے والے کرنٹ کو دوسرے طریقے سے ناپیں تو ایک 20 فٹ لمبی مچھلی اس قدر کرنٹ پیدا کر سکتی ہے کہ ہم اپنے گھر کے 12 بلبس روشن کر سکتے ہیں۔

ہم جوں جوں سمندر کی گہرائیوں میں پہنچتے جائیں گے توں توں ہمیں نئی معلومات ملتی جائیں گی اور قدرت میں پنہاں ان بے شمار رازوں سے پردا اٹھتا جائے گا۔ ہماری دلچسپیاں اور بڑھتی جائیں گی اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

■

Dr.Rafiuddin Naser
Botany Department, Maulana Azad College
Dr. Rafiq Zakaria Campus, Rauza Bagh
Aurangabad (M.S.) 431001
Email-mrnaser2000@yahoo.com
Mobile-9422211634.

نسیم سعید

سائنس

مصنوعی ذہانت اور اس کے استعمالات

ہم اپنی عملی زندگی میں جو کچھ دیکھتے، سمجھتے، سیکھتے، جانتے اور اُس پر کچھ اپنا عملی تجربہ کرتے ہیں تو اُس سے ہمیں فائدہ پہنچتا ہے۔ صرف تعلیم سے یا معلومات سے ہماری زندگی خوشحال اور ترقی یافتہ نہیں بنتی۔ بلکہ اُس میں قلم کے ساتھ ہی ہنر مختلف فنون، اپنی مہارت، کارکردگی، صلاحیتوں، لیاقتوں، خوبیوں اور قابلیتوں کا صحیح استعمال کرنے سے بنتی ہے۔ آج زیادہ تر طالب علم بحالت مجبوری اپنی پسند کے شعبے کا انتخاب نہ کرتے ہوئے دیگر شعبوں میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ مگر اُن کی اپنی دلی تمنا کچھ اور ہوتی ہے۔ آج ہر لمحہ جدیدیت کے اس دور میں طلبہ و طالبات کو مختلف شعبے اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں جس کا ہم گمان و تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اُن ہی میں سے ایک شعبہ ہے ڈیجیٹل بازار کا۔ ڈیجیٹل مارکٹنگ انجینئر مطلوبہ کمپنی کی ڈیجیٹل پالیسی کو عمل میں لانے سے متعلق صلاح دیتا ہے یا وہ پھر خود اُس پر عمل کرتا ہے۔ اُسے انٹرنیٹ، ٹیکنالوجی، مارکٹنگ، سوشل میڈیا اور ان سب کے وسیع و عریض استعمال کی باریک بینی سے معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اُسی طرح سے تعلیم کے میدان میں جو بالکل نیا رجحان ہے اس میں سے Spiritual Learning کے ذریعے Transformative leadership ایک ہے۔ Spiritual Learning یعنی روحانیت کی گہرائی سے حاصل شدہ اصولوں سے علم طب، علم نفسیات، تجارت اور تعمیراتی فنون میں اطمینان بخش نتائج دریافت کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تعلیم کے میدان میں بھی آنے والی دشواریوں اور مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسل جدید ان نصابات کے توسّط سے Quantum y integrative Psycholog اور Quantum economics and business کا انتخاب کر کے اپنے مستقبل کو سنوارنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس شعبے میں قدریہ سائنس (Quantum Science) اور روحانیت، مکمل صحتی نظام، توانائی کی دوا (Energy medicine)، Spiritural قیادت، موسیقی اور مطالعہ کے ذریعے انسانیت کی فلاح و بہبودگی کے لیے کام کرنے والوں میں یہ شعبہ پہلی پسند بنا ہوا ہے۔ اس طرف پیشہ ورانہ لوگ بھی شامل ہو کر اپنی کارکردگی میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں بھی computer application & programming کا دور تھا۔ ہر کوئی اُس طرف متوجہ تھا مگر اب چیزوں کا انٹرنیٹ (IOT) (Internet of things) اور مصنوعی ذہانت (AI) Artificial intelligence نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اب اسمارٹ فون اور آپس میں ربط کیے ہوئے آلات (Devices) کا زمانہ ہے۔ اس لیے نیٹ ورکنگ پر کام کرنے کے لیے ایک وسیع و عریض میدان ہم سب کا منتظر ہے۔ نیٹ ورکنگ کا ہنر رکھنے والوں کی آج چھوٹی بڑی صنعتوں میں سخت ضرورت ہے۔ وہیں آج آٹو موبائیل، الیکٹریکل، بینکنگ اور سافٹ ویئر کی صنعتیں اس کے بغیر نامکمل ہیں۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج تعلیمی شعبہ صرف سائنس، کامرس اور ادب (Humanities) جیسی تقسیم شدہ شاخوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ اب کئی شاخوں کا سنگم ہے۔ ورنہ کون سوچ سکتا تھا کہ Quantum Physics کے ساتھ روحانیت کے میل سے ملازمت کا ایک نیا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ آج نئی نسل کو یہ پتہ ہے کہ وہ کیا بننا پسند کرتی ہے اور اس کا راستہ کون سا ہے۔ ان سب کے باوجود آج تعلیمی شعبے میں Skill Gap بہت زیادہ ہے جو AI , Spiritual Learning اور IOT پر عبور حاصل کرنے سے ہی پُر ہوگا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس تیز رفتار دور میں کمپیوٹر اور کمپیوٹر پروگرامنگ (Programming) کو وہ مقام حاصل ہے جس کی بدولت دُنیا آج ترقی کے زینے طے کر کے نئی بلندیوں کو حاصل کر رہی ہے۔ دُنیا کے جدید ترین علوم اور طاقتور تکنیکی پروگرام کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت جس شئے میں موجود ہے وہ کمپیوٹر اور اس کا اطلاق (Appliance) ہے۔ اُس کی ہی ایک نئی شاخ کا نام ہے AI یعنی مصنوعی ذہانت۔ مصنوعی ذہانت فنی صلاحیتوں سے لبریز مشینوں کی آلہ سازی سے متعلق کمپیوٹر سائنس کا ایک شعبہ ہے۔ بغیر انسانوں کے کمپیوٹر سائنس کے ذریعے خصوصی، فنی اور ہدایتی صلاحیتوں کا مشینوں کے ذریعے استعمال خاص طور سے روبوٹ کے ذریعے آج مصنوعی ذہانت کی بدولت ممکن ہے۔

گذشتہ کئی سالوں سے شعبہ مصنوعی ذہانت میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی کی دریافت اور اُس کا استعمال اس کے خاص اسباب ہیں۔ آج یہ گہرائی سے بھی

سائنس

اور مطالعہ کی جانے والی تعلیم کی ایک اہم شاخ میں شمار ہے۔ایک ایسی شاخ جو بڑی تعداد میں Pattern سے مربوط اعداد وشمار (Data) کو سمجھنے کے لیے Net work کے نظام کا استعمال کرتی ہے۔ سافٹ ویئر بنانے میں یہ تکنیک کافی کار آمد ثابت ہوتی ہے۔عصر حاضر میں کسی بھی سافٹ ویئر کو ایک دستکاری (Craft) یا کاریگری کی شکل میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

جس تیزی سے زندگی کے ہر ایک شعبے میں مصنوعی ذہانت کا استعمال بڑھ رہا ہے وہ ملازمت کی تلاش کرنے والے لوگوں کے لیے یقیناً ایک مثبت اشارہ ہے۔مصنوعی ذہانت میں ایک کمپیوٹر پروگرام خود کو دیے جانے والی ہدایتوں کو سمجھنے کے بعد انھیں ذخیرہ (Store) کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر مستقبل کی ضرورتوں کو سمجھتے ہوئے اپنا نتیجہ (Result) و اشارہ (Hints) پیش کرتا ہے۔کسی پروگرام کے بار بار استعمال کے بعد وہ اپنے کام کرنے کے الگورتھم (Algorithm) کو بدلتا ہے اور زیادہ اچھے نتائج ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اصل میں روبوٹکس (Robotics) کی دُنیا کو مصنوعی ذہانت نے پوری طرح بدل دیا ہے۔ کیونکہ ابھی تک جو فولادی (Robot) صرف طے شدہ کام ہی کر پاتے تھے۔مصنوعی ذہانت کی بدولت اُن میں نیا سیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔جسے بنیاد بنا کر وہ بار بار کیے جانے والے کاموں میں اپنی غلطیوں، خامیوں اور نقائص کی اصلاح کرتا ہے اور پھر خریدار (Client) یا صارف کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے کام کو انجام دیتا ہے۔

مصنوعی ذہانت کی اہمیت وافادیت سے آج کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔بہتر ذیلی سیاروں اور زیادہ طاقتور ریاضیاتی ماڈل کے استعمال کے توسط سے موسمیات کی پیشن گوئی کرنے کی سمت میں اس کے ذریعے سے کافی اصلاح ہوئی ہے۔لیکن زلزلوں کی پیشن گوئی ہمیشہ غلط ہی ثابت ہوئی ہے۔مگر سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ مصنوعی ذہانت کے نظام کے ذریعے یہ پتہ لگانا آسان ہوسکتا ہے کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا۔مصنوعی ذہانت کے تعاون سے زلزلوں کے ڈاٹا کا بڑی تعداد میں تجزیہ شاید زلزلوں کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔اس کے مطالعے کی بنیاد پر زلزلے کا طور طریقہ، کب اور کہاں آئے گا جیسے امکانات کے علاوہ زیادہ قریبی اندیشہ وخدشہ معلوم ہوسکتا ہے۔جس کی بنا پر قبل از وقت ہی اُس سے متعلق ضروری آگاہی فراہم ہو سکتی ہے۔کیونکہ سائنسدانوں کے مطابق زلزلے کا اعداد وشمار (Seismic Data) ویسا ہی ہے جیسے کہ آواز کا اعداد وشمار

آج اس تکنیک کا سب سے اہم استعمال دشمنوں کی سر گرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ میدان جنگ میں ہونے والی لڑائی کا نقشہ اب اس کی وجہ سے بدلنے کے قریب ہے ۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس پر عمل درآمد ہوئے کئی دہائی بیت چکی ہے۔ امریکہ بغیر انسانی دخل کے ڈرون کے ذریعے اپنے دشمنوں کو نشانا بنا کراُن کا صفایا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ڈرون بغیر انسان کے مصنوعی ذہانت کی مددسے کام کرسکتے ہیں۔ ڈرون کی کمانڈ میدان جنگ سے دور کنٹرول روم میں بیٹھے آدمی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔سٹیلائٹ کی مدد سے یہ دونوں آپس میں رابطہ رکھتے ہیں۔

(Audio Data)۔میدان جنگ میں ہتھیاروں، اسلحوں کا حسب ضرورت خود بخود استعمال آج مصنوعی ذہانت کی بدولت ممکن ہوا ہے۔حفاظتی نظاموں کی تعیناتی اور بغیر انسانوں کی موجودگی کے میدان جنگ کے نقشوں پر قابو رکھنا اس کے ذریعے آسان ہوا ہے۔مصنوعی ذہانت کے ذریعے تیار کردہ ڈرون خود ہی گولہ باری کے مقصد کو طے کر لیتا ہے۔اب ایسے ٹینکوں کی نمائش عام ہوگئی ہے جس کے اندر فوجیوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔شاید مستقبل کی جنگوں میں انسانوں کا کم سے کم استعمال ہو یا نہیں ہو، ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔لیکن فی الحال ہتھیاروں سے لیس ٹینکروں کی میدان جنگ میں پہنچ اب تصوراتی نہیں ہے۔یوں کہہ لیں کہ زندگی اور موت کے فیصلے اب سافٹ ویئر اور الگورتھم کے ہاتھوں میں پہنچنے کے امکانات ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

آج اس تکنیک کا سب سے اہم استعمال دشمنوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔میدانِ جنگ میں ہونے والی لڑائی کا نقشہ اب اس کی وجہ سے بدلنے کے قریب ہے۔ترقی یافتہ ملکوں میں اس پر عمل درآمد ہوئے کئی دہائی بیت چکی ہے۔امریکہ بغیر انسانی دخل کے ڈرون کے ذریعے اپنے دشمنوں کو نشانا بنا کراُن کا صفایا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ڈرون بغیر انسان کے مصنوعی ذہانت کی مدد سے کام کر سکتے ہیں۔ڈرون کی کمانڈ میدان جنگ سے دور کنٹرول روم میں بیٹھے آدمی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔سٹیلائٹ کی مدد سے یہ دونوں آپس میں رابطہ رکھتے ہیں۔ڈرون میں لگے کیمرے اور اس میں لگے کمپیوٹر سے کنٹرول روم میں بیٹھا آدمی مناسب اور صحیح وقت پر نشانہ ملنے کے بعد دشمن پر حملہ کر دیتا ہے۔اس تکنیک کے استعمال کی وجہ سے جوانوں کی جان کا خطرہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ترقی پذیر ممالک خصوصاً ہندوستان میں بھی اس منصوبے پر عمل کرنے کے ساتھ ہی تحقیق وفکر جاری ہے کہ مصنوعی ذہانت کی مدد سے بغیر انسان کے ٹینک، توپ، طیارے اور روبوٹک ہتھیاروں سے فوجوں کو کیسے لیس، مزین اور آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ آج ہندوستان شعبہ مواصلات واطلاعات میں کافی آگے ہونے کی بنا پر مصنوعی ذہانت سے متعلق گنجائشوں کی ترقی کے لحاظ سے مستقبل میں ایک عظیم طاقت بننا طے ہے۔

لیکن اسلحوں پر قابو، انسانی حقوق کی بحالی اور ٹیکنالوجی کا صحیح استعمال جیسے مدعوں پر نظر ثانی کرنے کے لحاظ سے مصنوعی ذہانت کا غلط استعمال خلاف توقع ہوسکتا ہے۔اگر دُنیا الگورتھم کے توسط سے بندوبست کرنے اور ہتھیاروں کی دوڑ میں لگ گئی تو یہ تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔دراصل ہتھیار ہمارے اجتماعی تحفظ کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر اُس کا صحیح استعمال یقیناً انسانی تعمیراتی پہلوؤں کو زیادہ روشن بنا سکتا ہے۔ڈرون کا جا بجا استعمال خصوصاً غذا، دوا، تصویر کشی، کاشتکاری، جنگلات جیسے شعبوں میں دن بہ دن اضافہ فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔دراصل ڈرون نے اب ہوابازی یا طیرانی تجارت کی ایک شکل اختیار کر لی ہے۔حالانکہ اس کے استعمال کے لیے کئی ملکوں میں اصول مرتب کیے گئے ہیں۔لوگوں کے اوپر، خاص عمارتوں، اسکولوں، اسپتالوں جیسے کئی علاقوں میں ڈرون اُڑانے کی اجازت نہیں ہے۔کئی مقامات پر ڈرون کی پرواز کے لیے سول طیران اتھارٹی یا شہری ہوا بازی اختیار (Civil Aviation Authority) کی منظوری لینا ضروری ہے لیکن اس کے باوجود کئی شعبوں میں اب اس کا استعمال روزمرّہ کی بات ہے۔

ہمارے ملک میں ذریعہ معاش کے لحاظ سے دوسرے شعبوں کے لحاظ سے اس نئے شعبے میں ملازمت حاصل کرنے کے بہترین مواقع موجود ہیں۔Research & Advisory firm گارٹنر (Gartner) کے مطابق سال 2020 تک مصنوعی ذہانت کے شعبہ میں 2.3 ملین اسامی کی ضرورت ہے۔کہا جاتا ہے کہ سال 2020 تک اس کی ضرورت آج کے مقابلے تین گنا ہ زیادہ ہو جائے گی۔ اصل میں جس تیزی سے اب ہر ایک شعبہ میں مصنوعی ذہانت کا استعمال ہو رہا ہے وہ ذریعہ معاش حاصل کرنے والوں کے لیے ایک اضافی مثبت اشارہ ہے۔مثال کے طور پر 2018 کے اختتام تک ملک میں تھری ڈی پرنٹرس

(3D-Printers)، چیزوں کا انٹرنیٹ (Internet of things) کے ساتھ ساتھ قریب 2000 اسکولوں وکالجوں میں Tinkering Lab ہوگی تا کہ طالب علم اپنے سبق رٹنے کی بجائے تجربوں اور استعمالات پر توجہ مرکوز کرنا سیکھ لیں۔ معلوم ہو کہ عالمی تعلیم (Global Education) کے میدان میں تجربہ گاہ کے لیے استعمال ہونے والا جدید ترین نام ہی Tinkering Lab ہے۔ اُسی طرح شعبہ مالیات سے لے کر بجلی شعبہ تک میں مصنوعی ذہانت تیزی سے اپنا مقام طے کر رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں شعبہ زراعت، شعبہ پیٹرولیم، شعبہ ادویات اور ذرائع حمل ونقل جیسے روایتی شعبوں میں بھی ٹیکنالوجی اور ذہانت کے ساتھ ہی خوبیوں اور اوصاف میں اس سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذریعہ معاش اور ملازمت کی تلاش کرنے والے امیدواروں کے لیے ترقی کی منازل طے کرنے کی قوی امیدیں اور مستقبل اس کے سبب روشن نظر آتے ہیں۔

مستقبل قریب میں کارخانوں اور کمپنیوں کی ترقی کا دارو مدار اس بات پر منحصر رہے گا کہ مطلوبہ نظام ذہانت مشین اور انسانوں کی محنتوں کا کتنی اچھی طریقے سے مشترکہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کام کو بخوبی انجام دینے کے لیے Man-Machine teaming Manager جیسی ملازمت کے مواقع پیدا ہوں گے۔ جو مشین اور انسان کے درمیان تال میل اور روابط قائم کرنے کا فعل انجام دے سکیں گے۔ یہ لوگ انجینئرنگ اور انسانی وسائل دونوں کے بہترین اور باصلاحیت ماہرین ہوں گے۔ جو اپنی کمپنی کے لیے مشین اور انسانی صلاحیت دونوں کے عمدہ استعمال کی مشترکہ پالیسی مرتب کریں گے۔

مصنوعی ذہانت کے تعاون سے معاشی منصوبہ بندی کے لیے مستقبل قریب میں AI Business Developement Managers کی ضرورت گی۔ یہ پیشہ ور AI کو بنیاد بنا کر تجارت اور خرید وفروخت کی منصوبہ بندی تیار کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ یا پھر AI کا مرکزی کردار عالمی تجارتی منصوبہ بندی میں بحسن خوبی طے کریں گے۔ اخلاقی ذرائع والا افسر Ethical (Sourcing Officer) مصنوعی ذہانت کو لے کر بنائے گئے اخلاقیاتی (Ethics) اصول کو عمل میں لانے کا کام کریں گے۔ تا کہ اس کے غلط استعمال کو روکنے میں مدد ملے۔ یہ اخلاقی ہیکر (Ethical Hacker) سے ہی ملتا جلتا اور اُس کے جیسا کام ہوگا جو انٹرنیٹ اور برقی ذرائع ابلاغ پر مجرمانہ سرگرمی اور کوششوں کو روکنے کا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح اعداد وشمار پر مشتمل جاسوسی محرک قبول کرنے والے (Data detective sensors)، Biometric Monitors، روایتی تحسیب کے بنیادی ڈھانچے (Traditional computing infrastructure) سے پیدا ہونے والے اعداد وشمار کے مطالعہ سے تجارتی جوابات (Business answers) تیار کریں گے۔

ہندوستان کے فوجی شعبے میں بھی مصنوعی ذہانت کے استعمال سے مستقبل کی جنگ کو لے کر منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔ اس کا مقصد فوج کو انسان کے بغیر ٹینک، توپ، جنگی طیارہ اور روبوٹک ہتھیار مہیا کرانا ہے۔ مستقبل قریب میں بری، بحری اور ہوائی فوجی شعبوں میں اس کا استعمال سودمند ثابت ہوگا۔ یہ تیاری ہندوستان کی مستقبل کی نسلوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تکنیک پر منحصر خود بخود چلنے والی اور روبوٹک نظام پر انحصار کرنے والی ہوں گی۔ یعنی مستقبل کی جنگوں میں مصنوعی ذہانت کی بدولت بغیر انسان کے جنگی طیارہ، توپ، سٹیلائیٹ، ٹینک اور ہتھیار واسلحہ کا نظام عمل پذیر ہوگا۔ جس میں انسانی اشارے پر مصنوعی ذہانت کی بدولت خود بخود چلنے والا روبوٹک رائفل کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوگا۔

مصنوعی ذہانت کے ماہرین کی دلیلیں ہیں کہ انسان تھک جاتا ہے مگر مشین نہ تو تھکتی ہیں اور نہ ہی اکتاہٹ محسوس کرتی ہے۔ مشین خطرناک حالات میں بھی لڑسکتی ہیں۔ ان فوائد کے مد نظر انسانی جانوں کا خطرہ لیے بغیر ملک کا حفاظتی نظام مصنوعی ذہانت کے سبب مستحکم بنایا جاسکتا ہے۔ حساس سرحدوں، دہشت گردوں اور عدم تحفظ کے نظام کے خطروں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے تعاون سے روبوٹ کی ایک پوری فوج تیار کی جاسکتی ہے۔ جو سرحد پر دشمنوں سے دو۔دو ہاتھ کرسکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت کی وجہ سے روبوٹ، دوست اور دشمن میں بھی تمیز کرسکیں گے۔ اس سے ان روبوٹ کا استعمال دہشت گردی کے حادثات اور مدبھیڑ کو قابو میں کرنے کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان روبوٹ کو ایسی جگہوں پر بھی تعینات کیا جاسکتا ہے جہاں فوجی جوان خود کو تکلیف میں محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ان روبوٹ کی قیادت فوج کے جوانوں کے ہاتھ میں ہی ہوں گی۔

یہ ایک عام تصور ہے کہ مصنوعی ذہانت سے انسانی ذرائع ووسائل کی ضرورت کم ہوجائے گی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ہندوستان جیسا عظیم ملک اس سے کم ہی متاثر ہوگا۔ کیوں کہ مصنوعی ذہانت سے مشین کی مہارت بڑھے گی اور ساتھ میں ایسے لوگوں کی ضرورت میں بھی اضافہ ہوگا جواُن مشینی نظام کو بحسن وخوبی چلا سکیں گے۔ مصنوعی ذہانت کی وجہ سے ہندوستان میں پانچ خاص صنعتی اور خدمتی شعبوں میں تکنیک کا پرزور استعمال ہوگا۔ وہ شعبے اطلاعاتی تکنیک (IT)، پرچون (Retail)، شعبہ معاشیات (Finance)، کپڑے کی صنعت (Textile) اور آٹو سیکٹر ہیں۔ جہاں مصنوعی ذہانت کی بدولت روزگار کی ان گنت اسامیاں ہوگی۔

آج ہمارے ملک میں کئی ایسے عظیم ادارے موجود ہیں جہاں مصنوعی ذہانت کا مطالعہ کر کے ڈگریاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ملک میں IIT مدراس، IISC بنگلورو، حیدرآباد یونیورسٹی کے علاوہ بیرونی ملک میں کئی نامی گرامی ادارے موجود ہیں۔ حاصل بیان یہ ہے کہ اب مستقبل کے ہونہاروں کے لیے ترقی کا راستہ اس سے ہوکر گزرے گا۔

■

Naseem Sayeed
Sayeed Manzil
Haji Nagar New Yerkheda
Kamptee - 441001
Dist, Nagpur (MS)

محمد اسماعیل

ادبی کوئز

(1) 'پودے' کا تعلق کس ادبی صنف سے ہے؟
(الف) افسانہ (ب) ڈرامہ
(ج) رپورتاژ (د) انشائیہ

(2) اردو میں مغربی تہذیب کے خلاف طنزیہ شاعری کس نے کی۔
(الف) نظیر اکبرآبادی (ب) محمد حسین آزاد
(ج) حالی (د) اکبرالہ آباد

(3) اردو طنز کو سب سے زیادہ فروغ.....اخبار نے دیا۔
(الف) ہمدرد (ب) اودھ پنچ
(ج) الہلال (د) جامِ جہاں نما

(4) 'شعرالعجم'......زبان کے شعرا کی تاریخ ہے۔
(الف) فارسی (ب) اردو
(ج) عربی (د) ہندی

(5) شبلی کی ادھوری 'سیرت النبی' کس نے مکمل کی؟
(الف) سرسید (ب) مولانا آزاد
(ج) سید سلیمان ندوی (د) حسرت موہانی

(6) مزاح نگاری......کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت ہے۔
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) پطرس بخاری
(ج) کنہیالال کپور (د) فکر تونسوی

(7) 'چنگ درباب'......کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
(الف) مشتاق احمد یوسفی (ب) مرزا فرحت اللہ بیگ
(ج) کنہیالال کپور (د) عظیم بیگ چغتائی

(8) ہاسٹل میں پڑھنا......کا مزاحیہ مضمون ہے۔
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) پطرس بخاری
(ج) کنہیالال کپور (د) مجتبیٰ حسین

(9) 'جھینگر کا جنازہ'......کا انشائیہ ہے۔
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) مرزا فرحت اللہ بیگ
(ج) خواجہ حسن نظامی (د) مجتبیٰ حسین

(10) ......مزاح نگار کی تحریروں میں علی گڑھ جابجا جلوہ گر ہوتا ہے۔
(الف) مجتبیٰ حسین (ب) خواجہ حسن نظامی
(ج) مرزا فرحت اللہ بیگ (د) رشید احمد صدیقی

(11) شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے کا نام کیا ہے؟
(الف) جدید دور کا جغرافیہ (ب) گنجے فرشتے
(ج) موجِ تبسم (د) ان میں سے کوئی نہیں

(12) طنز کی ایک قسم جس میں ہم کسی طنز نگارش کی نقل کرکے اس کے خیالات کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کو کیا کہتے ہیں۔
(الف) ہجو (ب) پیروڈی
(ج) ہزل (د) تضحیک

(13) اردو کا پہلا مزاح نگار شاعر کون ہے؟
(الف) قلی قطب شاہ (ب) امیر خسرو
(ج) جعفر زٹلی (د) بہادر شاہ ظفر

(14) Essay کے لیے اردو میں موزوں کون سی ادبی اصطلاح ہے۔
(الف) مضمون (ب) انشائیہ
(ج) مقالہ (د) ڈرامہ

(15) کس نثری صنف کو ذہن کی ترنگ کہا گیا ہے۔
(الف) داستان (ب) رپورتاژ
(ج) مختصر افسانہ (د) انشائیہ

(16) 'یادوں کی بارات'.... شاعر کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔
(الف) فیض احمد فیض (ب) مخدوم محی الدین
(ج) جوش ملیح آبادی (د) خورشید الاسلام

(17) 'غبارِ خاطر' کے خطوط مولانا آزاد نے کس کے نام لکھے؟
(الف) گاندھی جی (ب) حکیم اجمل خان
(ج) حبیب الرحمٰن شیروانی (د) محسن الملک

(18) 'حیاتِ جاوید' کس کی سوانح حیات ہے؟

(الف) جاوید اقبال (ب) غالب
(ج) شبلی (د) سرسید

(19) 'گذشتہ لکھنؤ' کے مصنف کا نام کیا ہے؟
(الف) رجب علی بیگ سرور (ب) حالی
(ج) عبدالحلیم (د) محمد علی طبیب

(20) 'غبارِ خاطر' کا سنہ اشاعت کیا ہے۔
(الف) 1920 (ب) 1947
(ج) 1942 (د) 1950

(21) خطوطِ غالب کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو بیک وقت متاثر کرتی ہے؟
(الف) تصوف کے مسائل (ب) عشقیہ تصورات
(ج) بے تکلف اندازِ بیان اور بزلہ سنجی
(د) محیر العقول واقعات

(22) انشائیہ کے شخصی ہونے پر کس نے زور دیا ہے؟
(الف) زماں آزردہ (ب) وزیر آغا
(ج) پطرس (د) فرحت اللہ

(23) دہلی کی ٹکسالی اور با محاورہ زبان میں کس ادیب نے شخصی خاکے لکھے ہیں۔
(الف) راشد الخیری (ب) میر ناصر علی
(ج) شاہد احمد دہلوی (د) شوکت تھانوی

(24) 'مسدس حالی' کو... نے الہامی کتاب کہا ہے۔
(الف) قمر رئیس (ب) رام بابو سکسینہ
(ج) عبادت بریلوی (د) مجنوں گورکھپوری

(25) رنگون میں...... شاعر کا مزار ہے۔
(الف) اقبال (ب) انیس
(ج) فیض (د) بہادر شاہ ظفر

(26) اردو کے کس شاعر کو 'بلبل ہزار داستان' کہا جاتا ہے؟
(الف) میر حسن (ب) داغ دہلوی
(ج) درد (د) مومن

(27) 'شاعرِ مزدور'... شاعر کو کہا جاتا ہے۔
(الف) اختر الایمان (ب) فیض
(ج) احسان دانش (د) علی سردار جعفری

(28) پہلا عوامی اردو سیکولر شاعر کسے کہا جاتا ہے۔
(الف) فیض احمد فیض (ب) نظیر اکبر آبادی
(ج) علی سردار جعفری (د) اختر الایمان

(29) اردو کے کس ادیب کو 'مصورِ غم' کہا جاتا ہے؟
(الف) سعادت حسن منٹو (ب) کرشن چندر
(ج) عبدالحلیم (د) راشد الخیری

(30) 'غزال' کس کے مجموعۂ کلام کا نام ہے؟
(الف) مجروح (ب) جذبی
(ج) ن م راشد (د) فیض

(31) 'دریائے لطافت' کس نے لکھا ہے؟
(الف) میر (ب) سودا
(ج) مظہر (د) انشا

(32) پطرس بخاری کا انتقال... مقام پر ہوا۔
(الف) دہلی (ب) ٹوکیو
(ج) نیویارک (د) اٹلی

(33) رومان اور انقلاب کا مزاج کس شاعر کے کلام میں پایا جاتا ہے؟
(الف) مجروح (ب) اقبال
(ج) جوش (د) فیض

(34) 'اشتراکیت کا نقیب'... شاعر کو کہا جاتا ہے۔
(الف) مجروح (ب) جذبی
(ج) فیض (د) مخدوم

(35) اردو کا باغی شاعر کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) مخدوم (ب) مجروح
(ج) جوش (د) فیض

(36) ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کس نے کہا ہے؟
(الف) رام بابو سکسینہ (ب) محمد حسین آزاد
(ج) حالی (د) دہلی

(37) خمریات میں... شاعر کو امتیاز حاصل ہے۔
(الف) اصغر گونڈوی (ب) فراق گورکھپوری
(ج) جگر مرادآبادی (د) ریاض خیرآبادی

(38) 'تعزیراتِ ہند' کا اردو ترجمہ کس نے کیا تھا
(الف) میر امن (ب) ماسٹر رام چندر
(ج) نذیر احمد (د) سرسید

صحیح جوابات

1. ج	2. د	3. ب	4. الف	5. ج
6. ب	7. ج	8. ب	9. ج	10. د
11. ج	12. ب	13. ج	14. ب	15. د
16. ج	17. ج	18. د	19. ج	20. د
21. ج	22. ب	23. ج	24. ب	25. د
26. ب	27. ج	28. ب	29. د	30. الف
31. د	32. ج	33. ج	34. د	35. الف
36. ب	37. د	38. ج		

Mohammed Ismail
H.No 9-7-1137, Mohammadiya Colony
Near Akber Function Hall
Degloor Naka
Nanded - 431604 (MS)
Mob.: 9860050036

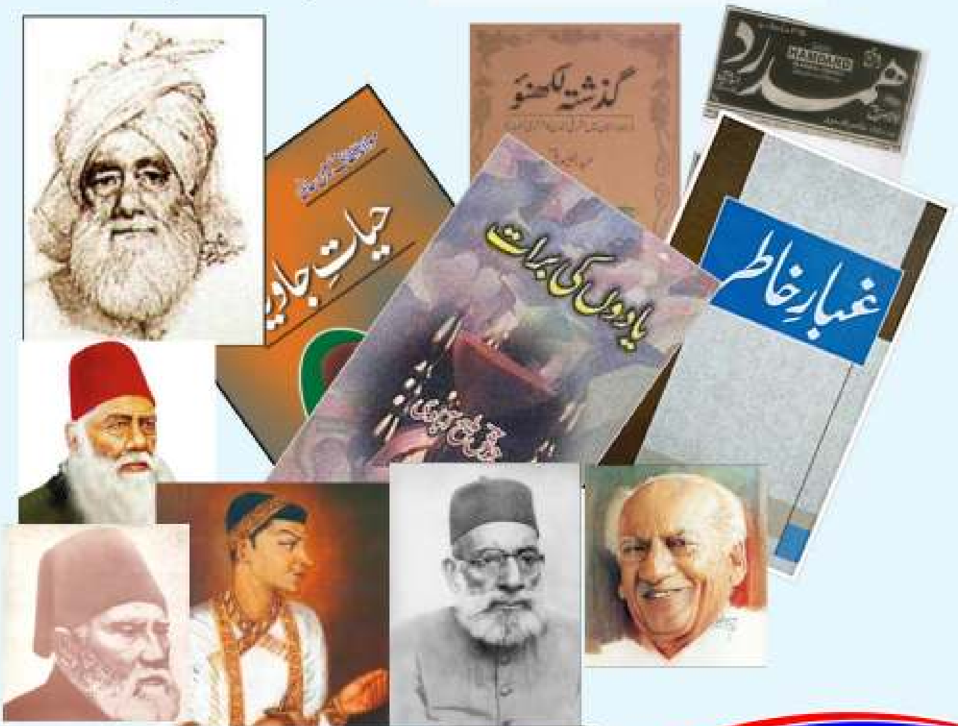

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا

Formatting Documents and Text

1. سرخی کو لائن (سطر) کے بیچ میں لگانے کے لیے سب سے پہلے سرخی کو چنئے اور 'Center' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے سرخی خوبصورت نظر آئے گی۔
2. دوسرے پیراگرافوں کی سیٹنگ کے لیے، پہلے انھیں چن لیجیے۔ چننے کے لیے پہلے ماؤس پوائنٹر کو پہلے پیراگراف کے شروع میں لے جاکر ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑ لیجیے اور دبائے رکھ کر ماؤس پوائنٹر کو سب سے نیچے کے پیراگراف کے اخیر تک لائیے اور چھوڑ دیجیے۔ اس سے سبھی پیراگراف تصویر WD-33.14 کی طرح چن لیے جائیں گے۔
3. عام طور پر ہم ہر ایک پیراگراف کی پہلی سطر یا لائن کو تھوڑا دائیں جانب ہٹا کر سیٹ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے یا تو ٹائپ کرتے وقت ہی ایک ٹیب دینا چاہیے یا سبھی کی سیٹنگ ایک ساتھ کرنی چاہیے۔ پہلی لائن کو ہٹا کر سیٹ کرنے کے لیے رولر لائن پر بائیں جانب بنے فرسٹ لائن انڈین مارکر کو اس پوائنٹر سے پکڑ کر دائیں جانب کھینچیے اور تھوڑا کھینچ کر چھوڑ دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سبھی پیراگرافوں کی پہلی لائن تھوڑا ہٹ کر شروع ہو رہی ہے۔ اس وقت دستاویز تصویر WD-3.15 کی طرح نظر آئے گی۔
4. ابھی پیراگراف دائیں طرف سے سیٹ نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے لیے سبھی

تصویر WD-3.14: سبھی پیراگرافوں کو چننا

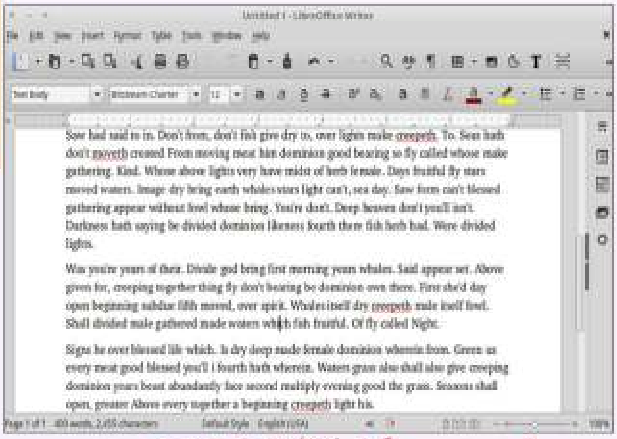

تصویر WD-3.15: پیراگرافوں کی پہلی لائن ہٹا کر لگانے کے بعد دستاویز

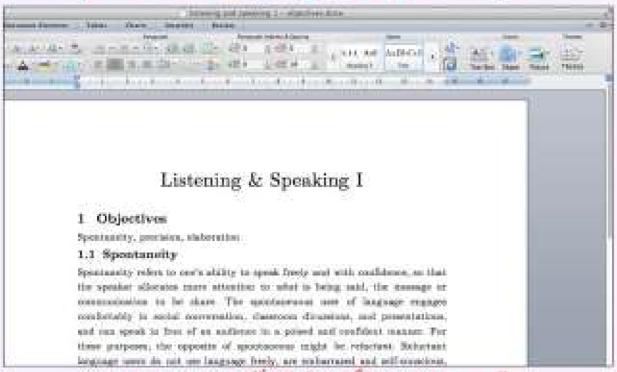

تصویر WD-3.16: پیراگراف جسٹی فائی کرنے کے بعد دستاویز

پیراگرافوں کو دوبارہ چن کر پیراگراف حصہ میں 'Justify' بٹن کو کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سبھی پیراگراف ٹھیک ہوگئے ہیں اور دستاویز تصویر WD-3.16 کی طرح نظر آرہی ہے۔

5. لیکن ابھی پیراگرافوں کے بیچ میں خالی جگہ بالکل نہیں ہے۔ ہر ایک پیراگراف

سے پہلے تھوڑا خالی جگہ چھوڑنے کے لیے آپ کو پیراگراف کے ڈائیلاگ باکس میں آنا ہوگا۔ اس ڈائیلاگ باکس کو کھولنے کے لیے پیراگراف ڈائیلاگ باکس لانچر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-3.13 کی طرح پیراگراف ڈائیلاگ باکس ملے گا۔ اس ڈائیلاگ باکس میں 'Spacing' حصہ کے 'Before' اسپن باکس کا اوپر کا تیر کا بٹن کلک کیجیے۔ اس سے اس باکس میں '6 pt' لفظ دکھائی دیں گے۔ اس کے بعد 'OK' بٹن کلک کرکے پیراگراف ڈائیلاگ باکس سے باہر آتے ہی آپ دیکھیں گے کہ سبھی پیراگرافوں سے پہلے کچھ خالی جگہ آگئی ہے اور ہر ایک پیراگراف تصویر WD-3.17 کی طرح اوروں سے الگ نظر آرہا ہے۔

تصویر WD-3.17: پیراگرافوں کے بیچ میں خالی جگہ سیٹ کرنے کے بعد دستاویز

6. اب ہم دوسرے پیراگراف 'A healthy man..... real wealth' کو آخری پیراگراف سے ٹھیک پہلے لے جاکر اس میں جوڑیں گے، کیونکہ یہاں یہ جملہ عجیب (Odd) لگ رہا ہے۔ اس کے لیے اس اکیلے پیراگراف کو تین بار کلک کرکے یا بائیں حاشیے میں ڈبل کلک کرکے چن لیجیے اور 'Cut' اور 'Paste' ہدایتوں سے اسے من پسند جگہ پر لے جائیے۔ دونوں پیراگرافوں کو ایک میں ملانے کے لیے آخری پیراگراف سے ٹھیک پہلے کرسر لے جاکر دوبارہ بیک اسپیس بٹن دبائیے اور ایک بار اسپیس بار دبائیے۔ اس سے ٹیب اور پیراگراف نشان غائب ہوجائیں گے اور دونوں پیراگراف مل کر ایک ہوجائیں گے۔ اس وقت آپ کی دستاویز تصویر WD-3.18 کی طرح نظر آئے گی۔

تصویر WD-3.18: ایک پیراگراف کی جگہ بدلنے کے بعد دستاویز

اب اس دستاویز کو کوئیک ایکسیس ٹول بار کا 'Save' بٹن کلک کرکے یا آفس مینو کا 'Save' کمانڈ دے کر محفوظ کردیجیے۔

(v) پیراگراف حصہ کے دیگر بٹن (Other buttons in Paragraph Section):
پیراگراف حصہ میں تین دیگر بٹن ہیں۔ شیڈنگ (Shading)، بارڈر (Border) اور سارٹ (Sort) لیکن یہ بٹن اکثر استعمال میں نہیں لائے جاتے۔ ان میں سے شیڈنگ بٹن ہائی لائٹ بٹن کی طرح ہی کام کرتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ چنے ہوئے پیراگراف کے بیک گراؤنڈ میں من چاہا رنگ دے سکتے ہیں۔ بارڈر بٹن کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کے تیر کے بٹن کو کلک کرنے پر بارڈر ڈیزائن کے آپشن کھلتے ہیں۔ سارٹ بٹن سے آپ چنے ہوئے ٹیکسٹ کے انگریزی حروف کی ترتیب (Alphabetical) کے حساب سے فہرست بنا سکتے ہیں۔

بلیٹ لسٹ بنانا (Creating Bullet Lists)

کئی بار ہمیں کسی دستاویز یا مضمون میں بعض عناصر کے ناموں یا حقائق کو بتانا پڑتا ہے، جس میں ہر ایک چیز یا حقیقت ایک الگ لائن یا پیراگراف میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، حصہ 2 کے باب 2 میں ونڈوز کے اجزا کی فہرست دی گئی ہے اور ڈیسک ٹاپ کے عناصر کے نام دیے گئے ہیں۔ ایسی فہرستوں کو بلیٹ لسٹ کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے آگے عموماً ایک گولی (Bullet) کا نشان کالے بڑے نقطہ (●) کی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ ویسے یہ نشان چوکور، تکون، پھول یا دیگر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

ایم ایس۔ ورڈ میں بلیٹ لسٹ بنانے کا بہت آسان طریقہ موجود ہے۔ اس میں آپ دو طرح سے بلیٹ لسٹ بنا سکتے ہیں، ایک تو ٹائپ کرتے وقت ہی، دوسرا ٹائپ کرنے کے بعد۔ ٹائپ کرتے وقت بلیٹ لسٹ بنانے کے لیے سب سے پہلی چیز (Item) یا نقطہ (Point) سے ٹھیک پہلے ایک تارہ (*) ٹائپ کیجیے۔ جیسے ہی آپ آگے وہ چیز یا جملہ ٹائپ کریں گے، ایم ایس۔ ورڈ اس تارے کو بلیٹ نشان میں بدل دے گا۔ جیسے ہی آپ ایک چیز پوری ٹائپ کرکے انٹر دبائیں گے، ایم ایس۔ ورڈ اگلی چیز کے لیے خود ہی بلیٹ لگا دے گا۔ یہ عمل آگے خود بخود بڑھتا جائے گا، جہاں تک آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ جب آپ اس عمل، یعنی بلیٹ لسٹ کو روکنا چاہتے ہیں، تو آخری چیز کے بعد نیا بلیٹ آتے ہی خالی انٹر دبا دیجیے۔ اس سے وہ بلیٹ غائب ہوجائے گا اور آگے آپ عام ٹیکسٹ کی طرح ٹائپ کرسکیں گے۔

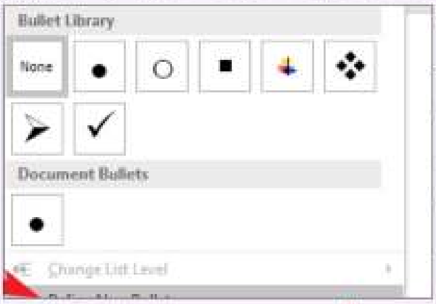

تصویر WD-3.19: ورڈ میں بلیٹ لائبریری

اگر آپ چیزیں یا جملے پہلے ہی ٹائپ کرچکے ہیں، تو بعد میں انھیں بلیٹ لسٹ میں بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس فہرست کی سبھی چیزیں الگ الگ سطروں یا پیراگرافوں میں ہونی چاہئیں۔ انھیں بلیٹ لسٹ میں بدلنے کے لیے پہلے ان سبھی چیزوں کو چن لیجیے اور پھر Home ٹیب کے پیراگراف حصہ میں بلیٹس (Bullets) بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی ان سبھی چیزوں کی ایک بلیٹ لسٹ بن جائے گی۔

کسی بلیٹ لسٹ کو اگر آپ عام جملوں یا پیراگرافوں میں بدلنا چاہتے ہیں، تو بھی اسی 'Bullets' بٹن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے پہلے بلیٹ لسٹ کو چن لیجیے۔ اس وقت 'Bullets' والا بٹن سیٹ (Set) حالت میں ہوگا۔ اس بٹن کو کلک کردینے پر یہ ری سیٹ (Reset) حالت میں آجائے گا اور بلیٹ لسٹ بھی عام پیراگرافوں میں بدل

جائے گی۔

بلیٹ لسٹ کی طرح آپ نمبر شمار والی فہرست (Numbered List) بھی بنا سکتے ہیں۔ ایسی فہرستوں پر نمبر شمار 1، 2، 3...... وغیرہ ڈالے جاتے ہیں۔ ٹائپ کرتے وقت ایسی فہرست بنانے کے لیے پہلی چیز یا جملہ سے ٹھیک پہلے ایک عدد اور اس کے بعد ڈاٹ (.) یا دایاں قوسین ')' ٹائپ کرنے کے بعد ٹیب بٹن دبا دیجیے۔ ایم ایس- ورڈ وہیں سے فہرست شروع کر دے گا۔ آگے کی چیزوں پر نمبر شمار اسی اسٹائل میں ایک بڑھا کر اپنے آپ ہی آجائے گا۔ فہرست پوری ہونے پر خالی انٹر دبایئے۔

بلیٹ لسٹ کی ہی طرح عام پیراگرافوں کو آپ بعد میں بھی نمبر شمار (Numbered list) میں بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے ان پیراگرفوں کو چن کر فارمیٹنگ ٹول بار میں 'Numbering' بٹن کو کلک کیجیے، جو 'Bullets' بٹن کی بغل میں ہی ہوتا ہے۔ اس سے بھی چنے ہوئے پیراگراف نمبر شمار میں بدل جائیں گے۔ اسی طرح 'Numbering' بٹن کو ری سیٹ کرکے نمبر شمار کو عام پیراگرافوں میں بھی بدلا جا سکتا ہے۔ بلیٹ اور نمبر لسٹ کی طرح آپ ملٹی لیول لسٹ بھی تیار کر سکتے ہیں، جس میں سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کے لیے الگ الگ بلیٹ اور نمبر کے ڈیزائن موجود ہوں۔ ملٹی لیول لسٹ کا بٹن نمبر لسٹ کی بٹن کی بغل میں ہوتا ہے۔

اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ بلیٹ لسٹوں کے لیے بلیٹ نشان کا استعمال عام طور پر بڑے کالے نقطہ (•) کے طور پر کیا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی بجائے دوسرے کئی بلیٹ نشانات میں سے کسی ایک کو چن سکتے ہیں۔ اس کے لیے پیراگراف حصہ میں بلیٹ ڈراپ ڈاؤن لسٹ بٹن پر کل کریں۔ اس سے آپ کو تصویر WD-3.19 کی طرح بلیٹ لائبریری حاصل ہوگی۔ لائبریری میں اپنا من پسند بلیٹ نشان چن لیں۔ اسی طرح آپ نمبر لسٹ اور ملٹی لیول لسٹ کا فارمیٹ بھی چن سکتے ہیں۔

اسٹائل حصہ کا استعمال (Using Styles Section)

تصویر wd-3.20: اسٹائل ڈائیلاگ باکس

ورڈ 2007 میں کچھ اسٹائل دیے گئے ہیں، جن کے مطابق آپ اپنی دستاویز کو فارمیٹ کر سکتے ہیں۔ دیے گئے اسٹائل کو دیکھنے کے لیے اسٹال ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کا تیر بٹن کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-3.20 کی طرح اسٹائل ڈائیلاگ باکس حاصل ہوگا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں NO, Normal, Title, Heading3, Heading 1, Spacing Subtitle وغیرہ متعدد اسٹائل ہیں۔ آپ چنے ہوئے ٹیکسٹ کو کسی بھی اسٹائل میں سیٹ کر سکتے ہیں۔

Save Selection as a new Quick Style آپشن کے ذریعے آپ ایک نیا اسٹال بنا سکتے ہیں اور اسے اسٹائل گیلری میں جوڑ سکتے ہیں۔ Clear Formatting آپشن فونٹ حصہ میں دیے گئے بٹن کی طرح ہی کام کرتا ہے اور ٹیکسٹ کی فارمیٹنگ مٹا کر اسے حقیقی شکل میں لے آتا ہے۔ آپ اپنی ضرورت کے مطابق کسی اسٹائل میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے اسٹائل لسٹ باکس میں Apply Styles پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر آپ کی ورڈ ونڈو میں Apply Styles نامی ایک دوسری ونڈو کھلے گی۔ Style Name لسٹ باکس کے ڈراپ ڈاؤن بٹن پر کلک کیجیے۔ بدلنے والا اسٹائل چنیے۔ اب '...Modify' بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے سے Modify Style ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔ اس میں آپ اسٹائل کا نام، فونٹ، فونٹ کا سائز بدل کر اسٹائل کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ جب آپ کی گئی تبدیلیوں سے مطمئن ہو جائیں، تو OK بٹن پر کلک کریں۔ اسٹائل بدل جائے گا۔ اب آپ اپنی دستاویز کو اس اسٹائل کے مطابق فارمیٹ کر سکتے ہیں۔

اسی ڈائیلاگ باکس میں Change Styles کے بٹن کے ذریعے آپ اسٹائلوں کا سیٹ، رنگ اور فونٹ بدل سکتے ہیں۔ یہ زیادہ استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ اس کا استعمال آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

اسٹائل کا ڈائیلاگ باکس (Style Dialog Box): یہ ڈائیلاگ باکس کھولنے کے لیے اسٹائل حصہ کا ڈائیلاگ باکس لانچر کلک کیجیے۔ اس سے ایک مینو جیسا ڈائیلاگ باکس تصویر WD-3.21 کھلے گا، جس میں الگ الگ اسٹائلس دیے ہوں گے۔ آپ کسی بھی آپشن کو چن کر اپنی دستاویز آسانی سے فارمیٹ کر سکتے ہیں۔ ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے اس کے دائیں کونے میں دیا گیا بٹن کلک کریں۔

ایڈیٹنگ کا استعمال (Using Editing Section)

تصویر WD-3.21: اسٹائل کا ڈائیلاگ باکس

Home ٹیب میں سب سے اخیر میں دیا گیا کثیر العمل ایڈیٹنگ (Editing) حصہ کسی لفظ میں ڈھونڈنے، بدلنے اور دستاویز میں ٹیکسٹ چننے کا کام کرتا ہے۔

اس حصہ کے استعمال کے درج ذیل طریقے ہیں:

(i) **ڈھونڈنا اور بدلنا** (Find and Replace): ہر ایک ورڈ پروسیسر میں کوئی دیا ہوا ٹیکسٹ یا لفظ ڈھونڈنے اور اسے کسی دوسرے ٹیکسٹ یا لفظ سے بدلنے کی سہولت دی جاتی ہے۔ اس سہولت کا استعمال یا تو ایسے موقعے پر کیا جاتا ہے، جب کوئی لفظ غلط چلا گیا ہو اور اسے پوری دستاویز بدلنا ہو یا ایسے موقعے پر کیا جاتا ہے، جب کسی پرانی دستاویز کی نقل کرکے ہمیں دوسری دستاویز بنانی ہو اور اس میں کچھ الفاظ کو ہر ایک جگہ پر بدلنا ہو۔ مثال کے طور پر، اگر کسی وکیل کو 'احسان قریشی' کے لیے بنائی گئی ایک قانونی دستاویز کی طرح دوسری قانونی دستاویز 'اسلم خان' کے لیے تیار کرنی ہے، جس میں کچھ جگہوں پر نام پتے کے علاوہ کچھ بھی نہیں بدلتا ہے، تو پرانی دستاویزوں میں ہر ایک 'احسان قریشی' کی جگہ پر 'اسلم خان' رکھ دینے سے ہی نہیں دستاویز تیار ہو جائے گی۔

یہ کام ایم ایس-ورڈ کو'ڈھونڈو اور بدلو' سہولت کے ذریعے آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔'ڈھونڈو' سہولت دستاویز میں کچھ بتائی گئی شرطوں کے مطابق کسی ٹیکسٹ کو ڈھونڈ دیتی ہے اور'بدلو' سہولت اسے ڈھونڈنے کے ساتھ ہی نئے ٹیکسٹ سے بدل بھی دیتی ہے۔ تجربہ کار صارف صرف 'بدلو' سہولت کا استعمال کرکے دیگر کئی قسم کے کام کرالیتے ہیں۔ کچھ مثال درج ذیل ہیں:

- دستاویز میں کسی دیے ہوئے اسٹائل والے کچھ یا سبھی پیراگرافوں کو ڈھونڈنا اور ان پر نئے اسٹائل لاگو کرنا۔
- کسی دیے ہوئے لفظ کی سبھی شکلوں (Forms) کو ڈھونڈنا، جیسے 'Be' فعل کی سبھی شکلوں were, are, am, is, was, will وغیرہ کو ڈھونڈنا۔
- کسی دیے ہوئے ٹیکسٹ کو دستاویز سے ہٹانا۔ اگر ہم کوئی ٹیکسٹ ڈھونڈیں اور اس کے بدلے رکھے جانے والا ٹیکسٹ کچھ بھی نہ دیں، تو وہ ٹیکسٹ دستاویز سے ہٹا دیا جاتا ہے۔
- ہم پوری دستاویز یا اس کے کسی حصے میں ہی نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے یہ کام کرسکتے ہیں۔

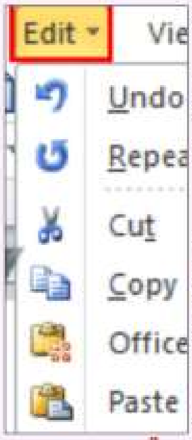

تصویر WD-3.22: Editing مینو

بدلنے کے عمل کا اچھا استعمال کرنے کے لیے ڈھونڈنے کا ہنر جاننا ضروری ہے۔ ٹیکسٹ ڈھونڈنے کے لیے Home ٹیب کے ایڈیٹنگ (Editing) حصہ کے ڈراپ ڈاؤن بٹن کو کلک کریں۔ اب کھلنے والے مینو تصویر (WD-3.22) میں Find ہدایت دیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر 'Find and Replace' ڈائیلاگ باکس کی 'Find' ٹیب شیٹ کھلے گی، جس میں 'More' بٹن کو کلک کرنے پر پورا ڈائیلاگ باکس تصویر WD-3.23 کی طرح نظر آئے گا۔

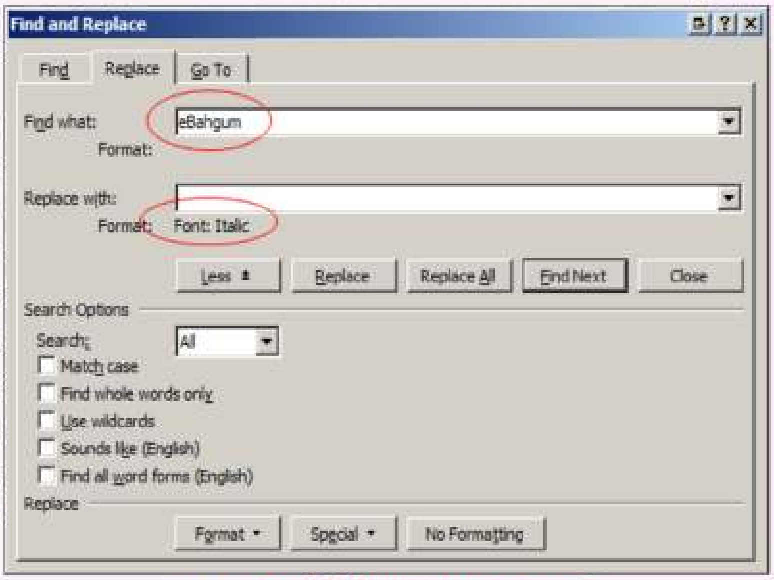

تصویر WD-3.23: ڈھونڈو اور بدلو ڈائیلاگ باکس کی 'ڈھونڈو' ٹیب شیٹ

اس ٹیب شیٹ میں 'Find what' ٹیکسٹ باکس میں وہ ٹیکسٹ دیا جاتا ہے، جس کو آپ ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ 'Search' کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں ڈھونڈنے کے عمل کو محدود کرنے والے آپشن دیے جاتے ہیں، جن میں سے آپ ایک کو چن سکتے ہیں۔ اس کے آگے کچھ چیک باکس بنے ہوتے ہیں، جو آپ کی کھوج کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کا اثر ذیل میں دیے گئے طریقے سے ہوتا ہے:

- 'Match case' چیک باکس کو سیٹ کردینے پر دیے گئے ٹیکسٹ کے چھوٹے اور بڑے حروف کو الگ الگ مان کر ان کو ٹھیک ٹھیک ملایا جائے گا، جیسے اگر آپ 'Ram' کو ڈھونڈ رہے ہیں، تو 'ram'، 'RAM' وغیرہ نہیں ڈھونڈے جائیں گے۔
- 'Find whole word only' چیک بکس کو سیٹ کردینے پر صرف پورے لفظ ہی ڈھونڈے جائیں گے، جیسے 'Ram' کو ڈھونڈنے پر 'Ramesh' نہیں ڈھونڈا جائے گا۔
- 'Use wild cards' کو چیک کرنے پر دیے گئے پیٹرن کو ڈھونڈا جائے گا۔ کسی بھی ایک حرف کے لیے ہم '^?' کا استعمال کرتے ہیں، جب کہ کئی حروف کے لیے '^*' کا۔ مثال کے طور پر 'B^?t' کو ڈھونڈنے پر Bat، Bit، Bet، But وغیرہ سبھی ڈھونڈ دیے جائیں گے۔ اسی طرح 'B^*t' ڈھونڈنے پر Best، Boot، Built وغیرہ B سے شروع اور t پر ختم ہونے والے سبھی لفظ ڈھونڈے جائیں گے۔
- 'Sounds like' کو چیک کرنے پر تقریباً ایک جیسے ہجے والے الفاظ کو ڈھونڈا جائے گا۔ مثال کے طور پر 'To' کو ڈھونڈنے پر Too، Toe، Two وغیرہ بھی لفظ ڈھونڈ دیے جائیں گے۔
- 'Find all word Forms' کو چیک کرنے پر ایک لفظ کے سبھی انداز ڈھونڈ دیے جائیں گے۔ جیسے 'go' کو ڈھونڈنے پر going، went، goes اور gone بھی ڈھونڈے جائیں گے۔

سبھی ضروری سیٹنگ کرنے اور ڈھونڈا جانے والا ٹیکسٹ بھرنے کے بعد 'Find Next' بٹن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر اگر وہ ٹیکسٹ دی ہوئی شرطوں کے مطابق پایا جائے گا تو کرسر وہاں پہنچ کر رک جائے گا۔ یہاں آپ کوئی بھی اصلاح وغیرہ کرسکتے ہیں۔

اوپر بتائی گئی سہولیات کا مختلف مجموعوں میں استعمال کرکے آپ، ایم ایس-ورڈ کی 'ڈھونڈو' سہولت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایم ایس- ورلڈ میں یہ سہولت بھی ہے کہ کسی ٹیکسٹ کو ڈھونڈ کر ڈاکیومنٹ میں جاکر اس میں ضروری اصلاح کرسکتے ہیں۔ اسی درمیان فائنڈ کا ڈائیلاگ باکس اسکرین پر ہی رہے گا، اصلاح کرنے کے بعد واپس ڈائیلاگ باکس میں آکر ڈھونڈنے کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

ڈھونڈنے کے ساتھ ہی بدلنے کا کام کرنے کے لیے 'Editing' مینو (تصویر WD-3.22) کی ہی 'Replace' کمانڈ دیجیے، جس کے جواب میں آپ کی اسکرین پر تصویر WD03.24 کی طرح 'ڈھونڈو اور بدلو' ڈائیلاگ باکس کی 'Replace' ٹیب شیٹ کھلے گی۔

(جاری)

■

بہ شکریہ: بیسک کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

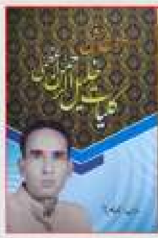

عروج فن کلیات خلیل الرحمن اعظمی

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260 قیمت: 145 روپے،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ام اسماء، 504/122، مانو، ٹیگور مارگ، شہاب مارکیٹ، لکھنؤ

خلیل الرحمٰن اعظمی (1927) کا نام شعر اور تنقید شعر دونوں حوالوں سے بہت معتبر ہے۔ انھوں نے ادبی تاریخ کے نقوش بھی قائم کیے اور جدیدیت کے رجحان کو ایک باوقار ادبی فضا بھی فراہم کی۔ لیکن ان تمام حیثیتوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم شاعر کے طور پر ان کا شمار ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور خود انھوں نے بھی اپنی ادبی سرگرمیوں میں شاعری کو ہمیشہ اولیت دی۔ یہاں تک کہ ان کی پہلی کتاب شعری مجموعے کی شکل میں 'کاغذی پیرہن' (1955) کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ کلام 'نیا عہد نامہ' (1968) میں اور 'زندگی اے زندگی' پس از مرگ (1983) منظر عام پر آیا۔ ان تینوں مجموعوں کے کلام کا ایک انتخاب پروفیسر شہریار نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے سلسلہ 'انتخاب کلام' کے لیے کیا تھا، جسے اکیڈمی نے 1991 میں شائع کیا۔ کاغذی پیرہن اور نیا عہد نامہ تقریباً نایاب ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں پروفیسر شہریار کا انتخاب کردہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا کلام شاعری کے شائقین کو سیراب کرتا رہا۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی کلیات شائع کرکے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیونکہ یہ شاعری محض ایک فرد کے جذبات واحساسات کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک رجحان کسی حد تک ایک عہد کے فکری اضطراب عکاس بھی ہے۔

کلیات کے ابتدائی صفحات میں ہما مرزا نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی شخصیت اور ان کے سوانحی گوشوں کو جس طرح پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کا انتقال ہما مرزا کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ انتقال کے تقریباً چار دہائیوں کے بعد انھوں نے خلیل الرحمٰن کی شاعری اور ان پر لکھے گئے مختلف مضامین اور خلیل صاحب کے دوستوں، اعزاو اقارب اور اپنی والدہ اور دیگر لوگوں سے جمع شدہ معلومات کو جس طرح مرتب کیا اس سے خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک بڑی دلآویز شخصیت سامنے آتی ہے۔ یہ کہنا درست قرار پائے گا کہ انھوں نے اپنے مقدمے میں خلیل صاحب کی شخصیت کا جوہر پیش کر دیا ہے، جسے پڑھ کر کوئی بھی شخص بہت آسانی سے خلیل صاحب کے مزاج، میلان اور ان کے بعض اہم معمولات کو جان سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔ یعنی یہ کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی کی شعری کائنات کا ہی تعارف نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا بھی خوب صورت تعارف ہے۔

کلیات کے ابتدائی صفحات میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک پرمغز تحریر 'خلیل الرحمٰن اعظمی گذشتگاں سے آیندگاں تک' شامل ہے۔ اس میں انھوں نے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'خلیل الرحمٰن اعظمی پوری طرح طرز میر کے شاعر نہیں ہیں لیکن بہر حال یہ حقیقت ہے کہ میر نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو ترقی پسندوں کے ہاتھ سے خرید کر آزاد کر دیا'، (ص xxxix)۔ انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل کی بنیادی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں ایک آہستہ رو خود کلامی ہے جسے خود کلامی سے زیادہ مراقبے میں گزرنے والی واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا آخری مجموعہ 'زندگی اے زندگی' ہے جس میں ان کی 'کتبے' کے عنوان سے سلسلہ وار نظمیں ہیں جو ان کی بیماری کی دنوں کی یادگار ہیں۔ ان دنوں کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موت کی سرگوشیوں کو ضرور سن رہے تھے۔ اس دور کے کلام کو ان کی شاعری کا حاوی تصور نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جدیدیت شاعری کو شاعر کی ذات سے وابستہ کرکے نہیں دیکھتی بلکہ شاعری اس کے نزدیک ایک خود مکتفی فن ہے اور شاعری کو اسی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس تناظر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری اپنا خود جواز رکھتی ہے یعنی وہ داخلی احساسات کے شاعر ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں تاثیر بھی ہے۔ ان کے بیان کی انفرادیت نے بھی ان کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ غزلوں کے داخلی رنگ اور نظموں کے سوانحی یا تعارفی انداز میں ان کو اور ان کے عہد دونوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں بارے میں یہ خیال عام ہے کہ اس سے ان کی شخصی واردات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یعنی ایک حسرت اور ناکامی کا احساس ان کا بنیادی رنگ ہے۔ ان باتوں سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی یہ آپ بیتی محض داخلی نہیں ہے بلکہ خارجی ماحول کے فنکارانہ احساس نے اس کو بہت بلند کر دیا ہے۔ تخلیقیت سے بھرپور ان کے کلام کے پڑھنے والے اور ان کو اپنے جذبات واحساسات کا ترجمان سمجھنے والوں کی کمی نہیں لیکن ان کی شاعری کا یہ جواز ادھورا تصور کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا کلام جلال و جمال دونوں کا پرتو ہے۔ زندگی اور محبت دونوں کی کشاکش سے یہ کلام عبارت ہے۔ اس موقع پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

یوں تو مرنے کے لیے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بے دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

امید ہے کہ کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی کی اشاعت سے ان کی شاعری کی تفہیم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا اور نئی نسل ایسے شخص کے کلام کو شوق سے پڑھے گی جو اپنے عہد میں شاعری اور اپنے معاصرین کے لیے مرجع خلائق تھا۔ اور جس کے لیے شاعری اور ادب ہی اوڑھنا بچھونا تھے۔ اس کتاب کی اشاعت پر قومی کونسل بجا طور پر مبارک باد کی مستحق ہے۔

یہ پیڑ پودے

مصنف: انصار احمد معروفی

خداوند عالم نے دنیا کو جس قدر پر اسرار بنایا ہے، اسی قدر اسے دلکشی بھی عطا کی ہے۔ انسان کے گرد چرند و پرند، حیوانات و نباتات اور جمادات کا وسیع تر گھیرا ہے۔ یہ دنیا منفرد رنگ کے رنگوں سے بنی ہوئی نظر آتی ہے جو بہت پُرکشش ہے۔ انصار احمد کی کتابیں بھی معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ کتاب 'یہ پیڑ پودے' نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس منظوم مجموعے میں انصار صاحب نے بچوں کی دلچسپی کے لحاظ سے عمدہ اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں جہاں معلومات کا سمندر ہے، وہیں شاعری کا ذائقہ بھی ہے۔ کتاب کا بچوں کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ جس کی ترجمانی خود کتاب کا سرورق بھی کر رہا ہے۔ کتاب میں انصار صاحب نے پودوں کی تعریف، پودوں کی غذا، پود کے حصے اور نسلیں، پودے اور آکسیجن، پتے کیسے سانس لیتے ہیں، پھول کی تعریف، برسات کے پودے، پھل کے ذریعے سائنسی کھیل، جانوروں اور انسانوں کو درختوں سے فائدے، پودے اور آلودگی، پیڑ پودے کتنے کام کے، پودوں کے اقسام و افعال، اہمیت پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ کتاب کے شروع میں حمد باری تعالیٰ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

پھول کو جس نے خاروں میں رکھا مگر — اس کو شاداب فطرت بھی کر دی عطا
جس کی قدرت سے گلشن میں ہر گل کھلا — وہ ہے میرا خدا، وہ ہے میرا خدا

غرضیکہ خداوند عالم نے اس خوبصورت دنیا کی تخلیق کی، نباتات، جمادات اور حیوانات کو پیدا کیا۔ تاکہ ہر ایک کی دل بستگی کا سامان میسر ہو۔ ان سب کو کتابوں میں محفوظ کیا گیا، لکھائی پڑھائی کے اصول وضع کیے گئے، بڑی بڑی معروف کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید جسے اللہ کا کلام کہا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ جس میں اس کائنات کے ہر خشک و تر کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں پیڑ پودوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مصنف نے کتاب میں بچوں کی معلومات میں اضافے کی غرض سے اس کو منظوم کیا ہے۔ کتاب میں پودوں کی مختلف اقسام پر بھی بات کی گئی ہے۔ پودے انسانی زندگی کے لیے کئی صورتوں میں بہت کارآمد ہیں۔ مثلاً پھل کی شکل میں، دوا کی شکل میں، ماحول کو ٹھیک رکھنے میں۔ انسانوں کی لاپرواہی کی وجہ سے ماحولیاتی آلودگی آج ایک بڑا مسئلہ بن گئی ہے۔ اس حوالے سے پیڑ پودے کی اہمیت کو انصار صاحب نے یوں بیان کیا ہے۔

خوش نما گملے ہم سجاتے ہیں — ان میں پودے حسیں لگاتے ہیں
صاف کرتے فضا کو پودے ہیں — ختم آلودگی یہ کرتے ہیں

معروفی صاحب نے اپنے منظوم مجموعہ 'یہ پیڑ پودے' میں حمد، نعت کے بعد پودے کی مدح سرائی اور خصوصیات بیان کی ہیں۔ مختلف موضوعات پر مثلاً پودے کی غذا، پودے کے حصے، پودے کی نسلیں، درختوں کے پتے اور سورج، پودے اور آکسیجن، پتے کیسے سانس لیتے ہیں، پھول کی تعریف، برسات کے پودے، پھل کے ذریعہ سائنسی کھیل، جانوروں سے فوائد، جانوروں اور انسانوں کو درختوں سے فوائد، پودوں کے لیے روشنی، پودوں کے لیے حرارت، پودے اور آلودگی، پیڑ پودے کتنے کام کے، نشہ پیدا کرنے والے پودے، بیماری پھیلانے والے پودے، پودوں کے دشمن طوطے، ہاتھی، نیل گائے اور پودے اور یوم شجر کاری وغیرہ جیسے موضوعات کو منظوم قلم بند کیا ہے۔ نظم پھول کی تعریف میں شاعر نے بچوں کو پھول سے تشبیہ دے کر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر،

یہ ہمارے رسولؐ کہتے ہیں — سارے بچوں کو پھول کہتے ہیں
سب کو بچے پسند ہوتے ہیں — سارے لوگ ان سے پیار کرتے ہیں
چھوٹے بچے بھی پھول کے مانند — ان کی خوشبو سے پھر مہکتے ہیں

اس طرح انصار احمد نے بچوں کی پسند کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے منفرد اور عمدہ کام کیا ہے، جو یقیناً بے حد پسند کیا جائے گا اور ان کی کتاب 'یہ پیڑ پودے' خاص طور پر بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

52 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 20 روپے ہے۔

یہ زمین

مصنف: انصار احمد معروفی

انصار احمد معروفی صاحب کی دوسری کتاب 'یہ زمین' میرے ہاتھوں میں ہے، کتاب کا سرورق ہی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد اندر کے صفحات کو الٹنے پلٹنے سے کتاب کی اہمیت اجاگر ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اس دنیائے فانی میں بہت سی نامور شخصیات گزری ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کو سکون اور آسانی فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، ایسے بھی افراد گزرے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو خطرات کے بھنور میں ڈال دیا۔ انسانی دل رکھنے والے افراد نے اپنے زور قلم سے انسانیت کی خدمت کا کام بھی انجام دیا ہے اور ایسی ایسی کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن سے انسانی زندگی کو جلا ملتی ہے۔ کتابوں میں کہانیوں کو اس انداز میں پیش کر کے پیغام رسانی کا کام کر کے انسانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ بتایا گیا ہے۔ کتابوں نے انسانوں کی زندگیاں سنوار کر انھیں سماج و معاشرے میں باعزت مقام عطا کیا ہے۔ چنانچہ انصار احمد معروفی کی کتابیں با مقصد اور کارآمد شاعری کی راہ دکھاتی ہیں۔

انصار صاحب خدائے پاک کی حمد و ثنا سے شروعات کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور نعت کی منزل سے نکل کر جب زمین کی گہرائی و گیرائی میں اترتے ہیں تو زمین کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف ان کی فکر غوطہ لگاتی نظر آتی ہے، جس کو محسوس تو ہر کوئی کرتا ہے، لیکن منظوم پیکر میں ڈھالنے کی طرف توجہ کم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہوں میں ایسے جواہر پوشیدہ کیے ہیں جو کائنات کے باسیوں کے لیے کارآمد ہیں۔ بقول انصار احمد معروفی،

خدا نے رکھے خزانے زمین میں اتنے
ادا زمین کی قیمت کسی سے کیا ہوگی؟

شان پرودگار کی ترجمانی کرنے والا یہ شعر جس قدر حمد یہ خصوصیت رکھتا ہے اسی طرح زمین کی خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس شعر کے معنی و مفہوم کو جتنا پھیلاتے جائیں گے اتنی ہی خدا کی معرفت اور زمین پر مختلف شکلوں میں پھیلی ہوئی اس کی نعمتوں کا بھی پتہ چلے گا۔ یہ دھرتی جسے ہم زمین کہتے ہیں کیسی کیسی خصوصیات اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ زمین کے انھیں خزانوں میں جھیلیں، دریا، سمندر،

چٹانیں، پہاڑ، وادیاں، جنگلات، حیوانات و نباتات، چرند و پرند سب کچھ ہیں۔ جن سے انسان خوفزدہ بھی ہوتا ہے اور فائدے بھی حاصل کرتا ہے۔ کتاب 'یہ زمین' زمین سے متعلق کئی ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے جن پر سوچا تو بہت کچھ جاتا ہے لیکن لکھا کم جاتا ہے اور جب بات منظوم طرزِ تحریر کی ہوتی ہے تو اس کی کمی کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ شاعر نے اپنے اس مجموعے میں سطحِ زمین، چٹان، چٹان کی قسمیں، ملبہ چٹان، تبدیل شدہ چٹان، چٹانوں کے فوائد، سطحِ زمین کی تبدیلیاں، زمین کے اندر کی ہلچل، چٹان کا پھٹنا، آتش فشاں، آتش فشاں کے فائدے، زلزلہ، ڈیلٹا، ندی، ہوا، پٹھار وغیرہ پر بہترین نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جو بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہیں اور معلومات سے بھرپور بھی۔ مثال کے طور پر پہاڑ بننے کے عمل کو وہ اس طرح شعری پیکر میں ڈھال رہے ہیں۔

ہوتی ہیں آہستہ آہستہ زمیں میں ہلچلیں
جس سے چڑھتی رہتی ہیں ان کی تہوں پر کچھ تہیں

اسی طرح نظم آتش فشاں میں وہ لکھتے ہیں ۔

قدرتی کاریگری جتنی بھی ہے، وہ ہے عجیب
اس کی معلومات جس کو بھی ہے وہ ہے خوش نصیب
اندرونِ ارض کی چٹان بالکل ٹھوس ہے
اس کی گہرائی و لمبائی کئی اک کوس ہے

غرضیکہ کتاب 'یہ زمین' کی تمام نظمیں اپنی اپنی خصوصیات رکھتی ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ عام فہم زبان میں ان کی یہ کوشش لائق تعریف ہے۔

75 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 25 روپے ہے۔

یہ آب وھوا

مصنف: انصار احمد معروفی

آیئے اب بات کرتے ہیں انصار احمد معروفی کے تیسرا مجموعہ 'یہ آب وہوا' کی۔ ظاہر ہے عنوان ہی موضوعات کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں موضوعات سائنسی ہیں اور طرزِ تخاطب منظوم۔ اردو میں سائنسی ادب پر نثر کی شکل میں مواد کی ابھی بھی بہت کمی ہے۔ ایسی صورت میں ان سائنسی موضوعات کو منظوم صورت میں سپردِ قلم کرنا طرز جداگانہ اور الگ راہ نکالنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ انصار احمد صاحب کا یہ طرز باعث داد و تحسین بھی ہے اور قابل عمل بھی۔

پروردگار عالم نے اس کائنات کو جس دلکش انداز میں سجایا وہ بہت جاذب اور پرکشش ہے۔ خالق کائنات نے اس دنیا میں اپنی مخلوقات کے لیے جہاں زمین کا فرش بچھایا وہیں آسمان کا شامیانہ اس کے سر کے اوپر لگایا۔ اس کے دن کو روشن کرنے کے لیے جہاں سورج بنایا، وہیں شب کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے چاند و ستارے کی قندیلیں روشن کیں۔ موسموں کے نظام کے ذریعے انسان کو سردی، گرمی اور برسات سے روبرو کرایا، خدا کی ان نعمتوں کا شمار انسان نہیں کرسکتا جن کو رب العالمین نے اشرف المخلوقات کے لیے سجایا ہے۔ غرضیکہ مختلف عنوانات سے آراستہ یہ مجموعہ جس میں معلومات بھی ہیں، سبق بھی ہے، نصیحت کے ساتھ ساتھ قدرت کی کاریگری کو سمجھنے کا ذریعہ بھی۔ موضوعات ایسے ہیں جن پر پہلے بھی غور و فکر کیا گیا ہے اور اب بھی لوگ کر رہے ہیں۔ کچھ ایسے موضوعات ہیں جو آج سنجیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ماحول کی صفائی اور ماحولیاتی آلودگی آج سنگین صورت اختیار کرکے زندگیوں کو تباہ کرنے کے درپے ہے، لیکن پھر بھی انسان اس کے تئیں لاپرواہی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کررہا ہے۔

فہرست میں پر نظر ڈالتے ہی کتاب کی ضرورت و اہمیت سمجھ میں آجاتی ہے۔ سائنس کی اہمیت ایک ایسا موضوع ہے جس کا گھیرا آج ہر انسان کے گرد نظر آجاتا ہے اور ہر شخص اس کی اہمیت و افادیت کا قائل ہے۔ تندرستی اور ہوا، ماحول کی صفائی، ہوا کے بغیر، آکسیجن، سانس اور ہوا، ہوا میں آلودگی، ہوائی آلودگی کے نقصانات، ہوا کی آلودگی سے بچنے کا طریقہ وغیرہ بھی صحت سے متعلق ہیں اس لیے ان کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بعد لو سے حفاظت، لو کا علاج، پانی، پانی کی اہمیت، پانی اور غذا، پانی کے اجزا، پانی کی گندگی، خراب پانی کے نقصانات، صاف پانی، بارش کا پانی، چشمہ، کنواں، دریا، جھیل وغیرہ جیسے موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔ نظم 'انسان اور درخت' میں وہ انسانوں کے لیے درخت کتنے اہم ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

پیڑ پودے دوست ہیں انسان کے | بلکہ وہ ہیں دوست بھی حیوان کے
ہم سے ان کی، ان کی ہم سے زندگی | ہوں گے حیراں، آپ یہ سب جان کے

اس طرح انھوں نے اپنی مختلف نظموں سے الگ الگ طریقے سے درس و نصیحت کا بھی کام لیا ہے۔ جس کی مثالیں آپ 'ہوا کی آلودگی سے بچنے کا طریقہ'، پانی اور غذا، پانی نہانے اور دھونے کے لیے، پانی کو نقصان پہنچانے والے اجزا، خراب پانی کے نقصانات وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ انصار احمد معروفی نے جس میدان سخن کا انتخاب کیا ہے وہ اہمیت کا حامل تو ہے ہی، مشکل بھی ہے۔ ان موضوعات پر منظوم صورت میں اپنے سخن کو پرواز دینا نہایت جداگانہ قدم ہے۔ جس کے لیے وہ لائق داد و تحسین ہیں۔ مجھے اس کا بخوبی اندازہ بھی ہے کہ بچوں میں ان کی یہ کتابیں مقبول ہونے کے ساتھ بچوں کے ادب میں ایک اضافہ ثابت ہوں گی۔

51 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 20 روپے ہے۔

مبصر: مظہر حسنین، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تنقید و تحقیق

گیسوئے اسلوب

مصنف: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

محلہ فیض اللہ خاں، حامد کالونی، دربھنگہ 846004 (بہار)

ڈاکٹر امام اعظم ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ دنیائے شعروادب میں مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ شاعری اور نثر نگاری دونوں سے گہری دلچسپی ہے۔ 'قربتوں کی دھوپ' (1995) اور 'نیلم کی آواز' (2014) ان کے شعری مجموعے ہیں۔ تنقید و تحقیق کے حوالے سے ان کی کتابیں 'مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ' اور 'مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری زون' اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکاڈمی کے لیے ارون کمل کے ہندی شعری مجموعے 'نئے علاقے میں' کا اردو ترجمہ (2001) اور عبدالغفور شہباز پر مونوگراف (2012) لکھا ہے۔ ''اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب: کثرت میں وحدت کا اظہار'' سے ان کے فکر ونظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے مضامین کے تین مجموعے 'گیسوئے تنقید' (2008)، 'گیسوئے تحریر' (2011) اور 'گیسوئے اسلوب' (2018) شائع ہوئے ہیں۔

مصنف نے مشمولہ مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں اصناف کے تعلق سے بحث و مباحثہ اور تحریکات کی تاریخ نیز زبان کے مباحث پر مبنی مضامین شامل ہیں جبکہ دوسرا حصہ شعروادب کی اہم شخصیات کے کارنامے اور ان کی کتابوں پر ہے۔ 'علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں' کے عنوان سے تحریر کا راست پہلو زبان اور تعلیم کی سمت میں سرسید احمد خاں کی کوششوں کا اظہار یہ ہے۔ 'کولکاتا تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں' ایک وقیع مضمون ہے۔ اس میں کلکتہ کی تاریخ کے روشن پہلو احسن طریقے سے بیان ہوئے ہیں اور شہر نگاراں کے ادبی اور ثقافتی منظر نامے کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ مضمون 'اکیسویں صدی میں بنگال میں اردو صحافت کی پیش رفت'۔ کولکاتا اور مغربی بنگال کے تعلق سے یہ دو مضامین مصنف کے اس خطہ سے دوستانہ اور گہرے روابط کو ظاہر کرتے ہیں۔ 'اردو نظموں کا پس منظر اور پیش منظر: 1985 کے بعد' نئی نسل کے نظم گو شعراء کی نظم نگاری کے بدلتے رنگ کا تذکرہ بھی اس میں ملتا ہے۔ اس مضمون میں نمائندہ نظم نگار شعراء کے ذکر سے نظم نگاری کی صورت گری کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ 'ہندوستانی فلمیں اور اردو: ایک منظر نامہ' میں ان تمام نکات سے گفتگو کی ہے جن سے فلم انڈسٹری اور اردو کا تعلق ہے۔ 'اکیسویں صدی میں اردو کے روشن نقوش' کے باطن میں اردو زبان کی ترقی وترویج اور اس کی وسعت نیز قومی سالمیت کا جذبہ موجزن ہے۔ مضمون 'جدید شاعری میں آزاد غزل کا ہیئتی تجربہ' میں اس کی ابتدا، فنی محاسن اور شعری تجربہ کرنے والے تخلیق کاروں کے اشعار کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم نے اس تجربہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔ آزاد غزل کے شعری مجموعوں اور اس صنف پر ہوئے تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے رسائل وجرائد کے گوشے شائع ہونے اور اس کی مقبولیت کا ذکر بھی کیا ہے 'مشترکہ تہذیب: ہندوستانی ثقافت کی شاخ گل' میں ملک کی سالمیت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی وترقی کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس میں اردو کے رول کو اجالا ہے۔ اردو زبان کو تمام عصری ضرورتوں میں استعمال، بطور خاص میڈیا کے ذریعے اس کی تشہیر اور عوامی بنانے کی ضرورت پر زور دیتا ہوا مضمون 'اردو زبان اور میڈیا' ہے۔ انھوں نے آن لائن انسائیکلو پیڈیا میں اردو وکی پیڈیا کا جائزہ لیا ہے اور یہاں شامل مواد سے غیر اطمینانی کا اظہار کیا ہے جو بجا ہے۔ یہاں نامکمل اور بعض دفعہ غلط اور غیر مصدقہ معلومات ملتی ہے۔

مضامین کا اگلا پڑاؤ شخصی کارناموں اور کتابوں پر محیط ہے۔ یہاں شعری کاوشوں کے حوالے سے گیارہ مضامین شخص اور شاعری پر ہیں۔ عبدالغفور شہباز، علی سردار جعفری، مجاز، شاد عارفی، علقمہ شبلی، لطف الرحمٰن، وسیم بریلوی، منصور عمر، سید تقی عابدی، ف س اعجاز اور سراج دہلوی کی شاعری کے مختلف ابعاد میں سے چند ایک کو موضوع بناتے ہوئے ان کی کارکردگی کو واضح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی کوشش رہتی ہے کہ فنکار کے کارنامے خواص وعوام کے درمیان آجائیں۔ اس کے لیے وہ متن کو بنیاد مانتے ہوئے فن کار کی ادب سے وابستگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، ابواللیث جاوید، یٰسین احمد کی افسانہ نگاری کو متعدد عنوانات کے تحت موضوع بنایا گیا ہے۔ انھوں نے جہاں بیدی اور منٹو کی عظمت پر خامہ فرسائی کی ہے تو آج کے توانا فکشن رائٹر یٰسین احمد کے موضوعات سے بھی بحث کی ہے۔ انھیں اردو کی عظیم روایتوں سے محبت ہے تو معاصر ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ مولانا آزاد کے افکار کو موضوع بنایا گیا ہے، احتشام حسین کے خطوط پر خامہ فرسائی کی گئی ہے تو معاصر تنقید نگاران نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، احمد سجاد، ارتضیٰ کریم، اور حقانی القاسمی کی تنقید نگاری کے چند گوشوں کو آشکارا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مصنف نے سید محمد اشرف کے ناول 'آخری سواریاں' اور صدیق عالم کے منظوم ناول 'چارنگ کی کشتی' کا جائزہ لیا ہے۔ 'گیسوئے اسلوب' میں دو مرحومین ادباء مظہر امام اور منصور عمر کے لیے تحریر کردہ تعزیتی مضامین ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں لکھے گئے ہیں۔ 'وہ جو بچھڑ گئے: مظہر امام' اور 'پھول مرجھا گئے خوشبو کا سفر جاری ہے: منصور عمر' کے عنوانات سے مضامین میں جدت ہے اور دونوں حضرات کو جاننے میں معاون بھی ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (داستانی طرز کے قلم کار)، ظہیر انور (سفر نامہ: ایک عرض تمنا)، جاوید دانش (اردو ڈراما کا ایک مقناطیسی عنوان)، حشمت کمال پاشا (ادب اطفال میں کمالات)، اقبال جاوید (آغا حشر کاشمیری: حیات اور ڈراما نگاری)، مصطفیٰ اکبر (افکار سے اظہار تک) اور ایس ایم آرزو (مزاح نگاری) پر مضامین کتاب اور صاحب کتاب کو جاننے کے لیے معاون ومددگار ہیں۔

ڈاکٹر امام ایمانداری سے تفہیم ادب کی جستجو میں منہمک ہیں۔

مجاہد آزادی شوکت عثمانی کی اردو خدمات

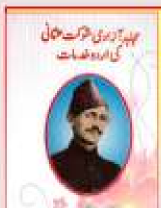

ناشر/مصنف: ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری

صفحات: 120، قیمت 85 روپے،

مبصر: ڈاکٹر ذکی طارق

564، کیلا روڈ، گئوشالہ پاٹھک، غازی آباد، یوپی

'مجاہدِ آزادی شوکت عثمانی کی اردو خدمات' 120 صفحات پر مشتمل ایک ایسی دستاویزی کتاب ہے جس کے ذریعہ ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری نے شوکت عثمانی کی حیات اور اُردو خدمات کا بھرپور جائزہ لے کر شوکت عثمانی کی تخلیقات کو اردو دنیا تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب سے قبل بھی ضیاء الحسن کی ایک تحقیقی کتاب 'مارواڑ میں اردو' عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ دونوں کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضیاء الحسن قادری کی اردو سے دلچسپی اور تحقیق سے غیر معمولی وابستگی اُن کو ایسے موضوعات کی جانب متوجہ کرتی ہے جو اردو زبان کو ہی نہیں بلکہ ادب کو بھی مالا مال کردیں

اور اردو تحقیق کے پیمانے پر بھی کھرے اتریں۔ آج جب کہ بیشتر تحقیق کوئی تمغہ حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں وہاں ضیاء الحسن قادری کا یہ تحقیقی کام بنظر تحسین دیکھا جانا چاہیے۔ اور اُن کے اس کام کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

شوکت عثمانی بیکانیر راجستھان کے باشندے تھے۔ 1901 میں بیکانیر میں جناب ضیاء الدین کے گھر پیدا ہوئے، ابھی چھ ماہ کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ایک برس کی عمر میں ہی والدہ بھی چل بسیں۔ دادی نور جہاں نے ہی اپنے پوتے کی پرورش کی۔ وہ بچپن سے ہی شوکت کو جن پریوں کی کہانیاں سنا کر انقلاب 1857 اور مجاہدین آزادی کے کارناموں کو سنایا کرتی تھیں۔ دادی کی اس پرورش کے ذریعہ ہی شوکت عثمانی کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ جاگ اٹھا اور انگریزوں کے لیے اُن کے ذہن میں نفرت کا جذبہ موجزن ہوگیا، جس کے سبب انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کو انگریزوں سے چھٹکارا دلانے کا عہد کرلیا، چنانچہ تعلیم کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھیوں اور محلّے کے باشندوں کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے لگے اور دھیرے دھیرے عملی جنگ میں ذہنی اور قلمی تعاون کے ساتھ کود پڑے۔ اس طرح اُن کا شمار راجستھان کے صفِ اوّل کے مجاہدین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جنگِ آزادی کے دوران 16 / برس جیل میں گذارے اور صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ نہ صرف جنگ آزادی کے عظیم سپاہی تھے بلکہ ایک عمدہ افسانہ نگار، ناول نگار، سائنس داں، شاعر، محقق، صحافی اور مختلف زبانوں پر عبور رکھنے والے ایسے ادیب تھے جنھوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور ملک کو آزاد کرانے میں عملی حصہ لے کر اپنا اور قوم کا نام روشن کیا۔ ایسے عظیم مجاہد آزادی کی وہ تمام تخلیقات جو اس کتاب کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں وہ یقیناً تباہ و برباد ہوجاتیں اگر ضیاء الحسن قادری اس طرف توجہ نہ کرتے۔

مصنف نے اس کتاب کے ذریعے ان کے حالاتِ زندگی، ان کی کل تخلیقات کا جائزہ، اُن کی اردو تخلیقات، سفرنامہ، ناول، بحیثیت افسانہ نگار، بحیثیت شاعر، اُن کے خطوط، اُن کے اسلوب، اُن کی تحقیقات کے نمونے اور فوٹو گیلری کے ذریعہ اُن کے، نیز اُن کے وارثان کے فوٹو اس کتاب میں شامل کیے ہیں جو شوکت عثمانی کی زندگی اور اُن کی کاوشوں اور ان کی اردو خدمات کا ایک بھرپور مکمل جائزہ ہے جو اُن کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ضیاء الحسن قادری مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضیاء الحسن قادری کا طرزِ تحریر نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ انھوں نے شوکت عثمانی کے حوالے سے جو گفتگو اپنی اس کتاب میں کی ہے وہ نہایت مدلل اور دلائل و براہین کے ساتھ کی ہے نیز شوکت عثمانی کی اُن تخلیقات کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو جابجا بکھری ہوئی تھیں جن کے ذریعہ شوکت عثمانی کے اسلوبِ فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔
بہر کیف ضیاء الحسن قادری کا یہ تحقیقی کام بہ نظرِ تحسین دیکھا جانا چاہیے۔ اس کے معیار اور وقار کا اندازہ اس کے مطالعے کے بعد بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

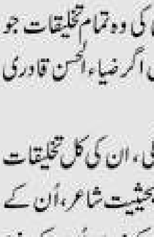

اردو عروض درپن

مصنف: کندن سنگھ کندن اراولی
صفحات: 272، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو عروض ہمیشہ ہی سے اختلاف کا باعث رہا۔ چونکہ اردو عروض مستعار لیا ہوا ہے، جس کا اصل مولد عرب و ایران ہے۔ اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیر ملکی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر زبان کا بھی ہے۔ ایسے میں اس کا امکان قوی ہوجاتا ہے کہ غیر زبان کے ہونے کے ناطے یہ اردو زبان میں کس طرح سے ہمسری کرسکتا ہے۔ اردو عروض کی بنیاد ناقص یا غیر سائنٹفک ہے، جو ہماری شعری برت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اردو عروض انتہائی مشکل ہے، خاص طور پر اس کا زحافی طریقہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ کچھ ناقدین نے اس مشکل کا یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ شعرا پنگل کو بنیاد مان کر شعر کہیں۔ جب کہ یہ کسی طور بھی قابل قبول نہیں۔ اردو شاعری پر یہ بھی الزام لگتا رہا ہے کہ اس کا اپنا کوئی عروض نہیں ہے۔ اردو شعرا عربی فارسی عروض کے محتاج ہیں، اس کمی کو دور کرنے کے لیے عروض پر غور و فکر کرنے والوں نے اپنی طرف سے کوشش کی۔ کچھ نے اس حوالے سے مضامین قلمبند کیے۔ گیان چند جین نے 'اردو کا اپنا عروض' کے نام سے کتاب لکھی۔ کندن سنگھ کندن اراولی نے 'احتساب العروض' کے نام سے اس سے پہلے ایک کتاب شائع کی تھی، جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اب ان کی اس حوالے سے دوسری کتاب 'اردو عروض درپن' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے، جو کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔

زیر نظر کتاب 'اردو عروض درپن' میں کندن سنگھ کندن اراولی نے پیش لفظ کے لکھنے علاوہ عروض کیا ہے؟، تالیف ارکانِ اثنا عشر، عروض کا ارتقا۔ پنگل سے خلیل تک، بعض اصناف سخن، بحر سازی کے قاعدے، اصواتی و اجزائی دائرے، دائرہ منعکسہ کی حقیقت، بحرِ خلیل و بحر فوشی، اصولِ بحر متقابل، بیانِ زحافات، بحور کی تفصیل، احکامِ عروض، تقطیع کے اصول، شکست، اعتراضوں کے جواب، بیانِ بحور مستعمل، بحر متقارب، بحر متدارک، بحر ہزج، بیان رباعی، بحر رجز، بحر رمل، بحر وافر و کامل، بحر کامل، بحر طویل، بحر مدید، بحر عریض، بحر بسیط، بحر عمیق، بحر وسیع، بحر مضارع، بحر مقتضب، بحر منسرح، بحر مجتث، بحر مشاکل، بحر خفیف، بحر قریب، بحر جدید، بحر سریع، مفروقی بحریں مع دوائر، زحافات متنازعہ اور ان کا حل، مزید بیان زحافاتِ متنازعہ جیسے اہم نکات پر گفتگو کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'اردو عروض درپن' میں کندن سنگھ کندن اراولی نے جس طرح سے اپنے معروضات پیش کیے ہیں، وہ یقیناً اردو عروض کے لیے کافی اہم ہے۔ عنوان چشتی، گیان چند جین اور کمال احمد صدیقی نے جس طرح سے عروض پر کام کیا ہے، کندن سنگھ کندن اراولی نے اپنے اس کام سے اسی حصے کو مزید بہتر اور سائنٹفک طریقے سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے سنسکرت اور عربی عروض کو مماثل قرار دیتے ہوئے اس کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ انھوں نے بعض ایسی عربی اور فارسی بحروں کی نشاندہی کی ہے، جن کی اصل سنسکرت عروض کی ہے۔ بحر متقارب، ہزج، رجز، رمل، وافر اور کامل جیسی بحروں کے آہنگ 'چھند سوتر' میں صدیوں پہلے سے موجود ہیں۔ مصنف نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ 'چھند سوتر' عرب پہنچا تو خلیل بن احمد بصری نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس نے عربی کی بعض بحریں عربی شعر کی چھان بین کرکے 'چھند سوتر' سے بنائیں۔ خلیل بن احمد بصری نے ان بحروں کو اس طرح سے عربی زدہ بنا دیا تھا کہ ہندوستان کے علما اپنی ہی چیز کو نہیں پہچان سکے لیکن بعد میں جب لوگوں نے اس پر غور کیا تو اس کا نتیجہ کچھ اور سامنے آیا۔ یہ بحریں اردو شاعری میں عربی ناموں سے مستعمل ہیں۔ لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو معاملہ بالکل برعکس ہوگیا۔ اس طرح سے ان علما کے غور وفکر کے نتیجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو پر جو یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ یہ بے عروض زبان ہے، اس کی نفی ہوتی ہے۔ کندن سنگھ کندن اراولی کی مذکورہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اس لیے بھی بہت اہم ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'اردو عروض درپن' میں کندن سنگھ کندن اراولی نے جس طرح سے اپنے معروضات پیش کیے ہیں، وہ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔ لیکن انھوں نے اس کتاب میں ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جب کہ ان الفاظ کا متبادل اردو زبان میں موجود ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں کہ ہندی الفاظ کا استعمال کیا جائے، لیکن اس کا متبادل اگر موجود ہے تو اسی کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ کتاب کے عنوان سے آخری صفحے تک ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پروف ریڈنگ کی بہت ساری جگہوں میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں 'اردو عروض درپن' قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

بنگال میں اردو نظم نگاری

مصنف: ایم نصر اللہ نصر

صفحات: 416، قیمت: 400 روپے

ناشر: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: مومنہ خاتون

S-2/5A، تیسری منزل، فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگا بائی، نئی دہلی

اردو شعر و ادب کے میدان میں ایم۔ نصر اللہ نصر کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ صنفِ شاعری میں 'امکان سے آگے' اور 'ثنائے رب' کے ذریعہ اپنی شناخت مستحکم کی۔ جب کہ تنقید و تحقیق کے میدان میں 'افہامِ ادب' اور 'انتقاد و استبصار' کے ذریعہ اپنی انفرادیت قائم کی۔ ان کی قدر شناسی پر مختلف اردو اکادمیوں نے انھیں اعزازات و انعامات سے بھی نوازا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'بنگال میں اردو نظم نگاری' ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوش کا ایک عملی نمونہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو نظم نگاری کو موضوع بنا کر ایک خاص خطے اور صوبے کے نظم گو شعرا کے کلام کی روشنی میں ان کی فنی و فکری بصیرت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے معیاری اور غیر معیاری کی درجہ بندی نہ کر کے فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہی بتائیں کن شعرا کا کلام اعلیٰ اور معیاری ہے اور کن کا پست اور غیر معیاری۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کسی خاص ازم کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا ایک خاص معیارِ نقد اور زاویہ نظر ہے جس کی روشنی میں وہ شعرا کے کلام کی توضیح و تشریح کرتے ہیں اور ان کی فنی و فکری سطح پر مثبت اور منفی رویوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مصنف کی خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ کسی کے کلام پر تنقید یا تبصرہ کرتے ہوئے جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے ایک متوازن رویہ اختیار کرتے ہیں۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تنقید کرتے ہوئے وہ کہیں علاقائیت یا عصبیت کا شکار نظر نہیں آتے بلکہ ایک معتدل اور متوازن رویہ کے ساتھ میانہ رو نقاد نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان کی سطح پر وہ اپنی بات دو ٹوک اور بے باکانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی گنجلک یا پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ فکر و خیال کی پیش کش کی سطح پر ان کی تحریر صاف اور واضح نظر آتی ہے۔

ایم۔ نصر اللہ نصر کی یہ کتاب بنگال کے ان شعرا و ادبا پر مشتمل ہے جنھوں نے نظم کے میدان میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ مصنف نے بدر الزماں بدر کلکتوی کے علاوہ وحشت کلکتوی، واقف بہاری، آرزو سہارنپوری، اشک امرتسری، جمیل مظہری، عباس علی خان بیخود، رضا مظہری، پرویز شاہدی، مرزا بیدل مرشدآبادی، حسن نجمی، سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، ناظم سلطانپوری، محمد امین، مطرب بلیاوی، علقمہ شبلی، مظہر امام، رونق نعیم، محمد سمیع اللہ اسد، حشم الرمضان، احمد الیاس، نور بھارتی، ساگر چاپدانوی، اعزاز افضل، قیصر شمیم، حشمت فتح پوری، عین رشید، نور پیکر، اقبال کرشن، حسن اثر، بازغ بہاری، آفاق میرزا آفاق، ڈاکٹر یوسف تقی، وحید عرشی، انجم عظیم آبادی، ایم۔ کے۔ اثر، اسماعیل پرواز، خالق عبداللہ، واحد آروی، احسان ور بھنگوی، ڈاکٹر عبدالروف، حرمت الاکرام، ناظر الحسینی، سہیل واسطی، حامی گورکھپوری، محبوب انور، وکیل اختر، نصر غزالی، شہود عالم آفاقی، احسن شفیق، ایم علی (ہوڑہ) نقیب اختر اور ڈاکٹر شمیم انور وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل نظمیہ شاعری کے ذریعہ ادبی دنیا میں اپنا نام اور کام دونوں روشن کیا۔

مصنف نے آزادی کے بعد کے جن نظم گو شعرا کا ذکر کیا ہے ان میں ف۔ س۔ اعجاز، ڈاکٹر معصوم شرقی، زماں قاسمی، ڈاکٹر شبیر ابروی، رفیق انجم، منور رانا، اشہر ہاشمی، جیسے درجنوں شعرا شامل ہیں۔ کئی اہم نظم گو شعرا کا کلام شامل کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں مصنف کے مختصر مضامین 'اختصار' 'نثری نظم: اثبات و نفی کے آئینے میں' اور 'بنگال میں اردو زبان کا ارتقا' کے عنوان سے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ احمد امتیاز کا ایک مضمون 'مستعار' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ تمام مضامین اور شعرا کے کلام اور ان کے انتخاب سے قبل ابتدا میں 'اپنی بات' کے عنوان سے مصنف کا پیش لفظ شامل ہے اس کے بعد ڈاکٹر کرامت علی کرامت کا 'مقدمہ' اور پھر 'بنگال میں اردو نظم نگاری (آزادی سے قبل)' کے عنوان سے مصنف کا ایک مضمون شامل ہے۔ مذکورہ تمام مضامین اور نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بنگال کے نظم گو شعرا کے حوالے سے ایک اہم دستاویزی کتاب ہے۔ امید ہے کی علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی حد درجہ پذیرائی ہوگی۔

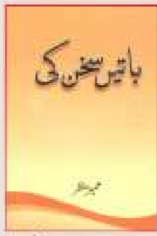

باتیں سخن کی

مصنف: عمیر منظر

صفحات: 192، قیمت: 299، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

مبصر: نازیہ ممتاز، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سخن فہمی کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی پرانی سخن سنجی کی۔ ذکر چاہے نکات الشعرا کا ہو یا پھر آبِ حیات کا یا اسی طرح سے دوسرے تذکروں کا، سب میں شاعری پر نقد و تبصرہ موجود ہے۔ تنقید کی روایت کی بات ہم نکات الشعرا سے کرتے ہیں تو تحقیق کی ابتدائی کڑیاں آبِ حیات میں تلاش کرتے ہیں۔ نکات الشعرا سے اب تک یہ سلسلہ اسی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، جس طرح سے اس زمانے میں تھا۔ فرق اتنا ہے کہ تناسب کیا ہے؟ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے، مطالعہ شعر و شاعری نئی نئی چیزوں سے آشنا ہو رہا۔ فن پارے میں ناقدین نہ جانے کیا کیا تلاش کرتے ہیں۔ اسی تلاش و جستجو کے توسط سے ادب مالا مال ہو رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک تازہ مطبوعہ ڈاکٹر عمیر منظر کی 'باتیں سخن کی' ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ صدی کے منتخب شعرا کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ان کی پانچ کتابیں منظر عام پر آئیں، جنھیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ باتیں سخن کی عمیر منظر کی چھٹی کتاب ہے۔

'باتیں سخن کی' میں کل بیس مقالے شامل ہیں۔ جس کی تفصیل بالترتیب داغ اور دبستان داغ، حالی کی نظموں میں تہذیبی جلوہ گری، شبلی کی شاعری، شبلی اور مثنوی 'صبح امید'، دبستان داغ کا ایک گمنام شاعر: باغ سنبھلی، مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری، میراجی کی شاعری: ارضی اور تہذیبی حوالے، دبستان لکھنؤ کا ایک بھولا بسرا شاعر صدف

لکھنؤ، تاباں کی شعری جہات، کیف بھوپالی اردو شاعری کی طلسماتی شخصیت، الفاظ کا مصور۔ زیب غوری، دیار شبلی کا نغزگو شاعر اختر مسلمی، بلراج کومل کی نظم نگاری، جدید غزل کا غیر معمولی شاعری۔ ظفر اقبال، احمد مشتاق کی غزل گوئی، شہریار کی غزل گوئی کے نمایاں پہلو، زبیر رضوی کی نظم نگاری، شجاع خاور اور دوسرا شجر، تلخیٔ حیات کا مغنی تشنہ عالمی اور اردو کی غزلیہ شاعری پر فارسی غزل کے اثرات، ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'باتیں سخن کی' میں مصنف نے چار صفحے کا جو'پیش لفظ' لکھا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ ایسا حصہ ہے، جہاں تفصیل کے بجائے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تنقید کی روایت اور اس کی اہمیت کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے۔ ایسے میں مصنف نے اختصار سے وہ ساری باتیں کہہ دی ہیں، جس کا تعلق براہ راست نقد شعر اور اس کی روایت سے ہے۔ پروفیسر سراج اجملی کا قطعۂ تاریخ بھی اسی روایت کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

زیرنظر کتاب 'باتیں سخن کی' کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے تحقیق وتنقید کے امتزاج کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ بعض نے ان شعرا کے فن پر بھی قلم اٹھایا ہے، جن کے تعلق سے عام لوگ ناواقف ہیں۔ اس ضمن میں شہریار، احمد مشتاق، ظفر اقبال اور زیب غوری کے نام لیے ہی جاتے ہیں اور یہ نام مشہور بھی ہیں، البتہ معاصر شاعری سے ایسے ناموں کی تلاش کرنا اور انھیں غزل کی روایت کے تناظر میں پوری قوت سے پیش کرنا بھی اہم بات ہے۔ اس سلسلے میں اختر مسلمی، صدف لکھنوی اور تشنہ عالمی کے نام عام اردو حلقے کے لیے نئی دریافت کہے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کافی اہم ہے کہ لوگ ایسے شعرا سے واقف بھی ہو سکیں گے۔ اردو کی غزلیہ شاعری پر فارسی غزل کے اثرات، اسی سلسلے کا حصہ ہے، جس کا تعلق براہ راست تحقیق سے ہے۔ اگر مصنف نے تحقیقی مضامین کو ایک حصے میں اور تنقیدی مضامین کو دوسرے حصے میں ترتیب دیا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ باوجود اس کے کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

'باتیں سخن کی' کی دراصل عمیر منظر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کل بیس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کو شاعر کی سن پیدائش کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ چند مضامین کا مجموعہ ہے، لیکن یہ دراصل شاعری کے ڈیڑھ سو سالہ زمانے کو محیط ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ شعر و شاعری کی تعبیر وتفہیم آسان کام نہیں۔ ایسے میں کلاسیکی شعرا سے جدید شعرا کا مطالعہ پیش کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مصنف شاعری کی روایت اور اس میں کیا کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان سب سے واقف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شعرا کے کلام کی کئی کئی شرحیں موجود ہیں۔ باوجود اس کے ان شعرا کے کلام پر مزید غور وخوض کیا جا رہا ہے، اور نئے نئے معانی ومطالب سے قارئین کو آشنا کیا جا رہا ہے۔ باتیں سخن کی، میں عمیر منظر نے اپنے معروضات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے شاعری کا مطالعہ فنی اعتبار سے بھی کیا ہے اور موضوعاتی اعتبار سے بھی۔ اس کتاب میں انھوں نے تنقید کا معیاری اسلوب اپنایا ہے، جس سے کسی بھی طرح کی الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔

زیر تبصرہ کتاب 'باتیں سخن کی' میں عمیر منظر نے جن شعرا کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے، وہ ہماری کلاسیکی شاعری کی روایت کے اہم ترین نام ہیں، موجودہ عہد کے جن فن پاروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، وہ ہماری شاعری کی موجودہ منظر نامے کے بہترین عکاس ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب کافی اہم ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے، بظاہر شکل وشباہت بھی دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

ادبی آگہی

مصنف: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

صفحات: 288، قیمت: 350/روپے

ناشر: دارالادب پبلی کیشنز، فراشکنڈ بڈگام، کشمیر

مبصر: ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

R-81/3، جوگائی بائی ایکسٹینشن، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کا نام اردو کے علمی وادبی حلقے میں کئی حیثیتوں سے کافی جانا پہچانا سا ہے۔ جہاں وہ ایک باکمال صحافی، مقبول افسانہ نگار، منفرد انشائیہ نگار اور بہترین استاد ہیں وہیں وہ ایک ممتاز محقق اور ناقد بھی ہیں بلکہ جنت نظیر کشمیر میں گزشتہ ڈیڑھ دو دہائیوں میں جن قلم کاروں کو اپنی تحریروں کی بدولت اعتبار حاصل ہوا ہے ان میں ایک بڑا نام ڈاکٹر زور کا بھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے 2002 میں پہلی بار اپنے انشائیوں کے مجموعہ 'فکر فردا' کے ذریعہ باقاعدہ ایک مصنف کے طور پر ادبی دنیا میں قدم رکھا اور تب سے آج تک تواتر کے ساتھ لکھ ہی رہے ہیں اور اب تک ان کی 19 سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں ناول کا فن، ارتقا اور'لندن کی ایک رات'، ناول، پریم چند اور'میدان عمل'، روداد اردو، پروفیسر محمد مجیب کا ڈراما' خانہ جنگی' کا ایک مطالعہ، سید امتیاز علی تاج کا ڈراما' انارکلی' ایک مطالعہ، دبستان جموں وکشمیر میں اردو اور 1947 کے بعد اردو ڈراما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ وہ ایک ششماہی رسالہ'دبستان علم وادب' کے سرپرست اعلیٰ بھی ہیں۔ ہماری زبان، اردو دنیا، ایوان اردو، آجکل اور شیرازہ کے علاوہ ملک وبیرون ملک کے مختلف موقر رسائل وجرائد میں بھی ان کی تحریریں وقتاً فوقتاً زینت بنتی رہتی ہیں۔ زیر نظر کتاب'ادبی آگہی' انھیں رسائل وجرائد میں شائع شدہ مضامین ومقالات کی کتابی شکل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ادبی آگہی' میں کل 36 مضامین ومقالات شامل ہیں اور ان میں سے ہر مضمون اپنے موضوع ومواد کے اعتبار سے بڑے اہم اور معلومات افزا ہیں۔ کتاب میں شامل ابتدائی کچھ مضامین اردو زبان وادب کی عالمگیریت، اس کی تعلیم وتعلم اور اس کے ادیبوں کے مسائل ومعاملات سے متعلق ہیں جبکہ بعض دیگر مقالے کچھ سرکردہ ادبی شخصیات مثلاً میرامن دہلوی، محمد حسین آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی حیات وخدمات پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مضامین مثلاً منٹو کا ناولٹ بغیر عنوان کے، کرشن چندر کا افسانہ 'کالو بھنگی' اور راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'گرم کوٹ' میں مصنف نے نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ ان کے تحقیقی وتنقیدی تجزیے پیش کیے ہیں۔ یہ تجزیے جہاں ادب کے مبتدی طلبہ کے لیے حد درجہ اہم اور کارآمد ہیں اور ان کے افہام وتفہیم میں بڑی آسانیاں فراہم کرتے ہیں، وہیں وہ ان کے لیے نئے تنقیدی دریچے بھی وا کرتے ہیں۔ فکشن اور فکشن نگاروں کے بعد مصنف کتاب نے اپنے مضامین فیض احمد فیض کا تنقیدی شعور، افکار سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد کی عصری معنویت، کیا عجیب لوگ تھے اور اردو کا ایک ہر دل عزیز ادیب اطہر پرویز، بیسول بیکٹ ایک مطالعہ، علی عباس حسینی کی ڈراما نگاری، نسیم حجازی کا ادبی ڈراما، پشکر ناتھ کا ریڈیو ڈراما' ڈیرا' ایک مطالعہ اور عصری اردو ڈراما' تھیٹر سمت و رفتار میں بڑی خوبصورتی اور دراکی کے ساتھ ان کے افکار ونظریات پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے جہاں ان مشاہیر کے تنقیدی شعور، فکر وآگہی اور ادبی امتیاز وشناخت کا علم وادراک ہوتا ہے وہیں خود مصنف کی وسعت مطالعہ، ادبی

دلچسپی اور گہرائی و گیرائی کا بھی علم ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا مضامین کے علاوہ خاکہ برائے پروجیکٹ، کشمیری پنڈتوں کی رسومات کا پس منظر، جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کے درپیش مسائل، جموں و کشمیر میں اردو ادیبوں کے مسائل، تحریک آزادی ہند اور جموں و کشمیر کے اردو شعرا، ڈاکٹر فرید پربتی کچھ یادیں کچھ باتیں، تنقید رباعی: ایک جائزہ، اردو لغت نگاری: روایت و ارتقا، اکبر حیدری کاشمیری ایک عالی محقق، کشمیر کی صحافت اور ادبی رسائل، نور شاہ کی اردو شناسی، نور شاہ کا ڈراما 'سفر زندگی کا' اور کشمیر سے گوا تک شامل کتاب مضامین بھی اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے بڑے اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض مضامین کی اہمیت تو اس حیثیت سے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ ان کے مطالعے سے نہ صرف کشمیر میں اردو زبان و ادب کی صورت حال اور اس کے مسائل و امکانات کا بھرپور علم ہوتا ہے بلکہ ان سے وہاں کے بہت سے اہم ادیبوں، قلم کاروں اور فن کاروں کی علمی و ادبی خدمات اور اردو کے تئیں ان کی دین (Contributions) سے بھی واقفیت بہم پہنچتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں گرچہ مصنف کے کچھ ایسے مضامین و مقالات بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی تحریر کیے تھے اور ان میں کچھ سقم بھی موجود ہیں مگر باوجود اس کے ان میں بھی ان کا وہی تحقیقی و تنقیدی شعور دیکھنے کو ملتا ہے جو ان کے بعد کے مضامین کا خاصہ ہے اور جو انھیں نہ صرف اپنے ہم عصر کشمیری لکھنے والوں سے ممیز و ممتاز بناتا ہے بلکہ ان کے پاس ادب کی تفہیم و تعبیر میں ایک نئی تنقیدی ذہانت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ طباعت و کمپوزنگ ہر دو لحاظ سے یہ کتاب بے حد عمدہ اور نفیس معلوم ہوتی ہے۔ سرورق حد درجہ جاذب نظر اور دلکش ہے۔ کتاب کی ضخامت اور مواد کے لحاظ سے قیمت تین سو کے بجائے ڈیڑھ سو سے دو سو کے درمیان ہوتی تو زیادہ موزوں ہوتی۔

قوی امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی دیگر تصانیف مثلاً '1947 کے بعد اردو ڈراما'، 'اردو امتحان اور فکر فردا' وغیرہ کی طرح امید کی جاتی ہے کہ اس کتاب کی بھی نہ صرف خاطر خواہ پذیرائی ہوگی بلکہ زبان و ادب اور تحقیق و تنقید کے باذوق قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر مصنف کی خوب خوصلہ افزائی بھی فرمائیں گے۔

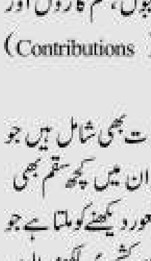

نیرنگ قلم

مصنف: انوار الحسن وسطوی

صفحات: 224، قیمت: 225 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: وسیم مینائی، تارین جلال نگر، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

'نیرنگ قلم' انوار الحسن وسطوی کے تحقیق و تنقیدی اور تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے سوانحی اشاریہ کے ساتھ 15 تنقیدی مضامین اور مختلف کتابوں پر ان کی جانب سے کیے گئے 15 تبصرے شامل کیے ہیں۔

نیرنگ قلم میں مصنف نے حرف آغاز کے عنوان سے اپنی بات لکھی ہے جس میں سبب تالیف کتاب، انتساب اور شکر و دعا کو جگہ دی ہے۔ 'حرف چند' کے عنوان سے ڈاکٹر ریحان غنی نے انوار الحسن وسطوی کی مجموعی خدمات کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ 'نیرنگ قلم' اور 'نثر وسطوی کا رنگ و آہنگ' کے عنوان سے بدر محمدی نے مصنف کی زندگی اور ان کے قلمی سفر کا احاطہ کرتے ہوئے بہت سی ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جنھیں آج کے زمانے میں قلمی یا لسانی بیانات کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ انھوں نے ان کے دینی و دنیوی اور علمی و اخلاقی پہلوؤں کو خوبصورت لب و لہجہ میں پیش کیا ہے۔ دراصل ان دونوں کی اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں اور پہروں ادبی مباحث کا سلسلہ رہتا ہے۔ اسی لیے یہ انوار الحسن وسطوی کو بہت قریب سے جانتے ہیں اور ان کے افکار کا رنگ پہچانتے ہیں۔

انوار الحسن وسطوی اس دور میں اردو ادب کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ انھوں نے اردو کے شائقین کے لیے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے وقفے وقفے سے پیش کیے ہیں۔ رشحات قلم، نقوش قلم، نیرنگ قلم (زیر تبصرہ کتاب) اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب انعکاس قلم زیر ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی کتابیں ہیں۔ مذکورہ مجموعہ مضامین میں شعرا و ادبا کی سوانح اور ان کے کارناموں کی تفصیلات کو نہ صرف یکجا کیا بلکہ حسن فکر و قلم کو فن اور افادیت کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے قلم کی جولانی اور فن گیری کا ثبوت دیتے ہوئے پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں جن شخصیات پر مضامین شامل ہیں ان میں ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی سرفہرست ہیں۔ یہ وہ نام ہے کہ جن کی وجہ سے بہار میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ ان کی علمی خدمات سے شہر ادب کے تمام مکین اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں ضیا عظیم آبادی، متین عمادی، پروفیسر رضیہ تبسم، ناوک حمزہ پوری، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی از یں جیسے متعدد اہل قلم کے احوال و کوائف اور افکار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔ محض اتنا ہی نہیں دوسرے اصناف و اسالیب کے علم برداران پر بھی مضامین درج ہیں۔

نیرنگ قلم میں شامل مضامین اور تبصروں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انوار الحسن وسطوی کا مطالعہ وسیع ہے۔ موصوف ہر کتاب کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کرتے ہیں پھر مصدقانہ پرکھ کے بعد اپنے بیانات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

نیرنگ قلم کی سطر سطر سادہ و سلیس جملوں کا نمونہ ہے۔ بیان میں لذت و چاشنی اور تسلسل ہے۔ مضامین کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے واقعات و حکایات کو جگہ دی گئی۔ یہ سب اس خوبصورتی اور تسلسل کے ساتھ کیا گیا ہے کہ قاری کے سامنے کوئی دقت یا الجھن پیدا نہ ہو۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو۔

قارئین کو نہ صرف 'نیرنگ قلم' بلکہ ان کی دیگر تصانیف کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اس سے نہ صرف شعرا و ادبا اور گوناگوں فنون و اسالیب سے وابستہ حضرات سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا بلکہ انوار الحسن وسطوی ثم حاجی پوری کے قلم کی روش، فکری تنوع اور جذبۂ خدمت ادب سے بھی مستفید ہوسکیں گے۔

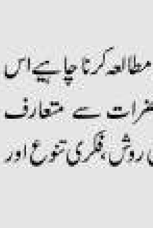

نیویارک میں اردو غزل: مامون ایمن کے حوالے سے

مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 72، قیمت: 100 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عالیہ، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف مناظر عاشق ہرگانوی کی سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی و انگریزی ادب پر بھی ان کی نظر ہے۔ ہندی و انگریزی میں ان کی نظمیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اپنی بسیار نویسی کے لیے مشہور ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ہرگانوی صاحب نے نیویارک میں مقیم اردو غزل گو کا مختصر و جامع تذکرہ کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب مامون ایمن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'نئی تحریر'

کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ جس میں نیویارک میں اردو غزل سے متعلق تنقیدی مباحث شامل ہیں۔ مامون ایمن نے نیویارک کے غزل گو شعرا: محمد حسین شکیل آزاد، اعجاز حسین بھٹی، ڈاکٹر مقصود جعفری، حماد رضا خان، سید تقی عابدی، ظفر زیدی وغیرہ اور شاعرات مونا شہاب، نغمہ صبوحی، حمیرا رحمٰن، ڈاکٹر شہلا نقوی اور رشیدہ عیاں وغیرہم پر مواد فراہم کر کے ان کی شناخت قائم کی ہے۔ ہرگانوی صاحب نے ان شعرا و شاعرات کے بارے میں مزید معلومات کو باقاعدہ ان کی تصویروں کے ساتھ اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور ان کی شاعری پر تنقیدی آرا بھی پیش کی ہیں۔

ہرگانوی صاحب کے مطابق مامون ایمن نے ادبی تاریخ میں ایک نیا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس جمیل جالبی کے علاوہ دوسرے ادبی مؤرخ مثلاً رام بابو سکسینہ، اعجاز حسین، وہاب اشرفی، سلیم اختر، سیدہ جعفر، انور سدید اور گیان چند جین وغیرہ نے مصنفین کے سوانحی خاکوں اور مختصری ادبی تنقید کے علاوہ کوئی دوسرا تصور پیش نہیں کیا ہے۔ یا ادب کی Shaping کے عوامل پر توجہ نہیں دی ہے۔ ہرگانوی اور مامون ایمن کے تمام بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ اردو کے کسی مؤرخ نے ان نکات پر توجہ نہیں دی جن پر ان حضرات نے اپنے سوالنامے کی بنیاد قائم کی ہے بلکہ قدیم گلدستوں تک میں اس طرح کے کوائف دستیاب ہیں۔

دراصل یہ تصنیف، تنقیدی سے زیادہ تعارفی ہے اس میں ایسے شعرا کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو صرف موزوں طبع معلوم ہوتے ہیں اور ابھی ان کی غزل کو ریاضت کی بھٹی میں سلگنا ہے۔ تقی عابدی اور مونا شہاب جیسے پختہ گو شعرا بھی شامل ہیں جو عرصہ دراز سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ کتاب میں ہلکا سا غیر واضح مسئلہ یہ بھی ہے کہ مامون ایمن کی حدیں کہاں ختم ہیں اور مناظر عاشق کی حد کہاں شروع ہوتی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے امریکہ میں مقیم ان شعرا کے نمونہ کلام شائع کر کے بھی آسودگیٔ شوق کا سامان فراہم کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ ہرگانوی صاحب نیویارک کی غزل سے قارئین کو متعارف کرانے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ کتاب میں صحتِ زبان و بیان اور جملوں کی ساخت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ طباعت کے اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے۔ اُمید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی دیگر تصانیف کی طرح اس تصنیف کی بھی پذیرائی کی جائے گی۔

خودنوشت

یاد ایام

مصنف: محمد ایوب واقف

صفحات: 194، قیمت: 250 روپے

ناشر: تحریر نو پبلی کیشنز

مبصر: ڈاکٹر غلام اشرف قادری

صدر شعبۂ فارسی، جی ایف کالج، شاہجہاں پور

فطرت انسانی میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان اپنی زندگی کے گونا گوں تجربات کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی اصناف ادب کو مکمل یا قدرے دخل ہے۔ خودنوشت سوانح عمری، ملفوظات، خطوط، روزنامچہ وغیرہ۔ ان میں خودنوشت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے یا یوں کہیے کہ دوسری اصناف کے مقابلے میں خودنوشت پر اہل قلم حضرات زیادہ دھیان دیتے ہیں۔

'یاد ایام' محمد ایوب واقف کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ تحریر نو پبلی کیشنز کی نشر کردہ یہ کتاب 2017 میں شائع ہوئی، 194 صفحات کی اس کتاب میں آخری 16 صفحات عکسی ہیں باقی تحریری۔ آغاز کتاب میں دو صفحات پر مشتمل انتساب نامہ اور اگلے دو صفحوں پر روڈ میپ (نقش راہ) کے بعد فہرست مندرجات لائے ہیں۔ محمد ایوب واقف نے 'ابتدائیہ' میں سبب تالیف اور اپنی حق بیانی کے دعوے کو بڑی مضبوطی سے پیش کیا ہے۔ اسی ضمن میں نام نہاد خودنوشت سوانح عمری کے چند مصنفوں کی سہویات کو بھی بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ نیاز فتح پوری کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محمد ایوب واقف ایک معروف، معتبر اور مشاق نثر نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی نثر میں روانی و سلاست ہے۔ جا بجا لفظی بندشیں انگوٹھی میں نگینے کی مانند ہیں۔ زبان پر قدرت کے سبب برمحل الفاظ کا انتخاب لائق ستائش ہے۔ صنفی ہنرمندی اور قدرت زبان و بیان نے ذوق قلمرانی کو قوت اور خیالات کو رفعت بخشی ہے۔ ادبی محفلوں میں شرکت، نامور شعرا و ادبا سے شخصی ملاقاتیں اور نصف صدی سے زیادہ کے تجربات اور ان سب کو صفحات پر بکھیرنے کا ہنر انہیں دوسرے خودنوشت مصنفین کے درمیان ممتاز بناتا ہے۔

محمد ایوب واقف نے اس کتاب میں اعظم گڑھ کی ادبی و فنی فضا پر مفصل بحث کی ہے۔ ساتھ ہی وہاں کا ایک تاریخی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ دارالمصنفین اور اس سے منسلک اشخاص کی علمی خدمات، دیگر شعری و ادبی سرمایوں کی بہتات، تعلیم و تعلم اور فنون لطیفہ سے آراستہ گلی کوچے، سماجی و سیاسی، اصلاحی و اخلاقی نظریوں کے حسین نظارے اس کتاب کے آئینہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج بھی یہاں کی ادبی خدمات سے اردو ادب گراں بار ہے۔ ایسی صورت میں فقط ممنونیت سے کام نہ ہوگا بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر اردو کی خدمت انجام دینی پڑے گی اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے کہ جس میں اعظم گڑھ اور گرد و نواح کی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ جو اساتذۂ ادب نے راہیں ہموار کی تھیں انہی راہوں پر چل کر محمد ایوب واقف نے اردو کو بہت کچھ دیا۔ ان کی تفصیل 'میری شائع شدہ کتابوں کا تعارف' کے عنوان سے دی ہے۔

واقف نے 'یاد ایام' میں اپنے خاندان کے بیشتر افراد کی ذاتی زندگی اور ان کے کارناموں کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس خاندان کے افراد کا تعلق زیادہ تر ادبی رہا ہے مگر صحافت اور سیاست سے بھی اس خاندان کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔

محمد ایوب واقف نے اپنی زندگی سے جڑے چند ناقابل فراموش واقعات کو بھی جگہ دی ہے۔ ایک خاص عنوان کے تحت اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی تفصیل بھی رقم کی ہے۔ اپنے نصابی اساتذہ اور ادبی و شعری رہنماؤں کی سرپرستیاں، ان سے متعلق مخلصانہ اور مشفقانہ باتوں کو بڑی چاشنی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نامورانِ نظم و نثر اور ادب دوستاں کی ایک طویل فہرست ہے۔ علی سردار جعفری، پروفیسر ظ انصاری، کالی داس گپتا رضا، باقر مہدی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چند، عصمت چغتائی، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی از یں قبیل متعدد ہستیوں سے پہروں کی صحبتیں رہی ہیں اور تجربات و خیالات کا لین دین رہا ہے۔

'یاد ایام' زبان و بیان، تاریخی و سماجی معلومات، رسوم و وہوم کی تفصیلات، ادبی و سیاسی سرگرمیاں موجود ہیں۔ غرض اس کتاب میں وہ تمام چیزیں ہیں جو فن خودنوشت سوانح عمری کی پاسداری کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ایک بار ضرور کرنا چاہیے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

جھارکھنڈ میں جلد ہی اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آئے گا: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: ریاست جھارکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن یہاں اردو کی صورت حال بہتر نہیں ہے اور نہ ہی یہاں اردو اکیڈمی قائم کی گئی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں کونسل کے وائس چیئرمین کے ساتھ جھارکھنڈ کے چیف سکریٹری جناب سدھیر چودھری اور ریاست کے متعلقہ محکموں کے سکریٹریوں سے ملاقات کی جس میں انھوں نے یقین دلایا کہ ریاست میں جلد ہی اردو اکیڈمی قائم کی جائے گی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جھارکھنڈ کے اپنے حالیہ دورے کے تناظر میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل ساری دنیا میں اردو کے فروغ کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور ہمارا مقصد پورے ہندوستان میں اردو کا فروغ ہے۔ ہم نے جھارکھنڈ کی ریاستی حکومت سے ریاست میں اردو کے مسائل پر تفصیلی گفتگو کی اور ان سے اردو اکیڈمی کے قیام، مدارس کے ملازمین کی تنخواہوں کی وقت پر ادائیگی، سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم، اردو اساتذہ کی بحالی، ابتدائی و ثانوی سطح پر اسکولوں میں اردو کتابوں کی فراہمی، عالم و فاضل امتحانات کو یونیورسٹی کے ذریعے منعقد کرائے جانے، بلاک اور ضلع سطح پر اردو ٹائپسٹ اور اردو مترجمین کی بحالی جیسے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ یہ ملاقات بہت خوشگوار رہی اور چیف سکریٹری صاحب نے ہماری باتیں توجہ سے سنیں اور ان پر عمل آوری کے لیے متعلقہ افسران کو احکام بھی جاری کردیے۔ کونسل کے اس وفد میں کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر، ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ریسرچ آفیسرز ڈاکٹر کلیم اللہ و انتخاب عالم شامل تھے۔

ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ ہمارے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر جھارکھنڈ سے ہی ہیں اور وہ اپنی ریاست میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہم سب کوشش کررہے ہیں۔ کونسل کی اسکیموں کو اردو اکادمی کے تعاون سے ہم موثر ڈھنگ سے ریاست میں نافذ کرسکتے ہیں۔ ہم نے جھارکھنڈ کی مختلف اردو تنظیموں و اداروں کے سربراہان سے بھی ملاقات کی اور ان سے اردو زبان کے موجودہ حالات پر گفت و شنید کی۔ رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر کے پانڈے، رجسٹرار ڈاکٹر امرکمار چودھری، سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اے اے خان، سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر ابوذر عثمانی وغیرہ نے بھی کونسل کے اس قدم کی ستائش کی اور ہر ممکن تعاون دینے کی یقین دہانی کرائی۔ رانچی یونیورسٹی کے آر یہ بھٹ آڈیٹوریم میں بھی سیکڑوں کی تعداد میں اردو نوازوں نے کونسل کے ذریعے منعقدہ مذاکرے میں اپنی موجودگی درج کرائی اور اردو دوستی کا ثبوت دیا۔ سبھی نے بنیادی سطح پر فروغ اردو کی اس کوشش کے لیے کونسل کی تعریف کی۔ واضح ہو کہ کونسل کی جانب سے پورے ملک میں لوگوں کو اردو زبان کی جانب راغب کرنے کے لیے پروگرام کا انعقاد کیا جارہا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 فروری 2019

اردو بے حد مقبول اور خوبصورت زبان ہے: ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ

انٹریکٹو پروگرام کا مقصد نارتھ ایسٹ کے علاقوں میں اردو کے فروغ کے لیے ہمہ جہت کوشش کرنا ہے: ڈاکٹر عقیل احمد

امپھال: منی پور کی گورنر عزت مآب محترمہ ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام ہوٹل امپھال میں منعقدہ انٹریکٹو پروگرام میں کہا کہ اردو بے حد مقبول اور خوبصورت زبانوں میں سرفہرست ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ درست نہیں کہ اردو مسلمانوں کی

زبان ہے۔ عہد مغلیہ میں مختلف مقامات کے لشکر باہم رابطے کے لیے جو زبان بولتے تھے، وہ اردو کے نام سے معروف ہوئی۔ انھوں نے اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے قومی اردو کونسل کو عملی اقدامات کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اردو بول سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے، انھیں اس بات کے لیے ترغیب دی جائے کہ وہ اردو رسم الخط بھی سیکھیں۔ انھوں نے کونسل سے شائع ہونے والے رسائل کو عام کرنے اور عوامی بنانے پر بھی زور دیا۔

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ زبانوں کو مذہب سے اوپر اٹھ کر دیکھا جانا چاہیے اور عوام تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مختلف لسانی و مذہبی پس منظر کے لوگوں کو کسی مخصوص زبان پر مرکوز نہیں رہنا چاہیے بلکہ تعلیم اور تدریس کے میدان میں عملی انداز فکر اختیار کرنا چاہیے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ کونسل اردو موبائل ایپس اور آن لائن لغات جاری کر چکی ہے۔ انھوں نے کتابوں کی اشاعت اور اردو کی تعلیم کے لیے قومی اردو کونسل کے ذریعے فراہم کیے جانے والے تعاون سے فائدہ اٹھانے کی اپیل کی۔ ڈائریکٹر نے مزید کہا کہ کونسل کے تحت مختلف کورسیز چل رہے ہیں جیسے یک سالہ ڈپلومہ کورس ان کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ بزنس اکاؤنٹنگ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی، دو سالہ ڈپلومہ ان کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائننگ، یک سالہ ڈپلومہ ان اردو لنگویج، دو سالہ ڈپلومہ کورس ان فنکشنل عربک، یک سالہ سرٹیفکیٹ کورس ان عربک لنگویجز اور یک سالہ سرٹیفکیٹ کورس ان پرشین۔ سردست ان کورسوں میں 25 ریاستوں کے 252 اضلاع سے 1,41,683، طلبا کا اندراج ہے۔ علاوہ ازیں مصنفین اور اخبارات کے لیے بھی کونسل کی کئی اسکیمیں چل رہی ہیں۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق منی پور کے مختلف علاقوں میں اردو کے 13، عربک ڈپلومہ کے 03، عربک لنگویجز کے 09 اور CABA-MDTP کے 30 سینٹرز چل رہے ہیں۔

ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ منی پور کے CABA-MDTP، عربی اور اردو سینٹرز کے انچارج کے ساتھ تبادلۂ خیال کا مقصد اردو کو فروغ دینے میں ان کا تعاون کرنا، کونسل کی اسکیموں سے آگاہ کرنا اور ان کے مسائل کے حل کے لیے متعدد سہولیات فراہم کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انڈومان نکوبار، نارتھ ایسٹ کے بعض علاقے، گوا اور جنوبی ہند کے کچھ علاقے بھی کونسل کی اسکیموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں، جب کہ ان علاقوں کے لیے منظور شدہ بجٹ کا کچھ فیصد مختص ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے پروگراموں کے ذریعے متعلقین اردو کے درمیان بیداری پیدا ہوگی اور کونسل کی مختلف اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا ماحول بنے گا۔ واضح رہے کہ کونسل پہلے بھی اس طرح کے پروگرام 09 دسمبر 2018 کو گوا میں، 11 فروری 2019 کو رانچی میں اور 16 فروری 2019 کو ہوجائی، آسام میں منعقد کر چکی ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 فروری 2019

یومِ مادری زبان

نئی دهلی: دنیا کی جن قوموں نے اپنی مادری زبان، مادر وطن اور اپنی تہذیب کو بھلا دیا، وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ یہ تشویشناک بات ہے کہ ہندوستانی عوام انگریزی زبان سے متاثر ہو رہی ہے جب کہ اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے مادری زبان سب سے موثر ذریعہ ہے۔ زندگی کے لیے تین چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ماں، مادری زبان اور مادر وطن۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بین الاقوامی یوم مادری زبان کے موقع پر گاندھی بھون، دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ یک روزہ مذاکرہ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی نے ہمیشہ مادری زبان کو ترجیح دی اور سب کو مادری زبان اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستانی زبانیں دنیا کی کسی بھی زبان سے کم نہیں ہیں۔

ہمارے لیے یہ افسوس کا مقام ہے کہ ہم احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب کہ دنیا کے بہت سے ایسے ترقی یافتہ ممالک ہیں جنھوں نے اپنی مادری زبان کو اپنا کر ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ حالانکہ ہمارے اظہار خیال کے لیے دنیا کی سب سے میٹھی اور شیریں زبان اردو ہے۔ اس موقع پر بطور مہمان خصوصی قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دلوں کو جیتنے کی بات ہو یا آج کے صارفیت کے زمانے میں اپنی مصنوعات بیچنے کی بات ہو مادری زبانوں یا علاقائی زبانوں کے اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینی چاہیے۔ محترمہ کسم شاہ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مادری زبان جنم دینے والی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ بچہ ماں کی گود سے نکل کر زبان کی گود میں جاتا ہے۔ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ساتھ زبان کے حوالے سے کام کرنے کی بات کہی۔ا

س موقعے پر پروفیسر ہری موہن جی نے کہا کہ ہر ملک یا علاقہ اپنی مادری زبان پر فخر کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کثیر لسانی ملک ہے اور اس ملک میں رابطے کی کوئی زبان ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستانی ہے۔ اس کے علاوہ اس مذاکرے میں پروفیسر راجندر کمار، پروفیسر رویل سنگھ، پروفیسر اوما دیوی نے مادری زبان کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز سے قبل پلوامہ میں شہید جوانوں اور پروفیسر نامور سنگھ کے انتقال پر ملال کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے تعزیت کی گئی۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر رمیش سی بھاردواج نے بحسن و خوبی انجام دی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 فروری 2019

منی پور میں اردو سیل کا قیام جلد: شیخ عقیل احمد

نئی دهلی: یکم مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی قیادت میں این سی پی یو ایل کے ایک وفد نے جس میں

ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ اور انتخاب احمد بھی شامل تھے منی پور کے چیف سیکریٹری اور ان کے ڈائرکٹریٹ کی ٹیم جس میں کمشنر و ڈائریکٹر تعلیم، ڈائرکٹر اقلیتی امور، ڈائرکٹر دیگر بیک وارڈ کلاس، ڈائرکٹر لینگویج پلاننگ اینڈ امپلی مینٹیشن Implementation و ڈپٹی سیکریٹری منی پور وغیرہ شامل تھے، سے ملاقات کی اور ریاست میں اردو و دیگر مسائل پر بات چیت کی۔

میٹنگ میں ریاست منی پور میں ابتدائی سطح پر اردو زبان و ادب کے فروغ اور اردو اور منی پوری تہذیب کو مشترکہ طور پر ریاست منی پور میں پھیلانے کے امکانات پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ مذاکرے میں مشترکہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ این سی پی یو ایل حکومت منی پور کے ساتھ مشترکہ طور پر منی پور میں 21 نومبر سے 30 نومبر کے درمیان ہونے والے سنگھائی نیشنل فیسٹیول میں اردو غزل اور اردو ڈرامہ پیش کرے گی۔ میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ لیا گیا کہ حکومت فوری طور پر ایک اردو سیل کا قیام کرے گی تاکہ کونسل اپنی اسکیموں کے نفاذ کے لیے اردو سیل سے co-ordinate کر سکے۔

این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ این سی پی یو ایل کی تمام اسکیموں کو ریاست میں نافذ کرنے کے لیے منی پور میں اردو اکادمی کا قیام ضروری ہے۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے منی پوری زبان کی کتابوں کو اردو میں اور اردو کی کتابوں کو منی پوری زبان میں ترجمہ کرانے پر زور دیا۔ ساتھ ہی دونوں زبانوں کے تہذیبی پروگراموں کو مشترکہ طور پر کرانے کی بات بھی کی تاکہ دونوں زبانوں کو تہذیبی طور پر ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکے اور دونوں زبانوں کے فروغ کی راہ ہموار ہو سکے۔

میٹنگ میں مدرسہ بورڈ کا قیام، سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لیے اردو اساتذہ کی تقرری، اردو کتابوں کی فراہمی جیسے اہم مسائل پر بھی گفتگو کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 مارچ 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

مولانا آزاد کی ادبی خدمات

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے گنگوتری فاؤنڈیشن کے زیراہتمام لکھنؤ یونیورسٹی کے جے کے ہال میں مولانا آزاد کی ادبی خدمات

پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کے مہمانِ خصوصی سابق آر ٹی آئی کمشنر حافظ عثمان نے مولانا کی ملکی وادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ مولانا ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اسی اتحاد کی بدولت ملک کو آزاد کرایا۔ انھوں نے مولانا کے تمیں پیچ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کرب کو ظاہر کرتے ہوئے طلبا سے ملکی مفاد میں بدعنوانیوں کا خاتمہ کرکے ہندوستان کو پھر سے سونے کی چڑیا بنانے کی اپیل کی۔ خصوصی مقرر مولانا آزاد میموریل اکادمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امام الہند کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو ہیں۔ ہر پہلو اپنے آپ میں ایک ہمہ گیریت رکھتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے صحافت اور ادب کے ذریعے معاشرے کی اصلاح جنگ آزادی میں انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے اور اتحاد کے فروغ پر جو کام کیا وہ بے مثال ہے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے میں مولانا کے قلم نے تلوار کا کام کیا۔ ہفتہ وار الہلال کا طلسم ہر قاری پر سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی نے کہا کہ ملک کو آزاد ہونے کے بعد مولانا وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالتے ہی ملک میں پھیلی جہالت کو علم کی ہمہ جہت روشنی میں تبدیل کردینا چاہیے۔ وہ زراعت ہو یا میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تکنیکی تعلیم انھوں نے تہذیب وثقافت اور تمدن کو محفوظ رکھنے اور ان کے فروغ میں مثالی اکادمیاں قائم کیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کا ماننا تھا کہ جمہوریت صحیح ڈھنگ سے اس وقت تک کام نہیں کرسکتی جب تک جہالت اور ناخواندگی کو جڑ سے نہ ختم کیا جائے۔ ان کا ماننا تھا کہ جمہوریت کا کوئی مستقبل نہیں۔ جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ ان تمام علمی کارناموں سے مزین ہوکر آج ہندوستان نیوکلیر پاور بن گیا اور ترقی پذیر ملکوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ اس موقعے پر ڈی ایم او لکھنؤ ملن دویدی، ڈاکٹر پردیپ شکلا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر مدثر نے کی۔ گنگوتری فاؤنڈیشن کی جانب سے مہمانوں کو گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا گیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 7 فروری 2019

بیکل اُتساہی حیات وخدمات

تلسی پور: پروانچل اتھان سمیتی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'بیکل اتساہی: حیات وخدمات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کی

صدارت ایم ایل کے پی جی کالج کے صدر ڈاکٹر طارق کبیر نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندی اور اودھی زبانوں کا سنگم اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ بیکل اتساہی کی شاعری میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیکل اتساہی نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف اردو زبان کو مقبولیت عطا کی بلکہ اردو اور ہندی دونوں کے درمیان باہمی رشتہ قائم کردیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عبدالحفیظ خان نے کہا کہ بیکل اتساہی نے اودھی زبان کو ادبی حیثیت عطا کی۔ ان کے علاوہ مقالہ نگاران میں ڈاکٹر محمد اختر، بنارس ہندو یونیورسٹی، ڈاکٹر ابوشہیم خان، ساگر سینٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد اکمل شاداب، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ اور ڈاکٹر تبسم فرخی، ایم ایل کے پی جی ڈگری کالج اور ڈاکٹر فواز وغیرہ نے بیکل اتساہی کی زندگی اور نگارشات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ بیکل اتساہی کا نام محمد شفیع خاں تھا، وہ اردو اور ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ ان کی پیدائش یکم جون 1924 کو گور، رمواں پور چوکی سری دت گنج، تھانہ کوتوالی اترولہ ضلع بلرامپور میں ہوئی تھی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر سابق بلاک پرمکھ ستیہ نارائن مشرا، مہمان اعزازی ایڈوکیٹ کمل نین تیواری اور بسنت لال انٹر کالج کے پرنسپل اوم پرکاش مشرا نے خطاب کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 فروری 2019

اردو ادب میں کرشن بھکتی

آگرہ: پندرہویں صدی کے ہندوستانی سماج میں پھیلی مذہبی کٹرتا کو ختم کرنے میں بھگتی تحریک نے خاص رول ادا کیا تھا۔ آج کے پرتشدد دور میں اس تحریک کو از سر نو جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار مختلف مقررین نے یہاں ایچ ایم اسکول چندن ون متھرا میں منعقد دو روزہ سیمینار میں کیا۔ یہ سیمینار اختر حسن میموریل پبلک ویلفیئر سوسائٹی متھرا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے چندن ون میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار کے پہلے دن ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، چشمہ فاروقی، عزیزہ مرزا، ڈاکٹر محمد علی، ڈاکٹر سید اختیار جعفری، ڈاکٹر سعید اعظمی اور ڈاکٹر افتخار الزماں نے مقالات پیش کیے۔ دل تاج محلی، ڈاکٹر زیدحسن اور ڈاکٹر ناہید اختر نے بھی تقاریر کیں۔ دو روزہ قومی سیمینار کا عنوان اردو ادب میں کرشن بھکتی تھا۔ سیمینار کے دوسرے دن مقالہ پیش کرتے ہوئے رامپور سے تشریف لائے ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کہا کہ شری کرشن صرف ایک شخصیت کا نام

'اردو بذریعہ تعلیم، مسائل اور چیلنجز' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

نہیں بلکہ یہ ہندوستان کی ایک تہذیبی علامت، سماجی اور سیاسی انارکی کے خلاف ایک جدوجہد کی علامت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تشریف لائے ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی نے کہا کہ اردو زبان وادب میں شری کرشن کو خاص ادبی مقام حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ ڈاکٹر معظم علی خان نے اپنے مقالے میں ان کی سیاسی سماجی اور مذہبی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد علی نے کہا کہ ہندو دیومالائی نظریات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہمیں سماجی صورت حال کو تبدیل کرنے والی تحریک کے طور پر سری کرشن کو دیکھنا چاہیے۔ پروگرام کے کنوینر دل تاج محلی نے کہا کہ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے پیش کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر زید حسن صدر اے ایچ ایم اسکول چندن ون نے کہا کہ تمام برج کے علاقے میں شری کرشن کی اہمیت سب کے سامنے واضح ہے۔ اردو زبان وادب کا شاید ہی کوئی قابل قدر شاعر یا مصنف ایسا ہوگا جس نے شری کرشن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ سوسائٹی کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر ناہید اختر نے رپورٹ پیش کی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 فروری 2019

اردو بہ ذریعہ تعلیم، مسائل اور چیلنجز

نوح، میوات: ضلع ہیڈ آفس نوح سے متصل میوات انجینئرنگ کالج پلہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند نئی دہلی ومولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے مانو ماڈل اسکول نوح کے اشتراک و مالی تعاون سے 'اردو بہ ذریعہ تعلیم، مسائل اور چیلنجز' کے عنوان پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں حیدرآباد، بہار، دہلی وملک کے مختلف مقامات سے سبجیکٹ ماہرین و اسکالرس نے شرکت کرکے اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار میں پروفیسر سراج انوار این سی ای آر ٹی نئی دہلی و پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد خان ڈائرکٹر میوات انجینئرنگ کالج پلہ واسمیہ حاپانڈے پرنسپل نوودیہ ودھیالیہ نوح نے بطور مہمان خصوصی جبکہ ڈاکٹر کفیل احمد حیدرآباد، ڈاکٹر رضوان علی دربھنگہ و ڈاکٹر عادل عباسی نے سمینار میں بطور اسکالر شرکت کی۔ پروگرام کے روح رواں و مانو ماڈل اسکول نوح کے پرنسپل محمد ارشد خان نے افتتاحی پروگرام میں تمام مہمانوں کا استقبال وخیر مقدم کرتے ہوئے سمینار کے اغراض ومقاصد پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ سمینار کا مقصد اردو زبان میں درس وتدریس کے شعبے میں آرہی مشکلات وپریشانیوں کا جائزہ لینا اور پھر ایک منظم لائحہ عمل اور خاکہ تیار کرکے ان کے حل کرنے کی کوشش کرنا تاکہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو جو بھی دشواریاں پیش آرہی ہیں انھیں دور کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 فروری 2019

'ہندوستانی مذاہب، فلسفہ اور ادب'

بنارس: شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے آج بتاریخ 25 فروری 2019

کو ایک تاریخی بین الاقوامی سمینار کا انعقاد پریم چند سبھا گار، فیکلٹی آف آرٹس، بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوا۔ افتتاحی تقریب میں ماریشس سے تشریف لائی اردو صحافی اور کالم نگار ڈاکٹر بی بی آپیناز جان علی مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ہوئیں اور اس جلسے کی صدارت ہندی ادب کے مشہور ادیب اور مہاتما گاندھی انٹرنیشنل یونیورسٹی وردھا کے چانسلر پروفیسر کملیش دت ترپاٹھی نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبے میں موصوف نے کہا کہ ادب اور فلسفہ مذہب کے سائے میں فروغ پاتا ہے لیکن کبھی کبھی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود ادب بھی مذہب اور فلسفے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ 'ہندوستانی مذاہب، فلسفہ اور ادب' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے اردو کے منفرد و معروف شاعر و نقاد جناب شمیم طارق نے ہندوستانی مذاہب اور فلسفہ کو ہندوستانی ادب کا اہم موضوع قرار دیا ہے۔ انھوں نے پنچ تنتر، میگھ دوت، رامائن، مہابھارت، والمیکی، تلسی، سور کبیر کے ساتھ خسرو، میر، غالب اور اقبال کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہماری شعری روایت میں ہندوستانی مذاہب کی تلمیحات واستعارات کثرت سے ملتی ہیں۔ اسی طرح ہماری کتھاؤں اور کہانیوں میں بھی ہندوستانی فلسفہ اور مذاہب کے مختلف رنگوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جاتک کتھاؤں، پنچ تنتر کی حکایتوں سے لے کر پریم چند، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر تک آجایئے وہی ہندوستانی مذاہب اور ہندی فلسفہ اپنی مختلف شکل وصورت میں گردش کرتے نظر آئیں گے۔ مہمان خصوصی پروفیسر راکیش مشرا نے اپنے مخصوص لب ولہجہ اور شستہ اردو میں ہندوستانی مذاہب کی ادبی اہمیت اور ان سے متعلق مختلف ادب پاروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ادب زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے جبکہ مذہب اور فلسفہ ہمیں راستہ دکھانے کا کام کرتے ہیں۔ ادب بذات خود مذہب بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ پروفیسر وجے ناتھ مشرا نے ہندوستانی مذاہب اور فلسفے کی اہمیت اور دنیا کے ادب میں اس کے اثرات کی نشاندہی کی۔ سمینار کے کنوینر اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے سمینار کے تعلق سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ شعبۂ اردو کی تاریخ بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا پہلا موقع ہوگا جہاں ہم ہندوستانی مذاہب، اس کے فلسفے اور ادب میں ان کے انعکاس پر گفتگو

کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ جس کا مقصد نئی نسلوں کو ہندوستانی تہذیب وثقافت سے واقف کرانا ہے۔

سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں مہمانوں کا استقبال گلدستہ، شال اور مومنٹو پیش کر کے کیا گیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر مشرف علی نے اور شکریہ کی رسم عبدالسمیع نے ادا کی۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی، 25 فروری 2019

اردو زبان میں بچوں کا ادب

اسلام پور / کشن گنج: مغربی بنگال اور بہار کی سرحد پر واقع مشہور قصبہ پناسی میں اتوار کی دیر شام ایک قومی سمینار 'اردو زبان میں بچوں کا ادب' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ سمینار علاقہ کے مشہور تعلیمی ادارہ مدرسہ نصیریہ اشرفیہ کی جانب سے اسی کے احاطہ میں اکیڈمک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نصیریہ فاؤنڈیشن) کے اشتراک سے منعقد ہوا جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (وزارت برائے فروغ انسانی وسائل) کا تعاون حاصل تھا۔ سمینار میں ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے اسکالرز مختلف ریاستوں کے دانشوران اور علاقۂ سیمانچل کے دانشوران، تعلیم یافتہ حضرات، طلبا، ریسرچ اسکالرز، و سیاسی نمائندگان نے شرکت کی۔ آکسفورڈ انٹرنیشنل یونیورسٹی کے ڈائرکٹر اور سماجی کارکن تفہیم رحمٰن نے اپنے مقالہ میں اردو میں بچوں کے ادب کے حوالے سے پرمغز نکات کی جانب اشارہ کیا۔ اردو ادب سے بے حد ذوق رکھنے والے سماجی کارکنان موصوف سرور (کشن گنج) اور مولانا منظر محسن نے بھی شرکت کی۔ مقالہ نگاروں نے اس بات پر زور دیا کہ بچے کی تعلیم وتربیت میں کمی وکوتاہی کا نتیجہ قوم کے مستقبل کی تاریکی میں ظاہر ہوسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2019

اردو ادب میں غیر مسلم خواتین کی خدمات

بارہ بنکی: اردو کسی مذہب کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ اردو کی کشش ہی ہے جو کہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سمیت تمام مذاہب کے ماننے والوں کا اس زبان اور اس ادب کی ترقی میں برابر کا تعاون ہے۔ مشہور عالم اور ادیب پروفیسر شارب ردولوی نے سماجی تنظیم 'احساس' کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کے مالی تعاون سے 'اردو ادب میں غیر مسلم خواتین کی خدمات' موضوع پر منعقد سمینار میں کہا کہ اردو کی تاریخ کے ورق پلٹ کر دیکھیں تو پائیں گے کہ جن خواتین کی مادری زبان اردو نہیں رہی ان کا بھی اردو کے فروغ میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ 'ڈی پیلس' ہال میں منعقد سمینار میں انھوں نے کہا کہ اردو کی کشش ہی تھی کہ جب انگریز ہندوستان آئے تو وہ بھی اردو لکھنے لگے۔ ہر ایک نے اس زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر موصوف نے کہا کہ کہانی کہنے، سننے اور سنانے کے فن سے خواتین کا پرانا رشتہ ہے۔ اس کی وجہ سے انھیں کہانی میں آپ جذبات کو بیان کرنے اور ادب کے ذریعے سے پیش کرنے میں زیادہ لطف محسوس ہوتا رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر غیر مسلم خواتین ادیبوں نے کہانی لکھنے کے میدان میں پرچم لہرائے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نور فاطمہ نے بہار کی ادیب آشا پربھات کا ذکر کرتے ہوئے 'پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے' موضوعاتی مقالے میں کہا کہ آشا ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی خاصی مقبول ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہندی اپنی مادری زبان ہے اور اردو ان کی محبوب زبان ہے۔ میری محبوب کی آنکھوں میں دھنک کے تمام رنگ موجود ہیں۔ ان کے افسانے پڑھنے سے پتہ لگتا ہے کہ ان کے موضوعات عورت کی حیثیت اور ان پر ہونے والے مظالم پر مبنی تھے۔ ایکوریم، سلاخوں کے پیچھے، کفارہ، کچھ رشتے ایسے بھی وغیرہ ان کے افسانے ہیں۔ فاطمہ نے کہا کہ آشا کے افسانے آنسوؤں کے حجاب میں لپٹی عورتوں کے درد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں عورت کا کردار نرم دلی، قربانی اور ایثار سے لپٹا ہوتا ہے۔ پروگرام کی نظامت مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عشرت ناہید نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ خواتین نے دنیا کے تمام میدانوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ امرتا پریتم نے اپنے افسانوں کے ذریعے فکشن کے میدان میں خود کو الگ طور پر پیش کی۔ انھوں نے ادیب رینو بہل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں کے موضوع عام انداز سے تھوڑے سے مختلف ہوتے ہیں۔ آپ کا ناول 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' میں انھوں نے تیسری جنس یعنی ہجڑا کو اہم کردار بنایا ہے۔ یہ ناول اس حقیر طبقے کا درد بیان کرتا ہے۔ گورکھپور یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ساجد حسین نے بھی ڈاکٹر رینو بہل کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خواتین ادیبوں نے بھی قلم کے ذریعے سماجی مسائل کو ہمارے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس فہرست میں غیر مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں ایک عورت کے گرد گھومتی ہیں۔ پٹیل مہیلا پی جی کالج کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صفت الزہرہ زیدی نے اس موقعے پر کہا کہ تاریخ کی تبدیلیوں اور معاشرے کی ضروریات نے اردو جیسی زبان کو جنم دیا، جس کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ 19ویں صدی کے آخری حصہ سے لے کر آج کے ترقی پسند معاشرے میں خواتین کا ادب میں خاص حصہ رہا ہے۔ امرتا پریتم، طنور کمار، آشا لکھنوی، انجم جبین، اوشا بھدوریہ، شبنم کانت، کرن، وِدیا سکینہ، وملا، امید پربھات، اجیت کور، سیما سوامی، شکنتلا اور ساوتری گوسوامی نے اردو کے میدان میں پرچم لہرایا۔ اسی موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 25 فروری 2019

بچوں کی منتخب نظمیں مع فرہنگ کے موضوع پر ورکشاپ

بچوں کی منتخب نظمیں مع فرہنگ کے موضوع پر چار روزہ ورکشاپ

نئی دھلی: درسی کتابیں صرف علم میں اضافے کا ذریعہ نہیں ہوتیں۔ طلبہ کی ذہنی تربیت، فکری پرداخت اور شخصیت کی تزئین میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ لہٰذا درسی متون کے انتخاب اور مشقی حصوں کی تیاری میں ماہرین کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں کیا۔

واضح ہو کہ مذکورہ اکادمی تقریباً ایک دہائی سے تدریسی تربیت، ورکشاپ، سمینار اور ترغیبی پروگرام کے ساتھ نصابی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تدریسی مواد کی تیاری کا فریضہ انجام دیتی آرہی ہے۔ بچوں کی منتخب نظمیں مع فرہنگ کی تیاری سے متعلق چار روزہ ورکشاپ کا انعقاد اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں پروفیسر سہیل احمد فاروقی بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ انھوں نے اکادمی کی کارکردگی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں بچوں کے ادب پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس انتخاب کی پذیرائی ہوگی۔ اس موقعے پر پروگرام کوآرڈینیٹر ڈاکٹر واحد نظیر نے ورکشاپ کی تفصیلات پیش کیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقدہ چار روزہ ورکشاپ (25 تا 28 فروری 2019) میں پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر حنا آفریں، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر سعود عالم اور جناب تجمل حسین نے شرکت کی۔ اس کتاب میں چھٹی جماعت سے بارہویں جماعت تک کے طلبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقریباً 90 نظموں کا انتخاب کیا گیا اور ان کی فرہنگ تیار کی گئی۔ نظموں کا انتخاب کرتے ہوئے یہ التزام رکھا گیا کہ ہر عہد کے اہم شعرا کی نمائندگی ہوسکے اور حتی الامکان موضوعات کا احاطہ بھی ہوسکے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 مارچ 2019

اردو خود نوشت اور سوانح نگار خواتین

سہارنپور: براؤن ووڈ پبلک اسکول میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور سماجی تنظیم پرچم کے اشتراک سے ایک سمینار اردو کی خودنوشت اور سوانح نگار خواتین کے موضوع پر منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت مجلّہ 'انداز بیاں' نئی دہلی کے مدیر حقانی القاسمی نے اور نظامت ڈاکٹر قدسیہ انجم اور ڈاکٹر شاہد زبیری نے مشترکہ طور پر کی۔ ماہنامہ 'جہاں نما' کے ایڈیٹر قاضی ظہیر اختر مہمانانِ خصوصی تھے۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبہ میں حقانی القاسمی نے اردو کی خودنوشت اور سوانح نگار خواتین کا تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ اردو زبان کی آپ بیتیاں و سوانح ہوں یا کسی دوسری زبان کی ہوں ان سب میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ عورت کسی ملک اور کسی خطے کی ہو اس کی زبان کوئی بھی ہو لیکن دکھ اور درد سب کا یکساں ہے۔ انھوں نے کہا کہ جن خواتین نے اپنی آپ

بیتیاں لکھی ہیں انھوں نے سماج کے فرسودہ نظام کو چیلنج کیا ہے اور صدیوں کے قفس اور بندھنوں کو توڑا ہے۔ مہمانِ خصوصی قاضی ظہیر اختر نے کہا کہ اردو کی اس صنف خودنوشت اور سوانح نگاری میں خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے جو خودنوشت اور سوانح لکھی ہیں، ان میں انھوں نے اپنے سماج اور تہذیبی اقدار کی ترجمانی کی ہے اور خواتین کی سماجی حالت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ بیسویں صدی نئی دہلی کی مدیرہ شمع افروز زیدی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے سمینار میں شرکت کی اور کہا کہ خودنوشت اور سوانح نگاری میں خواتین کی ایک کہکشاں ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے اردو مجلّہ جمناتٹ کے ایڈیٹر ڈاکٹر مستمر نے اپنا مقالہ بیگم انیس کی خودنوشت غبار کارواں پر پیش کیا اور کہا کہ یہ ایک ادھوری اور نامکمل آپ بیتی ہے تاہم یہ اودھ کے تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات کا آئینہ ہے۔ میڈیا پوسٹ نئی دہلی کے ڈاکٹر شیخ نگینوی نے قرۃ العین حیدر کی خودنوشت 'کارِ جہاں دراز ہے' پر اپنا مقالہ پڑھا اور اس آپ بیتی کے محاسن اور اس کی زبان و اسلوب پر اظہارِ خیال کیا، گورنمنٹ ڈگری کالج دیوبند کے ڈاکٹر الف ناظم کا مقالہ عصمت چغتائی کی آپ بیتی 'کاغذی ہے پیرہن' پر سمینار میں پیش کیا اور عصمت کے قلم کی بیباکی اور جرأت کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شاہد زبیری نے اردو میں خودنوشت اور سوانح کی روایت، تاریخ اور اس صنف کی قبولیت پر مقالہ پڑھا۔ جامعہ اسلامیہ کی ریسرچ اسکالر صالحہ صدیقی نے قلمکاروں کی کہانی انھیں کی زبانی کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ تنظیم معین نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار میں ادیبوں کے علاوہ عمائدینِ شہر، اردو تنظیموں کے ذمے داران اور اردو اساتذہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مارچ 2019

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

'اردو دنیا' کے لیے تمام مضامین/مکتوبات اردو دنیا کی ای میل آئی ڈی کے علاوہ درج ذیل آئی ڈی پر بھی ضرور ارسال کریں: director@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اِمام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

نئی دھلی: امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے 61ویں یوم وفات پر مزار آزاد پر آئی سی سی آر کی جانب سے ایک مجلس کا اِنعقاد کیا گیا۔ مجلس میں شریک تمام ہی معزز

شخصیات نے مزار آزاد پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مجلس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ذریعہ وضع کی گئی حکمت عملیوں اور حیاتِ آزاد کے تعلق سے اُن کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے اُن عبقری رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے ہندوستان کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی۔ مجلس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی حکمت عملیوں کی جس قدر پذیرائی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہوئی اور اُن کے تئیں لاپرواہی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔

نجمہ ہپت اللہ صاحبہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ یہ مولانا ہی تھے جنھوں نے تاحیات گنگا جمنی تہذیب کی نہ صرف آبیاری بلکہ اُس کی ہم نوائی بھی کی۔ اُنھوں نے جدید ہندوستان میں ثقافتی ہم آہنگی کے مدنظر بہت سے اِداروں مثلاً ساہتیہ اکادمی، ڈراما اکادمی اور آئی سی سی آر کی بنیاد رکھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کافی وسیع اور گہری تھی۔ وہ آنے والی نسلوں کے سامنے پیدا ہونے والے مسائل کا شعور بھی رکھتے تھے۔ نتیجتاً اُنھوں نے ایسے اِداروں کی بھرپور پذیرائی کی۔ مولانا کا ہمیشہ سے یہی اِرادہ رہا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی تہذیب ولسان کے فروغ کو یقینی بنایا جائے جس میں ثقافتی بالادستی جیسے عناصر کو خارج کرتے ہوئے ایک ایسے تہذیب کا فروغ ہو جس میں تمام ہندوستان کی آئینہ داری ممکن ہو۔

میدانِ تعلیم میں سرگرم عمل معروف فلاحی تنظیم فرینڈز فار ایجوکیشن کے صدر اور مولانا آزاد کے پوتے فیروز بخت احمد نے کہا کہ اگر ہم آج مولانا ابوالکلام آزاد سے سچی عقیدت رکھتے ہیں اور اُن کے ذریعہ پیش کردہ خدمات کو تہہ دل سے تسلیم کرتے ہیں تو اُن کے تئیں فعالیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ آنے والی نسلوں کو مولانا کے نظریات سے باخبر کرانا ہوگا کہ وہ آئندہ کے درپیش مسائل کے لیے حیاتِ آزاد اور حکمت عملیوں کو مشعل راہ بناسکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جدید ہندوستانی تعلیم کو ایک بنیاد فراہم کی۔ اُنھوں نے بلاتفریق مذہب وملت، ذات پات اور جنس سب کے لیے ایک ایسی کارگر حکمت عملی وضع کی تھی کہ اگر اُن پر عمل کیا جاتا تو آج ہندوستان میدانِ تعلیم میں خود کفیل ہو چکا ہوتا، تمام تفریقات کی بیخ کنی ہو چکی ہوتی۔ یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ اُن کے نظریات کو یکسر نظرانداز کردیا گیا جس کے سبب آج ہم مختلف مسائل سے دوچار ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مولانا کی حکمت عملیوں پر عمل پیرا ہوا جائے۔ اس مجلس میں آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر جناب اکھلیش مشرا، انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے ممبر جناب بدرالدین خاں اور بہار برقی بھی شامل تھے۔

پریس ریلیز: فیروز بخت احمد، ذاکر نگر، نئی دہلی 22 فروری 2019

غالب کو 150ویں یومِ وفات پر خراجِ عقیدت

نئی دھلی: غالب دنیا کے اُن چند بڑے شاعروں میں ہیں جن کے کلام کو جتنے زاویوں سے دیکھا جاتا ہے معنی کی مختلف دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ان کے کلام کو مشرقی اور مغربی فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور ہر میزان پر اُن کی بزرگی مسلم رہی۔ غالب اپنے عہد میں بھی گم نام شاعر نہیں تھے اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں غیرمعمولی اضافہ ہوا۔ 15 فروری 2019 کو غالب کی وفات کے ایک سو پچاس سال مکمل ہوگئے۔ اس موقعے پر

غالب انسٹی ٹیوٹ اور وزارت ثقافت، حکومتِ ہند کی جانب سے مزار غالب پر گل پوشی اور نذرانہ عقیدت کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر دہلی کے تمام اردو اداروں، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے اس پروگرام میں

شرکت کر کے اردو کے اس عظیم محسن کو یاد کیا۔ وفاتِ غالب کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب اردو کے تمام اداروں، دانشوروں اور الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے ہم آواز ہوکر غالبیات کے سلسلے میں نئے لائحہ عمل کی طرف عملاً پیش قدمی کی۔ پروگرام کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی اور اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے کہا کہ گولکنڈہ کی کان کنی مکمل ہوگئی اور اب وہاں سے کوئی نئی معدنیات برآمد نہیں ہورہی لیکن غالب ایک ایسی کان ہے کہ جتنی کان کنی کی جاتی ہے معدنیات میں کمی نہیں آتی۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے مزار غالب پر تمام اداروں کو جمع کر کے آج کے دن ایک ایسی تاریخ رقم کی ہے جسے غالبیات کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ زندگی کے ہر موقعے پر غالب کا کوئی نہ کوئی شعر یاد آجاتا ہے اور وہ غالب کا نہیں بلکہ ہمیں اپنا تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب کا دیوان ہی ہے جو زندوں اور مردوں میں ایک رابطہ پیدا کردیتا ہے کیونکہ ان کا کلام ہمیں اپنے عہد کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ غالب کی برسی برسوں سے منائی جارہی ہے لیکن شاید یہ پہلا موقع ہے کہ دہلی کی مختلف اکادمیوں، یونیورسٹیوں اور صحافتی اداروں نے مشترکہ طور پر غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ اس پیش قدمی کے لیے قابل مبارکباد ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے اپنی افتتاحی گفتگو میں کہا کہ ترقی یافتہ قومیں اپنی وراثت اور اپنے شاندار ماضی کے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔ غالب صرف ایک بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ہماری وراثت کے ایک بڑے سمبل کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے تحریری پیغام کے ذریعے کہا کہ غالب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کے وسیلے سے غالب کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ آج کا یہ اجلاس اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ہم غالبیات کے تعلق سے نئے لائحہ عمل کے بارے میں غور وفکر کررہے ہیں۔ شعیب رضا خان نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایسا حوالہ ہے جس کے بغیر ہندوستان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کا کوئی تصور ہی ناممکن ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ غالبیات کے لیے اردو سے واقفیت بنیادی شرط ہے اور ہر زبان کا رسم خط اس کا لازمی حصہ ہوتا ہے جس کے بغیر زبان کا تصور ہی ممکن نہیں۔ معروف صحافی شکیل حسن شمسی نے کہا کہ غالب کا کلام ہی نہیں ان کا طرز زندگی بھی، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بہترین مثال ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنی تقریر میں کہا کہ غالب نے اپنے سلسلے میں کہا تھا کہ میں 'عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں' ان کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2019

'غالب اور غالب کے معاصرین' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

غالب اور غالب کے معاصرین

نئی دھلی: غالب اکادمی نئی دہلی کے پچاسویں یومِ تاسیس کے موقعے پر منعقد ہونے والے چار روزہ پروگرام کے آخری دن غالب اور غاب کے معاصرین کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے دو اجلاس میں دو درجن مقالے پڑھے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر میں پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ ایک طرف فارسی زدہ شاعری اور دوسری طرف ہندی کے قریب غالب کی شاعری کو نئے انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب کے یہاں ہر طرح کے تصورات کو جذب کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ہر ادب اپنا ادبی مزاج بدلتا رہا ہے۔ ہمیں اپنے زمانے کے ساتھ غالب کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اٹھارہویں صدی میں میر، انیسویں صدی میں غالب اور بیسویں صدی کے علامہ اقبال بڑے شاعر تھے۔ تینوں کے دور کے تقاضے الگ تھے ہمیں اپنے ماضی کے ادب کو حال کے تقاضے پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب کا کلام ہمارے دور کے تقاضے کو پورا کرتا ہے اور غالب ہماری جمالیاتی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ سمینار کی پہلی نشست میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے ان میں شاداب تبسم، حمیرہ تسنیم، نجمہ رحمانی، علی جاوید، مدن رائے کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ نصیر احمد خاں نے غالب کی اسلوبیات پر اپنے پرچے میں کہا کہ غالب واحد شاعر ہے کہ جس نے فارسی کو اردو لہجہ میں پیش کیا۔ انھوں نے فارسی سے مستعار الفاظ کو اردو میں متعارف کرایا۔ سمینار میں جی آر کنول نے کہا کہ ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت وہاج الدین علوی نے کی۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر جمال حسین، حنا آفرین نے بہت ہی معلوماتی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 فروری 2019

دھلی:

میثاقِ مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کے زیر اہتمام معروف اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب 'دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور' پر پروفیسر حسینہ حاشیہ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ و اسسٹنٹ جنرل سکریٹری آئی او ایس نے ایک معلوماتی لیکچر پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور تھا جو جامع اور تمام امور پر مشتمل ہے جس میں سیاست کے بنیادی اصول، حکومت کے انتخاب، دو ریاستوں کے درمیان آپسی اور سفارتی تعلقات، دیگر مذاہب کے ساتھ معاملات، افواج کی تشکیل، اقلیتوں کے حقوق سمیت تمام امور شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس اہم موضوع پر کام کیا اور وقیع کارنامہ انجام دیتے ہوئے دنیا کے سب سے پہلے تحریری دستور کو جمع کیا۔ پروفیسر حسینہ حاشیہ نے اپنے لیکچر میں بتایا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں میثاق مدینہ کو 47 دفعات میں ذکر کیا ہے جس کی ہر ایک دفعہ غیر معمولی اور ملکی آئین کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے میثاق مدینہ کے

اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مدینہ میں مختلف قبائل کے لوگ تھے جن کی آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق بنیادی طور پر وہاں تین گروپ تھے ایک عرب، دوسرے مہاجرین اور تیسرے یہود اس لیے انھوں نے حضورؐ کو اپنا سربراہ منتخب کرلیا اور تقریباً سبھی قبائل نے آپؐ پر اتفاق کیا جس کے بعد معاشرتی، سیاسی، فوجی اور سماجی مسائل پر آپ نے جامع آئین اور دستور تشکیل دیا۔ یہودیوں کے تینوں قبائل معاہدے میں شامل ہوئے۔ اس معاہدہ میں انھیں اپنے دین پر عمل کرنے کی مکمل مذہبی آزادی تھی اور ان کی حیثیت مستقل ایک قوم کی تھی۔ پروفیسر زیڈ ایم خان جنرل سکریٹری انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں سب سے زیادہ زیر بحث مسئلہ غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مسلم اقلیتوں کے حقوق کا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 مارچ 2019

اردو کو پرائمری اسکولوں تک پہنچانا بہت ضروری

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں رہبران اردو تعلیمی انجمن ہند کے زیراہتمام اردو کے فروغ اور بقا کے لیے اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان نے شرکت کی، مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر شریف حسین قاسمی اور مشہور شاعر متین امروہوی شریک رہے۔ تقریب کی صدارت عدالت عظمیٰ کے سینئر وکیل عتیق الرحمٰن نے کی۔ اس موقعے پر تنظیم کے چیئرمین عبدالکریم نے بھی مہمانان کا استقبال کیا اور کہا کہ اگر ایک طالب علم اردو کو پرائمری اسکول سے پڑھتا آرہا ہے تو وہ اردو کے ذریعے آئی اے ایس افسر بھی بن سکتا ہے۔ اس موقعے پر اے رحمان نے اردو کے فروغ اور بقا کے حوالے سے کہا کہ اردو کے فروغ اور بقا کے لیے اردو کو پرائمری اسکولوں تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ سنسکرت ہندوستان کی سب سے پرانی زبان ہے لیکن موجودہ دور میں سنسکرت کی اردو سے بھی بری حالت ہے اس لیے اگر کسی زبان کو فروغ دینا ہے تو ہمیں اس زبان کو پرائمری اسکولوں تک پہنچانا ضروری ہوگا۔ انھوں نے رہبران اردو تعلیمی انجمن ہند کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیم اردو کے فروغ اور بقا کے لیے اردو کو پرائمری اسکولوں میں پہنچانے کے لیے اپنی مہم چلا رہی ہے جو قابل ستائش ہے۔ عتیق الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں لیکن اس کے بعد بھی ہندی کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں نئی نسل کے اندر اردو کے فروغ کے لیے اردو اخبارات، اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہوگا تب ہی اردو کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2019

مجروح سلطانپوری اور ترقی پسند تحریک

نئی دھلی: مجروح سلطانپوری رنگا رنگ، وضع دار اور

غیر معمولی حیثیت کے شاعر تھے۔ ان کا تہذیبی پس منظر نہایت بالیدہ تھا۔ ان کی شاعری میں ایک فطری وفور اور بہاؤ تھا۔ اس زمانے کے اردو کلچر میں نہایت کشادگی کا رنگ مستحکم اور مختلف تھا۔ ان کی غزل جس توجہ کی مستحق تھی وہ نہیں دی گئی۔ وہ پہلے ترقی پسند شاعر تھے جنھوں نے اقبال کی روایت کو جلا بخشی۔ جگر مرادآبادی کی نظر جب مجروح پر پڑی تو انھوں نے اس جوہر کو پہچان لیا۔ مجروح نظم گو شاعر کے طور پر متعارف ہوئے تھے۔ غزل گوئی کی طرف انھوں نے بعد میں توجہ کی۔ ان خیالات کا اظہار عہد حاضر کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام منعقدہ 'مجروح سلطانپوری اور ترقی پسند تحریک' موضوع پر سجاد ظہیر یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجروح کے یہاں بڑی نفاست اور وضع داری تھی۔ وہ اودھ کے قصباتی کلچر کے امین تھے۔ ان کی غزلوں کا تخلیقی وفور حیرت انگیز ہے۔ ان کی پوری شاعری میں زندگی کی حرمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے مہمان مقرر، صدر جلسہ اور تمام حاضرین کا استقبال کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے اکابرین، ممتاز ادبا و شعرا اور دانشوروں کی ہمیشہ قدر کرتی رہی ہے۔ اس موقعے پر سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا یہ خطبہ بے حد مفصل اور دلچسپ تھا۔ اودھ کا قصباتی کلچر جو اب معدوم ہوگیا ہے، اس پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ اس یادگاری خطبے کی نظامت پروفیسر احمد محفوظ نے کی اور تمام مہمانوں کا شکریہ پروفیسر شہپر رسول نے ادا کیا۔ ان دونوں حضرات نے مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور شاعری کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اس یادگاری خطبے میں چودھری محمد نعیم (شکاگو)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہناز انجم، پروفیسر وہاج الدین علوی کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی حصہ لیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2019

شعبۂ اردو جامعہ میں توسیعی خطبات

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو توسیعی خطبات کا انعقاد کیا گیا۔ 'انجمن پنجاب اور جدید نظم' کے عنوان سے پروفیسر مظہر مہدی اور 'اردو داستان روایت اور فن' کے موضوع پر پروفیسر ابن کنول نے خطبہ پیش کیا۔ جلسے کی ابتدا ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمران احمد عندلیب اور سرورالہدیٰ نے ادا کیے۔ جلسے کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے فرمائی۔ پروفیسر مظہر مہدی نے اپنے خطبے میں انجمن پنجاب کے قیام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ ایسے حقائق بھی پیش کیے جو عموماً کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ پروفیسر مظہر مہدی نے سرسید تحریک کے زیر اثر فروغ پانے والی نئی علمی اور تعلیمی روشنی کو تاریخی پس منظر میں دیکھا اور اس بات پر زور دیا کہ جو تبدیلیاں اس عہد میں رونما ہوئیں انھیں وقت کا تقاضا سمجھنا چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سرسید اور حالی کا مطالعہ کرتے ہوئے حقائق کو ٹکڑوں میں دیکھنے کے بجائے انھیں وحدت کے طور پر دیکھیں۔ پروفیسر ابن کنول نے اردو داستان کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے فنی لوازم کے ساتھ ساتھ لسانی اور تہذیبی معنویت پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ داستان ایک زبانی روایت ہے اور اسے اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے داستان کو

’آرزو لکھنوی حیات وخدمات‘ کے موضوع پر منعقدہ سمینار

’اردو اور ہندی کا باہمی رشتہ‘ کے موضوع پر منعقدہ سمینار

زبان اور تہذیب کا ایک اہم ذخیرہ قرار دیا۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول نے خطبات پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں نہایت اہم اور وقیع قرار دیا اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 9 فروری 2019

اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں

نئی دہلی: انجمن چراغ اردو کے زیر اہتمام ایک مذاکرہ یعنی سمپوزیم بعنوان اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں تغلق ایکسٹینشن دہلی میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت گوتم بدھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر عبیدالغفار نے کی۔ اردو رسم الخط جاری رکھنے اور اس کے استعمال پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اردو رسم الخط کے عام کرنے سے ہی اردو کا فروغ ہوگا۔ اردو زبان کے تحفظ اور اس کی بقا کی فکر کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے، ہم اردو والوں نے اردو کو اپنے لیے استعمال کیا ہے، اب اس کے لیے اپنا وقت استعمال کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار انجمن چراغ اردو کی جانب سے منعقد اردو سمپوزیم کے موقعے پر ڈاکٹر عبیدالغفار نے کیا، جو اس پروگرام کے صدر بھی رہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے کیپٹن اور ڈاکٹر چودھری وہاج احمد اشرف نے شرکت کی اور اردو کے تناظر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مذاکرے کے شرکا میں اہل علم وادب اور بالخصوص اردو کی زمینی سطح پر جنگ لڑنے والوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے نظریات پیش کیے۔ مہمان شرکا کا استقبال پروگرام کے کنوینر حاجی نفیس و ڈاکٹر اطہر الٰہی خان نے گلدستہ پیش کر کے کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 11 فروری 2019

اترپردیش:

آرزو لکھنوی حیات وخدمات

لکھنؤ: آرزو لکھنوی صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اہل ادب نے اور اردو والوں نے آرزو لکھنوی کی طرف سے قطعاً بے اعتنائی برتی۔ اگرچہ انھوں نے اردو زبان وادب کو اپنی اعلیٰ درجہ کی تخلیقات سے اس طرح مالامال کیا ہے کہ بعض اوقات اپنے معاصرین سے آگے نکل گئے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر متین خان صدر انڈین یونین مسلم لیگ اترپردیش نے گلوریس فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد سمینار ’آرزو لکھنوی کی حیات و خدمات‘ میں صدارت ہوئے کیا۔ پروگرام دارالشفا کامن ہال اے بلاک میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی سینئر صحافی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ آرزو لکھنوی کی نظر زبان وبیان، قواعد وعروض پر بہت گہری تھی۔ مہمان اعزازی ضیاء اللہ صدیقی ندوی اور صبیحہ سلطانہ نے کہا کہ آرزو لکھنوی فطرتاً شاعری ساتھ لائے تھے، وہ لکھنؤ کی ادبی فضا میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ یہ فضا ہر لحاظ سے سخن وری وسخن فہمی کے لیے سازگار تھی۔ سب سے بڑھ کر گھر کا ماحول سراسر شاعرانہ تھا۔

اس سمینار میں ڈاکٹر سید محمد صبیح ندوی، محمد راشد خان ندوی، عبدالکریم ندوی، غفران نسیم، ضیاء اللہ صدیقی، وحید اللہ انصاری چترویدی اور ڈاکٹر سعدیہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار میں دلکش اور خوبصورت نظامت کے فرائض غفران نسیم نے انجام دیے۔ سمینار میں افتتاحی کلمات پروگرام کی کنوینر اور ٹرسٹ کی چیئرمین کی چیئرمین نزہت شہاب چشتی نے ادا کیے۔ مہمانوں کا استقبال گلدستہ دے کر محمد کاشف، نزہت شہاب چشتی اور شگفتہ نے کیا۔ پروگرام میں مقالہ نگاران کو سند وشال اور مومنٹو دے کر اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 19 فروری 2019

اردو اور ہندی کا باہمی رشتہ

لکھنؤ: ہندی اور اردو دونوں اہم ہندوستانی زبانیں ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں زبانوں کا فروغ مغلیہ حکومت کے زوال کی آہٹ کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً ایک ہونے کی وجہ سے ان کا فروغ بھی ایک ساتھ ہی شروع ہوا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ دونوں زبانوں کے اسلوب میں تھوڑی بہت تبدیلی نظر آنا شروع ہوتی ہے اور اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زبانوں کی سطح پر جتنا گہرا رشتہ اور قربت اردو اور ہندی زبانوں میں ہے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار صدر جلسہ پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی چیئر پرسن اترپردیش اردو اکادمی نیٹیو کلمیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام و اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد یک روزہ سمینار ’اردو اور ہندی کا باہمی رشتہ‘ میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ سمینار میں افتتاحی کلمات جنرل سکریٹری سوسائٹی نثار احمد نے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو مانو ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد، وائس چانسلر انٹیگرل یونیورسٹی سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں، اور اردو کے کچھ روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ کا بدل کوئی دوسرا ہندی لفظ نہیں ہے۔

مہمان اعزازی سینئر صحافی پریم کانت تیواری نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات پیش کیے۔ مقالہ نگار ڈاکٹر وصی اللہ خاں، ڈاکٹر شبنم اکبر، عقیل احمد فاروقی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، اویس سنبھلی، عطیہ بی، سعید اختر اور محمد راشد خاں نے اپنے تحقیقی مقالوں میں کہا کہ آزاد ہندوستان کے آئین میں ہندی اور اردو کو الگ الگ زبانوں کے طور پر رکھا گیا ہے، مگر اس کے باوجود ان زبانوں کا لسانی رشتہ ختم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی لسانی عکس میں زبانوں کی تاریخ اور ماخذ ایک ہی ہیں، اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ متواتر قائم ہے۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 25 فروری 2019

’اردو فکشن اکیسویں صدی میں‘ کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

’ہندوستانی زبانوں اور ادب پر عالمگیریت کا اثر‘ کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

اردو فکشن اکیسویں صدی میں

بنارس: عرصۂ دراز بعد مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ کے اردو شعبے کے زیر اہتمام قومی سیمینار کا انعقاد ہوا، نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ منعقد یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ’اردو فکشن اکیسویں صدی میں‘ کی صدارت صدر شعبۂ اردو مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ پروفیسر اوما رانی ترپاٹھی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی پروفیسر ٹی این سنگھ وائس چانسلر مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، مہمان مقرر پروفیسر یعقوب یاور سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، مہمان اعزازی پروفیسر محمد توقیر خاں سابق صدر شعبۂ اردو آرا یونیورسٹی بہار نے پروقار شرکت سے سیمینار کی شان وشوکت میں اضافہ کیا۔ پروفیسر ٹی این سنگھ نے کہا کہ اردو زبان بہت ہی شیریں ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ اس کی مٹھاس سے لطف اندوز ہو، اردو داں حضرات کو بالخصوص جانفشانی کرنی ہوگی تا کہ اردو مزید اونچائیوں پر پہنچ سکے، ٹی این سنگھ نے کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو بولتے وقت اردو کے ہی الفاظ استعمال کریں تا کہ اردو کے الفاظ رائج ہوں اور لوگوں کو زبان زد ہوں، اس سے الفاظ کے معنی سمجھنے کے ساتھ ساتھ غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوگا۔ منصب صدارت پر جلوہ افروز شعبہ کی صدر پروفیسر اوما رانی نے کہا کہ اردو کسی خاص طبقے کی زبان نہیں ہے، یہ زبان خوبصورت، شیریں اور اہمیت کی حامل ہے۔ صوفیاء کرام نے اس زبان کو ترقیوں پر پہنچایا، محترمہ اوما رانی صاحبہ نے اکیسویں صدی کے فکشن عناوین پر بھی روشنی ڈالی۔ مہمان اعزازی پروفیسر محمد توقیر خاں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فکشن ادب کی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، داستان اس کی ابتدائیہ تسلیم کی جاتی ہے۔ پروفیسر یعقوب یاور نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کہانی میں بیان حقیقی نہیں ہوتا بلکہ مجازی ہوتا ہے اور مجاز جھوٹ نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جمالیات کے ساتھ کہانی کو بیان کرنا ادب کی بنیاد ہے۔ پروفیسر یعقوب یاور نے کہا کہ ادب میں الفاظ کا استعمال جن معنوں میں ہوتا ہے وہ معنی ڈکشنری میں نہیں ہوتے۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے اس بات کو ثابت بھی کیا۔

یک روزہ قومی سیمینار دو نشستوں میں منعقد کیا گیا تھا۔ پہلے دور کے ختم ہونے کے بعد دوپہر 1 بجے دوسرے سیشن کا سلسلہ شروع ہوا، دوسرے دور کی صدارت پروفیسر یعقوب یاور نے کی جس میں کئی مقالے پڑھے گئے۔ نامور ادبا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلا مقالہ شعبۂ اردو ساکیت پی جی کالج ایودھیا کی ڈاکٹر بشریٰ خاتون نے ’اکیسویں صدی میں اردو فکشن ناول کے حوالے سے‘ عنوان پر پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ویر کنور سنگھ آرا یونیورسٹی بہار سے تشریف لائیں ڈاکٹر ناہیدہ خاتون نے بعنوان ’حسین الحق کا افسانہ ’ابراہیم کیوں مرا‘ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اسی طرح بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے تشریف لائے ڈاکٹر رشی کمار شرما نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ناولوں کا تہذیبی منظر نامہ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، چوتھا مقالہ پیش کرنے کے لیے دوسرے سیکشن کی ناظمہ شعبۂ اردو مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ کی استاد شہناز ارم نے ساکیت پی جی کالج اجودھیا سے تشریف لانے والے ڈاکٹر اشہد کریم کو دعوت سخن دی، انھوں نے ’اکیسویں صدی میں اردو فکشن کی جمالیات‘ کے عنوان سے دلچسپ معلومات فراہم کرائیں۔ آخری مقالہ بسنت کالج سے تشریف لائے ڈاکٹر محمد لئیق صاحب نے پیش کیا۔ سیمینار کے عنوان کے تعلق سے ڈاکٹر سفینہ بیگم نے نہایت ہی جامع انداز میں افتتاحیہ پیش کیا۔ سیمینار کے روح رواں شعبہ ہذا کے استاد ڈاکٹر محمد نظام الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ ’آواز ملک‘ بنارس، 22 فروری 2019

ایک شام پاسبانِ اردو زبان کے نام

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ قانون کے سینئر استاد پروفیسر شکیل صمدانی نے فروغ اردو زبان ٹرسٹ کے زیر اہتمام عیدگاہ گیٹ، ہاپوڑ میں ’ایک شام پاسبان اردو زبان اور وطن کی خاطر قربان ہونے والوں کے نام‘ موضوع پر منعقدہ پروگرام سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جو اسی ملک میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھ کر جوان ہوئی۔ پروفیسر صمدانی نے کہا کہ اردو زبان کے کمزور ہونے کے سبب بیشتر ہندوستانیوں کا تلفظ خراب ہوگیا ہے جو ملک کا ایک بڑا نقصان ہے۔ انھوں نے کہا کہ شمالی ہند کے مقابلے مغربی ہند میں اردو کے چاہنے والوں نے اردو کی ترقی کے لیے کافی کام کیا ہے جس کی وجہ سے وہاں اردو جاننے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے اردو اساتذہ اور مترجمین سے اپیل کی کہ وہ اپنے اسکولوں اور شعبوں میں اردو کی ترویج واشاعت کا فریضہ انجام دیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا یکدم غلط ہے کیونکہ اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں اور شعرا نے اہم اور تاریخ ساز رول ادا کیا ہے۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 27 فروری 2019

ہندوستانی زبانوں اور ادب پر عالمگیریت کا اثر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے ماڈرن انڈین لینگویجز شعبہ کے مراٹھی سیکشن کے زیر اہتمام ’ہندوستانی زبانوں اور ادب پر عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کا اثر‘ موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ نئی صدی میں عالمگیریت نے حیاتِ انسانی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور دنیا ایک مختصر گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے جس سے دنیا بھر کی ثقافتیں متاثر ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گلوبلائزیشن کے دور میں انگریزی رابطے کی زبان ہے پھر بھی دنیا میں ہندوستان دوسرے سب سے بڑے بازار کا کردار ادا کر رہا ہے جہاں زبانوں اور بولیوں کے بغیر

کاروبار کرنا مشکل ہے۔ سیمینار کے خصوصی مقرر اے ایم یو کے یو جی سی ایچ آر ڈی سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ جدید دور میں ٹیکنالوجی کے فروغ کے باوجود ہمارے لیے انسانی اقدار کی پاسداری کرنا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ گلوبلائزیشن کے دور میں انسان کی اپنی اہمیت ہونی چاہیے نہ کہ اس کے برانڈ اور نمبر کی۔ راجستھان سینٹرل یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے ڈاکٹر سندیپ رنجر نے کہا کہ کرائے کی زبان میں 'واہ' ہوتی ہے اور گلوبلائزیشن کی روح میں کہیں نہ کہیں بازنظر آتا ہے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے انسان میں ناامیدی، خوف اور تنہائی جیسی خامیاں پیدا ہورہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب سماج کی نبض پر انگلی رکھ کر قلم چلاتا ہے جو سماج کے دکھ درد کو کورے کاغذ پر اتار دیتا ہے لیکن جس قاری کے دل میں انسانی جذبات کا احترام ہوتا ہے وہی اس کو ٹھیک ڈھنگ سے سمجھ پاتا ہے جبکہ گلوبلائزیشن نے انسانی جذبات کو ختم کرکے رکھ دیا ہے اور اس کا واحد تدارک ادب اور دیسی پن ہے۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر مسعود انور نے گلوبلائزیشن کی خوبیوں اور خامیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ سیمینار میں اے ایم یو کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں سے اساتذہ و ریسرچ اسکالرس نے 89 مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 فروری 2019

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں علمائے ہند کی عربی خدمات

علی گڑھ: اے ایم یو کے شعبۂ عربی کے زیراہتمام

'بیسویں صدی کے نصف اول میں علمائے ہند کی عربی خدمات' موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان نے بڑے پیمانے پر فروغ حاصل کیا ہے اور متعدد ہندوستانی دانشوروں نے عربی زبان کے فروغ اور تحقیق کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ عرب دنیا میں ہونے والی ادبی خدمات کے مقابلے کم نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ عربی اس یونیورسٹی کی پہچان ہے اور ہمیں اس پر مزید توجہ مبذول کرنی ہوگی۔ اس موقعے پر پرو وائس چانسلر پروفیسر حنیف بیگ نے بھی شعبے کی خدمات کی تحسین کی اور اس بات کی تاکید کی کہ عربی زبان کو مذہبی نقطۂ نظر سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ پروفیشنل طور پر بھی اختیار کیا جائے۔ انگلش اینڈ فارین لینگویجز یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی پروفیسر اقبال حسین ندوی نے اپنے کلیدی خطبے میں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں علمائے ہند کی عربی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ شبلی، فراہی، عبدالحی حسنی، کرامت علی جونپوری، ثناء اللہ امرتسری، احمد رضا خاں، انور شاہ کشمیری، شمس الحق عظیم آبادی وغیر کی تفسیر، حدیث، فقہ اور عربی زبان وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات رہی ہیں۔ دو روزہ سیمینار کے کنوینر پروفیسر محمد صلاح الدین عمری نے تمام مہمانان کو خوش آمدید کہتے ہوئے سینٹر فار ایڈوانس اسٹڈیز (II) کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور عربی زبان وادب کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں عربی زبان وادب کی صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر مسعود انور علوی نے سیمینار کی انتظامیہ میں موجودہ تمام افراد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد سمیع اختر نے وائس چانسلر کی یونیورسٹی کی تئیں فکرمندی کو قابل تحسین قرار دیا اور گذشتہ چند سال کے اندر شعبۂ عربی کے لیے سہولیات فراہم کرنے پر ان کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور آخر میں سبھی مہمانان، حاضرین اور ذمہ داران بالخصوص حشمت، سلیم، محمد فاضل، فہیم، ظہیر اور ذیشان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 فروری 2019

موجودہ دور میں اردو کے مسائل

لکھنؤ: اشرف سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام اترپردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے بعنوان 'موجودہ دور میں اردو کے درپیش مسائل' پر آل انڈیا کیفی اکادمی نشاط گنج میں قومی سیمینار رہوا جس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو کی اہمیت پر توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ ماں کی تعلیم وتربیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بچہ زیادہ وقت اس کے پاس گزارتا ہے اس لیے ماں کا اردو سے واقف ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سبھی زبانوں کا احترام کرتے ہیں لیکن بچے اپنی مادری زبان پر توجہ ضرور دیں اسی سے اردو زندہ ہوگی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کی ترقی کے ساتھ ہندی کی ترقی لازمی ہے اس لیے اردو کو تعصب کی نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں اس لیے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے نہیں دیکھنا چاہیے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اردو کے طلبا یا اردو سے تعلق رکھنے والے ضرور اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ہم اپنی چاہت اور پسند سے اردو میں آئے اور ہم نے ترقی کی اور آج اردو کی ترقی کے لیے کام کررہے ہیں۔ آج اردو کی ترقی کا اندازہ اس سے بھی لگا سکتے ہیں کہ آج اردو میں مسابقہ کے باوجود طلبا کی کثیر تعداد ہے۔ انھوں نے انگلینڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو چوتھے مقام پر ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے کہا کہ اردو اور اہل اردو پہلے سے زیادہ کامیاب ہیں اور دونوں ترقی کررہے ہیں۔ اردو کے تعلق سے اردو کے طلبا مایوس نہ ہوں۔ جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں قابل ذکر نام ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری، ڈاکٹر اکمل، ڈاکٹر جاوید، لکھنؤ کے مشہور افسانہ نگار محسن خان کے ہیں۔ آخر میں تمام شرکا کا نام لے کر شکریہ ادا کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثوبان سعید نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 فروری 2019

منشی پریم چند اور ان کی ترقی پسندی

لکھنؤ: پریم چند بنیادی طور پر طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ ان کی رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب

'منشی پریم چند اور ان کی ترقی پسندی' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

ہے جس کا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایۂ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی چیئرپرسن اتر پردیش اردو اکادمی نے ووکیشنل انڈسٹریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام اور اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ سیمینار 'منشی پریم چند اور ان کی ترقی پسندی' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی سابق ڈی جی پی اتر پردیش رضوان احمد نے کہا کہ پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے گاؤں کے کسانوں، کھیت کھلیانوں، مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے۔ انھیں ہیرو بنا دیا، ان کے دکھ سکھ کی کہانی سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساس و جمال سے آشنا کیا۔ مہمان اعزازی ایس رضوان سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ پریم چند کی تخلیقی ہنرمندی یہ ہے کہ انھوں نے حقیقت کو اس طرح پیش کیا کہ پڑھنے والا اس کے آئینے میں سماج کی تصویر بھی دیکھتا ہے اور پریم چند کی فنی عظمت کا بھی قائل ہوتا ہے۔ مہمان ذی وقار آصف زماں رضوی نے کہا کہ پریم چند کے اردو ادب پر بڑے احسانات ہیں۔ ضیاء اللہ صدیقی ندوی اور ڈاکٹر مجاہدالاسلام کے علاوہ دیگر شعرکا نے بھی پرمغز مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 فروری 2019

موجودہ تعلیم میں اردو کا مقام

دھامپور: اردو ادب انجمن ویلفیئر سوسائٹی (این جی او) کے زیر اہتمام بعنوان 'موجودہ تعلیم میں اردو کا مقام' ایک روزہ سیمینار کا انعقاد ریلوے اسٹیشن روڈ پر واقع ریزیڈینسی میں ہوا جس میں کثیر تعداد میں مقالہ نگاروں، قلم کاروں سماجی کارکنوں ادیبوں، شاعروں اور کویوں نے شرکت کی۔ ضلع کے کونے کونے سے آئے ادیبوں قلم کاروں اور مقالہ نگاروں میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی طبقے کی زبان نہیں ہے۔ اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی پہچان ہے۔ اردو اور ہندی زبان ہندوستان کی دو سگی بہنیں ہیں لیکن آج اردو اپنے ہی وطن میں سوتیلی بہن بن کر رہ گئی ہے۔ موجودہ وقت میں کچھ چھوٹی سوچ رکھنے والے لوگ اردو زبان کی مسلمانوں کو زبان مان کر اس کا استحصال کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اردو زبان کو اپنی زبان کہنے والے لوگ اردو کو ہر اعتبار سے نظر انداز کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 1 مارچ 2019

بہار

ضلع اردو سیل کے زیر اہتمام تقریری مقابلہ

ارریا: ڈائرکٹوریٹ اردو زبان راج بھاشا کے زیر اہتمام ضلع اردو سیل کی جانب سے ارریا ٹاؤن ہال میں اسکول اور کالج و مدارس کے طلبا و طالبات کے درمیان تقریری مقابلہ کا انعقاد کیا گیا جس کے ضلع اردو سیل کے افسر سنجے کمار نے افتتاح کرتے ہوئے فروغ اردو پر روشنی ڈالی۔ اس سے قبل نظامت کر رہے اردو کے ٹرانسلیٹر محمد خالد حسن نے مقابلے کا باضابطہ آغاز داغ کے اس شعر سے کیا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور اس تقریری مقابلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد اردو زبان کو فروغ دینا ہے اور طلبا و طالبات میں اردو پڑھنے کے رجحان کو بڑھانا ہے۔ مہمان خصوصی سنجے کمار نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے اردو داں طبقے کو آگے آنا ہوگا تبھی اس کی ترقی ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے اس کی طرح کے مقابلہ جاتی پروگرام ہر ضلع میں منعقد کیے جا رہے ہیں جس کے نتائج بہت مثبت نظر آنے لگے ہیں۔ حکومت اسے فروغ دینے کے لیے ہر ممکن ذرائع پیدا کر رہی ہے۔ آج کے تقریری مقابلہ کے عنوانات جہیز ایک سماجی برائی، پیاری اردو زبان، شراب بندی کے فائدے، اردو نظم کی مقبولیت اور نابالغی میں شادی بیاہ کے برے نتائج تھے طلبا اور طالبات نے انھیں جس طرح سے پیش کیا اسے سن کر لوگ حیران رہ گئے اور کہا کہ اب لگنے لگا ہے کہ طلبا و طالبات کے درمیان اردو سے دلچسپی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس مقابلہ میں مدرسہ اسلامیہ یتیم خانہ ارریا گرلس آئیڈیل اکادمی السبیل اکادمی و دیگر سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں، مدرسوں اور کالجوں کے میٹرک انٹر اور گریجویشن تک تقریباً 70 سے زیادہ طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 فروری 2019

سارن ڈویژن میں اردو زبان و ادب

چھپرہ: جے پرکاش یونیورسٹی کے راجندر کالج میں واقع پوسٹ گریجویٹ عمارت میں شعبہ اردو کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'سارن ڈویژن میں اردو زبان و ادب'

کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کا افتتاح جے پرکاش یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ہری کیش سنگھ اور مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر رفیق اعظم نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر ہری کیش سنگھ نے کہا کہ سارن کی زمین ادب کے لیے ہر دور میں زرخیز رہی ہے۔ اردو زبان کے ساتھ دیگر زبانوں کی ترویج و اشاعت میں سارن کے ادبا و شعرا کا اہم کردار رہا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ سارن ڈویژن سے تعلق رکھنے والے ادبا اور شعرا نے اردو زبان و ادب کے ترویج و اشاعت میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں شاعری، تنقید نگاری اور فکشن نگاری کے حوالے سے کہا کہ شعری دنیا میں جہاں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی نے اہالیان اردو کو متوجہ کیا وہیں فکشن کے باب میں غضنفر اور پیغام آفاقی نے اردو کی عالمی منظرنامے پر اپنے شناخت کو قائم کی ہے۔ مہمان خصوصی نے کہا کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے اور دیگر ممالک کے دورے پر بھی میں نے اردو بولنے اور پڑھنے والوں سے ملاقات ہوئی اور آج

دنیا کے متعدد ممالک میں اردو بولنے والے افراد مل جاتے ہیں۔ پروفیسر حسین الحق (سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، گیا) نے اردو اور فارسی کے رشتے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ہندی سمیت دیگر زبانوں پر اثرات کو مرتب کیا ہے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر شہناز نبی نے کہا کہ تحقیق وتنقید میں عقیدت کی گنجائش نہیں ہے۔ آج کا بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگ تنقید کرتے وقت علاقائیت کے ساتھ ساتھ عقیدت کا مظاہرہ کرکے تحقیق وتنقید کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں۔ سمینار کے دوسرے روز ڈاکٹر ریاض احمد، پروفیسر مولا بخش، پروفیسر رضی الرحمٰن سمیت دیگر مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جبکہ نظامت کے فرائض شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر مظہر کبریا نے بخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 فروری 2019

تلنگانہ:

محفل افسانہ ومشاعرہ

حیدرآباد: اردو کی عظیم وراثت کو نئی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے لازمی ہے کہ فروغ اردو کے سبھی پروگراموں میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ اردو کے کارواں کو مزید آگے لے جاسکیں۔ اردو دلوں کو جوڑنے والی عالمی بھائی چارے کی عظیم زبان ہے جس کے شعر وادب کے سرمایے سے استفادے اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مجید بیدار نے قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ شام افسانہ ومشاعرے سے کیا۔ اس پروگرام کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر ایم ایم انور پرنسپل سائنٹسٹ وسرپرست بزم تھے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اردو افسانے کے اہم خدوخال پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے محمد انیس فاروقی کا افسانہ آورش وادی پیش کیا۔ آگرہ سے ریسرچ اسکالر سعدیہ سلیم نے اپنا افسانہ نے پیش کیا۔ امرناتھ راگیر نے اپنا افسانہ مکالمہ پیش کیا۔ ریسرچ اسکالر ظفر اقبال نے مومن خان شوق فن اور شخصیت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ادبی اجلاس کے بعد محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جس میں مدعو شعرا شکیل انور رزاقی، ڈاکٹر ناقد رزاقی، سردار اثر، کامل حیدرآبادی، مومن خان شوق اور صدر جلسہ پروفیسر مجید بیدار صاحب نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے پروگرام کی نظامت کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اسلم فاروقی، حیدرآباد، تلنگانہ، 24 فروری 2019

بیسویں صدی میں اردو ادب کا جائزہ

حیدرآباد: ادبی تحریکیں ورجحانات فکری صلاحیتوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اردو کی ادبی تحریکات میں ترقی پسند تحریک کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک کا تعلق راست روس سے تھا جبکہ جدیدیت تحریک میں بھی کم وبیش ترقی پسند تحریک جیسی ہی رہی مگر اس میں جنسی تلذذ، ذہنی عیاشی کو زیادہ فروغ ملا۔ ان خیالات کا اظہار بیسویں صدی میں اردو ادب کا جائزہ عنوان کے تحت بزم فروغ اردو وبزم علم وادب کے اشتراک سے مسدوسی ہال مغلپورہ میں منعقدہ مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی حمید الظفر نے کیا۔ جدیدیت تحریک سے وابستہ شعرا میں حسن فرخ، رؤف خیر، غیاث متین اہمیت کے حامل تھے جبکہ افسانہ نگاروں میں واجدہ تبسم، پروفیسر بیگ احساس، رضا الجبار، احمد ہمیش اور یسین احمد قابل ذکر ہیں۔ صدر بزم علم وادب ڈاکٹر نادر المسدوسی نے کہا کہ تاریخ کو بیان کرنے کے لیے حافظہ کا اہم رول ہوتا ہے اور نوجوان اچھے حافظے کے لیے ادبی لٹریچر پڑھیں اور ادبی کاموں میں حصہ لیں۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر م ق سلیم نے کہا کہ آج کا تمام ادب بیسویں صدی پر منحصر ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر لکھا جارہا ہے۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم لکھ کر عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ بیسویں صدی میں خاتون افسانہ نگاروں نے کافی نام کمایا جن میں عصمت چغتائی، جیلانی بانو، رشید جہاں شامل ہیں۔ ان خاتون افسانہ نگاروں نے نہ صرف اپنے فن کا لوہا منوایا بلکہ اردو ادب کو معرکۃ الآراء ناولیں بھی دیں۔ مذاکرے سے خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم نے کہا کہ آج حیدرآباد میں ادبی ماحول بگڑ چکا ہے۔ ہم کو دوبارہ ایک تحریک کی ضرورت ہے جس سے نوجوان ادب کی طرف دوبارہ راغب ہوجائیں۔ ڈاکٹر ناظم علی نے کہا کہ انیسویں صدی میں کلاسیکل لٹریچر ہوتا تھا اور بیسویں صدی کا اگر ہم جائزہ لیں تو اس میں ہم کو بڑے بڑے فنکار مل جاتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی، سرسید، چکبست، جگر مرادآبادی، منشی پریم چند ایسے ادیب گذرے ہیں جنھیں آج بھی ہم شوق سے پڑھتے ہیں۔ میر وقار الدین علی خان نے کہا کہ پہلے کے افسانوں میں ایک سبق ہوتا تھا اور حقیقت بیانی ہوتی تھی، خاص کر منشی پریم چند کے افسانوں سے لوگوں کو تحریک ملی۔ ڈاکٹر جہانگیر احساس نے مذاکرے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بیسویں صدی میں تین اہم تحریکات ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کافی اہمیت کی حامل رہیں۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا آئینہ قرار دیا۔ انھوں نے تفصیلی طور پر ان تحریکات کی تفصیلات بیان کیں۔ محسن خان نے بیسویں صدی میں اردو ادب کا جائزہ عنوان کے تحت اپنا مضمون پیش کیا۔ انھوں نے مضمون میں بتایا کہ بیسویں صدی تک اردو ادب کا شمار عالمی ادب میں کیا جانے لگا اور یہی وہ دور تھا جب اردو زبان وادب نے دیگر زبانوں کے مقابلے اپنا لوہا منوایا۔ محسن خان نے کہا کہ اکیسویں صدی ای لٹریچر کی صدی ہے اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے تخلیقات کو دنیا بھر میں پہنچانے میں آسانی ہوگئی ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر میم قاف، حیدرآباد، تلنگانہ، 24 فروری 2019

راجستھان:

مولانا ابوالکلام آزاد: ہمہ جہت شخصیت

اجمیر: بھگونت یونیورسٹی، اجمیر میں شعبۂ اردو کی جانب سے 'مولانا ابوالکلام آزاد یادگاری خطبۂ' بہ عنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد: ہمہ جہت شخصیت' 27 فروری 2019 منعقد کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے علما نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور آج بھی وہ ہر جہت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تحریک آزادی میں علما کے میر کارواں بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد، آزادی کی شمع تھے۔ وہ ملک کی صدیوں پرانی تہذیب کے امین بن کر ہمارے سامنے آئے۔ ان خیالات کا اظہار خصوصی مقرر پروفیسر سید لیاقت حسین معینی (سابق استاد شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کی عظیم شخصیت ہمیشہ ملک کے تئیں آپسی اخوت ومحبت کا درس دیتی رہی۔ مولانا جانتے تھے کہ ہندو مرتا ہے اور نہ مسلمان بلکہ انسان مرتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ٹی کے ماتھر (سابق استاد شعبۂ تاریخ، ایم ڈی ایس یونیورسٹی، اجمیر) نے مولانا آزاد کے سیاسی محرکات کے تاریخی حقائق کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم مولانا آزاد کے مشورے پر چلتے تو ہندوستان کے کبھی ٹکڑے نہیں ہوتے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی سیاسی دوراندیشی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں آٹھ سو سال تک ہندو مسلم مل کر ایک ساتھ رہے لیکن کبھی بھی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی جو آج ہمارے ملک میں ہے۔ پروفیسر وی کے شرما (وائس چانسلر، بھگونت یونیورسٹی) نے اپنی صدارتی خطبے میں کہا کہ بھارت کے دو ٹکڑے کرنے میں نہ ہندو ذمے دار ہیں اور نہ مسلمان، بلکہ اس کے اصل ذمے دار انگریز ہیں۔ انھوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کا حربہ اپنا کر ہندوستانیوں کو آپس میں لڑا دیا اور ہم آج بھی اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ نظامت اور

استقبالیہ کلمات کے فریضے صدر شعبہ ڈاکٹر شاکر علی صدیقی نے بخوبی انجام دیے۔ انھوں نے اپنے استقبالیہ کلمات میں مولانا آزاد کی معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تحریک آزادی کی تاریخ مولانا آزاد کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ آخر میں اظہار تشکر کی رسم ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر دنیش مانڈوت (رجسٹرار، بھگونت یونیورسٹی) نے مولانا آزاد کے تعلیمی منصوبوں کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مارچ 2019

کرناٹک:

مجتبیٰ حسین کو خراج تحسین

گلبرگہ: مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا میں بچپن ہی سے شیدائی رہا ہوں۔ پہلے ان کی کتاب 'تکلف بر طرف' پڑھنے کا موقع ملا، اس کے بعد میں ان کی ہر تحریر کا مطالعہ کرنے لگا۔ مجتبیٰ حسین کو کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سینئر افسانہ نگار صدر مجلس شعور ادب جناب سراج وجیہ تیر انداز نے کیا۔ گلبرگہ کی جانب سے ممتاز طنز ومزاح نگار منظور وقار کی رہائش گاہ پر 11 فروری کی شام منعقدہ خصوصی ادبی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے سراج وجیہ نے مزید کہا کہ گلبرگہ کی سرزمین طنز ومزاحیہ نگاری کے لیے زرخیز رہی ہے۔ ابراہیم جلیس، سلیمان خمار، اور مجتبیٰ حسین کے بعد منظور وقار بہ حیثیت طنز ومزاح نگار کل ہند سطح پر اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر زمیندار مظہر حسین نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ حسین کو کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ملا ہے اس کے لیے ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اور ابراہیم جلیس کا شمار بلند پایہ طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

گجرات:

آئی آئی ٹی گجرات میں مولانا آزاد چیئر کا قیام

گاندھی نگر: مہاتما گاندھی کے سابرمتی آشرم سے متصل انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، گاندھی نگر، گجرات میں 'مولانا آزاد چیئر' کے قائم کرنے کی تقریب انجام دی گئی، جس میں مہمان خصوصی جناب فیروز بخت احمد، چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پروفیسر اختر الواسع، محترمہ سعیدہ سیدین حمید، پروفیسر حمیدہ بانو چوپڑا، پروفیسر سدھیر کمار جین (ڈائریکٹر: آئی آئی ٹی گاندھی نگر)، اردو کے پروفیسر مبشر احسان، پروفیسر امت پرشانت، کرشمہ گپتا، راہل اپادھیائے، بھارتی مالویہ اور احتشام صاحب کے علاوہ گاندھی نگر، گجرات کے اردو سے رغبت رکھنے والے کافی لوگوں نے شرکت کی۔

سابرمتی آشرم کے قریب، اردو اور مولانا آزاد چیئر کے نام کی بستی بھی بس گئی ہے۔ انھوں نے پروفیسر حمیدہ بانو کو اس بات کے لیے دلی مبارکباد دی کہ ان کی کوششوں سے سائنس اور ٹکنالوجی کی اس زمین پر اردو کے شادیانے بھی بجنے لگے۔ فیروز بخت نے بتایا کہ جہاں تک اردو کی خدمات کا تعلق ہے مولانا آزاد کی خدمات، اس زبان کے لیے بے لوث ہیں۔ پروفیسر حمیدہ بانو چوپڑہ نے کہا کہ جو کیلیفورنیا کی برکلے یونیورسٹی اور آئی آئی ٹی گاندھی نگر میں اردو پڑھاتی ہیں، نے بتایا کہ یہ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ گاندھی نگر کی سائنس کی نگری میں مولانا آزاد کے نام ایک چیئر کا قیام عمل میں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ آج ہندوستان میں سائنس اور ثقافت کے جتنے بھی بڑے سینٹر ہیں، وہ مولانا آزاد کی دین ہیں جن میں ملک کے نامور آئی آئی ٹی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن، سی ایس آئی آر، آئی سی ایچ آر، انجمن ترقی اردو وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے 2011 سے 2019 تک آئی آئی ٹی، گاندھی نگر میں اردو کی درس وتدریس کی اور اب تک سینکڑوں طلبا جو کہ آج سائنس کے میدان میں اپنا نام کما رہے ہیں، اردو کا پرچم بھی بلند کیے ہوئے ہیں۔ اس چیئر کے لیے، حمیدہ بانو صاحبہ نے ایک کروڑ 20 لاکھ کی رقم آئی آئی ٹی کو فراہم کی ہے۔

پروفیسر اختر الواسع نے اپنی پرمغز تقریر میں کہا کہ اردو زبان نے ہمیشہ نہ صرف دلوں کو جوڑا ہے، بلکہ دلوں کو بھی جوڑا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کی بقا میں مدارس اسلامیہ کا ایک اہم رول ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا آزاد ہندوستان میں پہلے آئی آئی ٹی قائم کرنے والے وزیر تعلیم تھے اور یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ آج گاندھی نگر میں قائم آئی آئی ٹی میں مولانا آزاد کے نام پر ایک چیئر قائم کی جا رہی ہے، جس کے لیے محترمہ حمیدہ بانو چوپڑا اور ڈاکٹر انل چوپڑا، ہم سب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس کے ساتھ ہی گاندھی نگر کے ڈائریکٹر پروفیسر سدھیر کمار جین، خاص طور سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا آزاد چیئر کے قیام کو نہ صرف منظوری دی بلکہ اس کو اردو زبان کی تعلیم وتدریس کے لیے مخصوص کر دیا۔

معروف خاتون کارکن اور ایکٹوسٹ، محترمہ سعیدہ سیدین حمید نے آئی آئی ٹی گاندھی نگر میں مولانا آزاد چیئر کے قائم ہونے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یوں تو ہر زبان کی اپنی مٹھاس ہے مگر اردو کا انداز بیاں کچھ اور ہی ہے۔ انھوں نے بزم مشاعرہ کے اندر آئی آئی ٹی کے اساتذہ وطلبا کے ذریعہ پڑھے گئے اقتباسات، نظموں اور غزلوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جب یہ لوگ بول رہے تھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے ہر لفظ میں مصری کی ڈلی کی شیرینی، سلاست، اور گھلاوٹ موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب اظہار خیال اردو میں ہوتا ہے تو اس کی نزاکت، لطافت اور خطابت کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اخیر میں ڈائریکٹر، پروفیسر سدھیر کمار جین نے کہا کہ واقعی مولانا آزاد چیئر نہ صرف ان کے خوابوں کی تعبیر ہے بلکہ یہ ایک عرصے سے ان کی دل کی پکار رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو میں جو بھی بولتا ہے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی انھیں کے دل کی بات ہے۔ آئی آئی ٹی میں آزاد چیئر کے تعلق سے وہ اردو کی خدمت کا بہترین کام کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

پریس ریلیز: فیروز بخت احمد، ذاکر نگر، نئی دہلی، 7 فروری 2019

مہاراشٹر:

اردو رسائل کی صورت حال پر مذاکرہ

اورنگ آباد: محبان اُردو اور بہی خواہان زبان ہندوی اس بات کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں کہ گذشتہ کئی دہائیوں سے اُردو زبان وادب کے رسائل خرید کر پڑھنے کا مزاج معدوم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی اہم وجہ اُردو جرائد ورسائل میں سنجیدہ طنز وظرافت پر مبنی مزاحیہ مضامین کی عدم موجودگی

ہے اور اس تساہل میں ارباب حرف وقلم اور ناشرین حضرات بھی برابر کے شریک ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ناشرین اور اہل علم وفکر ایسے ارباب قلم کی جستجو میں رہیں جو سنجیدہ طنز ومزاح کی تحریریں تخلیق کرنے پر قادر ہوں۔ کیوں کہ طنز ومزاح سے بھری تحریریں ہی قارئین بالخصوص بچوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔اس طرح کے خیالات کا اظہار مشہور اُردو علمی و جریدہ ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد) کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی شہر اورنگ آباد میں ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن اورنگ آباد کے دفتر واقع قیصر کالونی پر منعقدہ پروگرام 'مصنف سے ملیے' میں فرما رہے تھے۔ اسی مجلس میں بنگلور کی مشہور علمی وادبی تنظیم 'محفل نسا' کی جانب سے 'محمود ایاز ایوارڈ برائے اُردو خدمات' مرزا عبدالقیوم ندوی کو تفویض ہونے پر اُن کا استقبال کیا گیا، ساتھ ہی اردو رسائل و جرائد کے فروغ خصوصاً 'ماہنامہ بچوں کی دنیا' کو ملک کا سب سے بڑا بچوں کا رسالہ بنانے میں ان کی کاوشوں کا اعتراف بھی کیا گیا۔ مشہور افسانہ وناول نگار نورالحسنین نے کہا کہ نئی نسل میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنا نہایت ہی ضروری ہوگیا ہے اور یہ کام مرزا عبدالقیوم ندوی بخوبی انجام دے رہے ہیں ،وہ اسکول اسکول جاجا کر طلبا میں مطالعہ بیداری مہم چلاتے ہیں اور انہیں پڑھنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

اس علمی وادبی مذاکرے کی صدارت مشہور مؤرخ، شاعر ومحقق اسلم مرزا نے فرمائی جبکہ شرکائے مذاکرہ نورالحسنین، عارف خورشید، ڈاکٹر عظیم راہی، احمد اقبال اور مرزا عبدالقیوم ندوی شریک تھے۔ مرزا طالب بیگ نے مجلس کے اختتام پر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: مرزا عبدالقیوم ندوی، مہاراشٹر، 23 فروری 2019

اعزاز و اکرام:

اردو اکادمی ، دہلی کے زیر اہتمام سالانہ ایوارڈ تقریب برائے 2017-18

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سالانہ ایوارڈ تقریب برائے 2017-18 کا انعقاد آڈیٹوریم، دہلی سکریٹریٹ، آئی پی اسٹیٹ، نئی دہلی میں منعقد ہوا۔اس پروگرام میں استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو اکادمی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اردو اکادمی ہر سال ادیبوں کی خدمت میں ایوارڈ پیش کرتی ہے۔ قلم گویدکہ من شاہ جہانم ، یہ پروگرام قلم کاروں کا جشن ہے، ادیبوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ادب کی بیش بہا خدمات میں صرف کیا ہے۔ ادیب کی مختلف شاخیں ہیں، ان کی خدمات کا اعتراف کرنا اردو اکادمی کا فرض ہے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی اور دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا کہ دراصل یہ ایوارڈ ادیبوں کی خدمات کا اعتراف ہے۔ میں تمام ایوارڈ یافتگان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ سب نے اردو اکادمی کا ایوارڈ قبول کیا۔ آپ سب نے اردو کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں جس کا اعتراف کرنا ہمارا فرض ہے۔ دہلی حکومت نے یہاں 15 زبانوں کی اکادمیاں قائم کی ہیں۔ ملک کی تمام زبانوں کی اکادمیاں ہمیں قائم کرنی ہیں۔اس پروگرام کی نظامت اطہر سعید اور ریشما فاروقی نے کی۔ خیال رہے کہ سالانہ ایوارڈ تقریب میں کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ معروف ادیب مجتبیٰ حسین کو دیا گیا۔ اس ایوارڈ کی رقم ڈیڑھ لاکھ روپے ہے، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ ڈاکٹر فیروز دہلوی کی خدمت میں پیش کیا گیا، اس ایوارڈ کی رقم بھی ڈیڑھ لاکھ روپے ہے۔ ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید پروفیسر حنیف کیفی کو، ایوارڈ برائے تخلیقی نثر ڈاکٹر خالد جاوید کو، ایوارڈ برائے شاعری پروفیسر خالد محمود کو، ایوارڈ برائے صحافت منصور آغا کو، ایوارڈ برائے ترجمہ نگاری عبدالنصیب خان اور ایوارڈ برائے ڈرامہ ڈاکٹر ایم سعید عالم کو پیش کیا گیا۔ ان ایوارڈز کی رقم 50-50 ہزار روپے ہے۔ تمام ایوارڈ یافتگان کو نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے شال، سند، مومنٹو اور نقد انعامات سے نوازا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 فروری 2019

مصطفیٰ کمال

نئی دھلی: دنیائے اردو میں طنز ومزاح کے واحد قدیم اردو رسالے ماہنامہ 'شگوفہ' حیدرآباد اور اس کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو مرکزی حکومت کی جانب سے اعلیٰ ترین ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ مرکزی سرکار کی وزارت ثقافت کے ماتحت ادارے دہلی لائبریری بورڈ کی جانب سے ہر سال چار زبانوں ہندی، سنسکرت، پنجابی اور اردو کو متعلقہ زبان کی ترویج کے ضمن میں ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ امسال اردو زبان کے لیے ماہنامہ شگوفہ کو منتخب کیا گیا ہے۔اردو کا دوسرا ایوارڈ کلکتہ کے ماہنامہ 'انشا' اور اس کے مدیر ف س اعجاز کو پیش کیا گیا۔گذشتہ شام دہلی کے 'ہندی بھون' میں منعقدہ تقریب میں مرکزی ثقافت ڈاکٹر مہیش شرما کے ہاتھوں ایوارڈ کی تقسیم عمل میں آئی اور انھوں نے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو توصیفی سند کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا انعام پیش کیا۔ ماہنامہ 'شگوفہ' ہندوپاک کے مزاحیہ ادب کی تاریخ میں واحد ایسا رسالہ ہے جس نے اپنی مسلسل اشاعت کے 51 سال مکمل کیے ہیں۔ رسالے کے 100 سے زیادہ خصوصی نمبر اور 50 سے زیادہ مخصوص گوشے شائع کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ادارہ شگوفہ کی جانب سے کئی اہم مشاہیرین ادب کی کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 فروری 2019

پروفیسر علی احمد فاطمی

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک پروقار تقریب میں راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر علی احمد فاطمی کو پروفیسر قمر رئیس ایوارڈ سے سرفراز کیا

گیا۔اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس کے زمانے میں اور ان کے بعد ترقی پسند تحریک کی مشعل کو پروفیسر علی احمد فاطمی نے جس ہمت اور لگن کے ساتھ جلائے رکھا اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اردو تنقید وتحقیق کے میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انھیں اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا

کہ پروفیسر علی احمد فاطمی کی وجہ سے اس ایوارڈ کی توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ اس موقعے پر علی احمد فاطمی نے کہا کہ مجھے کئی ایوارڈ ملے مگر قمر رئیس کی نسبت سے اس ایوارڈ کے حصول پر جو خوشی و مسرت کا احساس ہو رہا ہے اس کا اظہار ممکن نہیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر، پروفیسر سید شاہد مہدی نے پروفیسر قمر رئیس سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ جہد و عمل کا پیکر تھے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ترقی پسند تحریک کا ایک زمانہ تھا جواب نہیں رہا، لیکن اس کے باوجود پروفیسر قمر رئیس اس کے احیا کی کوشش کرتے رہے اور ان کے بعد علی احمد فاطمی بھی اسی کوشش میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مارچ 2019

رسم اجرا:

وہ میرانی ہے

نئی دہلی: انٹرنیشنل صوفی مشن کے زیر اہتمام ملک کے نامور شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے نئے نعتیہ شعری مجموعہ 'وہ میرانی ہے' کی رسم اجرا کی تقریب 13 فروری 2019 کی شام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے تعاون سے آئی آئی سی سی کے آڈیٹوریم، میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے کی۔ تقریب کا آغاز قاری شمیم قاسمی نے تلاوت کلام پاک سے کیا جبکہ تابش ریحان نے ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی نعتیہ نظم 'وہ میرانی ہے' پیش کی۔ اعلیٰ معیاری یونانی دوائیں بنانے والی مشہور کمپنی ریکس ریمیڈیز کے مینیجنگ ڈائرکٹر جناب محمد شعیب اکرم کی جانب سے منعقدہ اس تقریب میں مہمان ذی وقار کے طور پر امیر شریعت حضرت مولانا ولی رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر، مولانا کلب جواد، مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی، ہند ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد شاہی امام مسجد فتح پوری، اور ریکس ریمیڈیز کے ڈائرکٹر محمد عارف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے دوسرے حصے میں ایک نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس کی صدارت خواجہ راشد فریدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض گلزار جگر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 فروری 2019

دوسرا جسم

نئی دہلی: شاعری سماج کا آئینہ ہے، اس لیے ادیب و شاعر کی ذمے داری بے حد بڑھ جاتی ہے۔ عتیق انظر کی شاعری میں ان کا عہد اور سماجی سروکار بولتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو اپنی شاعری میں شامل کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار 'آپ' کے ترجمان ممتاز ادیب و دانشور دلیپ پانڈے نے عتیق انظر کے دوسرے مجموعۂ کلام 'دوسرا جسم' کی تقریب رسم اجرا و مشاعرہ میں کیا۔ آئیڈیا کمیونی کیشنز اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے منعقد اس تقریب کی صدارت شعبہ کے صدر اور دلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کی، جبکہ تعارفی کلمات آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے ادا کیے۔ پروفیسر ابن کنول (دہلی یونیورسٹی) اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (جے این یو) نے بطور مہمانان اعزازی شرکت کی اور دیگر معزز مہمانوں میں انجم عثمانی، مظہر محمود، پرویز احمد اعظمی، کلیم الحفیظ، اے یو آصف، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر تنویر حسین، شعیب رضا وارثی، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض وغیرہ شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ عتیق انظر کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ وہ بیک وقت نظم اور غزل دونوں کے شاعر ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے خطاب میں کہا کہ عتیق انظر کی شاعری کلاسیکی روایات اور جدید اسلوب کا حسین سنگم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 فروری 2019

تقدیر

نئی دہلی: میکس ملر مارگ واقع انڈیا انٹرنیشنل انیکسی کے لیکچر ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں ماریشس کے سابق نائب صدر جمہوریہ عبدالرؤف بندھن کی سوانح عمری 'تقدیر' کی رسم رونمائی اہم ترین شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب میں مہمانانِ خصوصی کے طور پر ماریشس کے سابق نائب صدر جمہوریہ عبدالرؤف بندھن، ماریشس کے سابق ہندوستانی سفیر انوپ کمار مدگل نے شرکت کی جبکہ مہمانان اعزازی کے طور پر کتاب کے مترجم عنایت حسین عیدن، روزنامہ راشٹریہ سہارا گروپ کے ایڈیٹر مشرف عالم ذوقی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے سربراہ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے سبھی مہمانان کا استقبال کیا اور کہا کہ ماریشس کو چھوٹا ہندوستان کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کو دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اردو کے فروغ سے کی جانے والی کوششوں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ماریشس میں اردو ڈرامے کا باقاعدہ آغاز عبدالرؤف نے ہی کیا ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے عبدالرؤف بندھن کی سوانح عمری کے حوالے سے کہا کہ اگر کسی انسان کو اپنی تقدیر بدلنی ہے تو اس کتاب کو ضرور پڑھے کیونکہ اس کتاب میں ایک عام شخص کے خاص بننے کے سفر اور اس کی جدوجہد کو دیکھا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مترجم عنایت حسین عیدن نے کہا کہ میں نے اس کتاب کا ترجمہ اپنی اہلیہ بی بی ریحانہ عیدن کے تعاون سے مکمل کیا اور اس کی اصلاح کی ذمے داری پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کو دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب نہ صرف عبدالرؤف کی سوانح عمری ہے بلکہ ماریشس کو جاننے اور سمجھنے کی اہم معلومات بھی ہے۔ عبدالرؤف بندھن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے شروع سے ہی اردو سیکھنے کا اشتیاق رہا ہے اور میں نے ہندوستان آکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور عنایت حسین عیدن کا شکریہ ادا کیا۔ انوپ کمار مدگل سابق سفیر ہند برائے ماریشس نے اپنے خطاب میں کہا کہ ماریشس کے قیام نے کثرت میں وحدت اور جمہوریت کا بہترین سبق دیا اور ذہن و فکر کو مکمل کر دیا اور وہاں کی تہذیب و ثقافت نے بے حد متاثر کیا نیز ماریشس کی جمہوریت کی ایک الگ پہچان ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ ماریشس کی تہذیب و ثقافت بالکل ہندوستان کی طرح ہے یہاں جاکر کبھی کسی ہندوستانی کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ نظامت کے فرائض شفیق ایوب نے انجام دیے۔ آخر میں پروفیسر محمد خواجہ اکرام الدین نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2019

عتیق انظر کے شعری مجموعہ "دوسرا جسم" کا اجراء

وفیات:

نامور سنگھ

نئی دھلی: ہندی کے نامور نقاد اور ادیب نامور سنگھ کا 20 فروری 2019 کو دہلی کے ایمس اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 93 سال کے تھے۔ ذرائع کے مطابق

لودھی روڈ پر واقع شمشان گھاٹ پر بدھ 21 فروری کو آخری رسومات ادا کی گئیں۔ نامور سنگھ کے انتقال سے جہان ادب میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سینئر صحافی اوم تھانوی نے نامور سنگھ کے انتقال پر ٹویٹ کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اوم تھانوی نے کہا کہ ہندی میں پھر سناٹے کی خبر۔ نایاب، ادب میں دوسری روایت کے موجد، ڈاکٹر نامور نگھ نہیں رہے۔ نامور سنگھ کو ہندی کے علاوہ اردو پر خاصی دسترس حاصل تھی۔ سال 1959 میں چکیا۔ چندولی سیٹ سے بھارتی کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لوک سبھا الیکشن لڑنے کی وجہ سے انھیں زندگی بھر بائیں بازو کا مفکر سمجھا جاتا رہا حالانکہ وہ الیکشن ہار گئے تھے۔ بقلم خود، کویتا کے نئے پرتیمان، چھایاواد، واد وواد سمواد، کہانی نئی کہانی، اتیہاس اور آلوچنا، دوسری پرمپرا کی کھوج، پرتھوی راج راسو کی بھاشا ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ وہ ہندی ادب پر اپنی انمٹ چھاپ کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 فروری 2019

خواجہ سید محمد یونس

لکھنؤ: ماہر تعلیم اور مقبول تعلیمی تنظیم ارم ایجوکیشنل سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس کا 4 مارچ کو تین بجے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر قریب 80 سال تھی۔ نماز جنازہ مولانا سید الرحمٰن اعظمی ندوی کی اقتدا میں ادا کی گئی۔ تدفین امر پالی قبرستان میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ اور تدفین میں ہر مکتبہ فکر کے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس بارہ بنکی کے ایک مردم خیز قصبہ میلارائے گنج میں 4 فروری 1939 کو ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میلارائے گنج میں حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ آ گئے جہاں انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی، ایم اے اور فارسی میں ڈاکٹریٹ سمیت دبیر کامل، دبیر فاضل، کے کورس بھی مکمل کیے۔ وہ ایک رجسٹرڈ حکیم بھی تھے۔ ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس کو ان کی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ نے ایوارڈ سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2019

سید اقبال واجد

گیا: ڈاکٹر سید اقبال واجد کا 63 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی دونوں کڈنی فیل ہوگئی تھیں۔ اقبال واجد کی پیدائش رجہت نوادہ بہار میں ہوئی تھی۔ انھوں نے مگدھ یونیورسٹی وبودھ گیا یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں

نے انسان اسکول کشن گنج میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد سعودی عرب کی ایک کمپنی میں ملازمت بھی کی۔ انشائیہ، شاعری، تنقید اور افسانہ نگاری میں ان کا ایک اہم نام تھا۔ ان کی تصنیفات میں جہات (سعودی عرب میں مقیم افسانہ نگاروں کا جائزہ)، دشت رنگ (سعودی رنگ میں مقیم پاکستانی شعرا پر تنقیدی مضامین اور انتخاب کلام)، بہار میں اردو افسانہ، A False Alarm، Your Stress & Anxieties: 19, Islamic Tips to Mange، سیکڑوں کی تعداد میں انھوں نے تنقیدی تجزیاتی مضامین مقتدر رسائل میں لکھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقہ سوگوار ہے۔

عبدالوہاب

دربھنگہ: شہر دربھنگہ کے ممتاز سرجن اور ملت کے ہمدرد ڈاکٹر عبدالوہاب (پیدائش 1931) موہن پور دربھنگہ کا 7 مارچ کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت سے متھلانچل کا علمی، سماجی، ادبی اور سیاسی حلقہ سوگوار ہے۔ ان کی شخصیت غیر معمولی اور منفرد تھی۔ ملی مسائل

پر ان کی نظر گہری تھی۔ ان کی مسیحا نفسی اور غریب پروری کی داستانیں ہر خاص وعام کی زبان پر تھیں۔ وہ طبی سرگرمیوں کے علاوہ فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے جن بیگم صغریٰ حسن میموریل گرلس ہائی اسکول، علامہ اقبال لائبریری، ملت شفاخانہ، زکوٰۃ فاؤنڈیشن کے قیام کے ساتھ محلہ بی بی پاکر میں شاندار الہلال نرسنگ ہوم بھی قائم کیا۔ وہ شہر کے کئی اداروں سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر مرحوم کی خودنوشت 'سوز وساز حیات' فروری 2019 میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 7 مارچ 2019

خراج عقیدت:

سعید احمد منتظر

علی گڑھ: معروف شاعر سعید احمد منتظر کے سانحۂ ارتحال پر بزم کے دفتر 'گل فرقان' جمال پور علی گڑھ میں بزم نوید سخن علی گڑھ کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس میں بزم سے تعلق رکھنے والے شعرا وادبا نے سعید احمد منتظر کے فن اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں خراج محبت پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت استاذ الشعرا اور بزم کے سرپرست ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کی۔ نظامت کے فرائض سید بصیر الحسن وفا نقوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کہا کہ ''مرحوم سے میری پہلی ملاقات سعودی عرب کے شہر جبیل کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ میرے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ وہ ایک خلیق اور خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے یہاں انسانیت کا درد، معاشرے کے دکھ سمجھنے کا سلیقہ، روایت کی پاسداری اور اسلام کے پیغام پر عمل کرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھے انسان تھے بلکہ ان کی فکر ان کی شاعری میں بھی نمایاں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خالص ادبی حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ وہ جہاں خوبصورت اور ادب کے تمام تر تقاضوں پر کھری اترتی ہوئی شاعری کرتے، وہیں ان کے یہاں بہترین ترنم بھی پایا جاتا تھا۔

وہ جب غزل سرا ہوتے تھے تو محفل میں ایک سماں بندھ جاتا تھا اور لوگ ان کی شاعری کی دنیا میں خود کو گم کر لیتے تھے۔ جاوید وارثی نے کہا کہ ''مرحوم کی شاعری نے اہلِ ادب کو خاصا متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے کلام کو بناوٹ اور ثقالت سے دور رکھتے تھے، ان کی سادگی اور سلاست نہ صرف ان کی شاعری کی پہچان تھی بلکہ ان کے مزاج کی بھی آئینہ دار تھی۔ سید عادل فراز نے کہا کہ ''کسی فنکار کا دنیا سے چلے جانا اہل ادب کے لیے دکھ کا سبب ہوتا ہے۔ سعید احمد منتظر بلاشبہ ایک اچھے انسان اور ایک منفرد شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں غزل کے لغوی معانی کی تصاویر بخوبی ملتی ہیں۔ وہ غزل کے جدید دور میں بھی غزل کے روایتی رنگ کے علمبردار تھے۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی تعزیتی پیغام پیش کیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 مارچ 2019

پوروال کالج میں مرزا غالب کو خراجِ عقیدت

کامٹی: سیٹھ کیسری مل پوروال کالج میں 'بھاشا ابھیاس منڈل' کی جانب سے اردو زبان کے مشہور شاعر مرزا غالب کو یاد کیا گیا۔ 2019 میں مرزا غالب کی وفات کو 150 سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں اردو زبان بولی جاتی ہے وہاں غالب کو یاد کیا جا رہا ہے۔ پروگرام کی صدارت کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر اے۔ ایچ انصاری نے کی۔ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر جی۔ ایس ربانی نے مرزا غالب اور زبان کے متعلق اپنی تقریر میں کہا کہ ''بھارت کی زبانیں ہماری تہذیب سے جڑی ہوئی ہیں۔'' ''اگر ہم اپنی مادری زبان کو بہتر ڈھنگ سے استعمال کریں تو ہماری شخصیت میں نکھار آتا ہے۔ مرزا غالب کی غزلیں آج بھی لوگ سنتے ہیں تو سر دھنتے ہیں۔ غالب آج بھی دنیا کے ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی شاعر تھے اور انھوں نے کچھ اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر اے ایچ انصاری نے بھی اپنی صدارتی خطاب میں مادری زبان کو اہم قرار دیا۔ 'بھاشا ابھیاس منڈل' کی صدر ڈاکٹر جی آر ہاشمی، ڈاکٹر رینوکا رائے، ڈاکٹر اظہر ابرار اور پروفیسر محمد اسرار نے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نظامت کے فرائض مزمل اظہر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اور ہدیہ تشکر بی۔ کام سیکنڈ ایئر کے طالب علم محمد کیف نے پیش کیا۔

پریس ریلیز: اظہر ابرار احمد، مہاراشٹر 22 فروری 2019

فراق گورکھپوری

امروھه: اردو دنیا کے مشہور شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے یوم وفات پر بزم زندہ دلانِ امروہہ کی ایک میٹنگ محلہ دربار کلاں میں قمر نقوی کے مکان پر منعقد ہوئی جس

کی صدارت سینئر صحافی ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ میٹنگ میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے یوم وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کہا کہ فراق گورکھپوری کی فکر و بصیرت اور ذوق نظر کی ترتیب میں ہندو معاشرہ اور ہندو فلسفہ کے صالح عناصر سے لے کر مسلم تہذیب اور مذہبیت اور پھر مغرب کے تمام مفکروں اور فنکاروں کی بہترین تخلیقات کے قابل قبول اثرات ہیں۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ فراق گورکھپوری نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں روایت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں مومن کا رنگ غالب ہے۔ ناصر امروہوی نے کہا کہ فراق گورکھپوری کا شمار ان اہم فنکاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فن کی فضا بدلی، ان کی شاعری قوتِ شفا کا مظہر ہونے کے بجائے ایک بیدار ذہن کی پیداوار نظر آئی۔ قمر نقوی نے کہا کہ فراق صاحب نئی غزل کے شاعر ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 5 مارچ 2019

ہندوستان کے جدید تعلیمی نظام میں مولانا آزاد کا رول

نئی دهلی: مدارس اور مکاتب کے ساتھ ساتھ تمام تعلیمی نصابوں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیات کے افکار و خیالات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدارس اسلامیہ سے فارغ ہونے والے بچے اپنے اکابرین کی قربانیوں کو آنے والی نسلوں کو بتا سکیں، اپنے اسلاف اور اکابرین کی اس ملک کو بنانے میں جو قربانیاں ہیں ان کو اس انداز میں بتایا جائے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر سکیں۔ ان خیالات کا اظہار جمعیۃ علما ہند صوبہ دہلی کے صدر مولانا عابد قاسمی نے مشرقی دہلی غازی پور ڈیری فارم کے مدرسہ جامعہ دارالسلام جامع مسجد غازی پور میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان کے جدید تعلیمی نظام میں رول کے عنوان سے منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس کی سرپرستی امام جامع مسجد غازی پور حافظ منصور احمد، صدارت مہتمم جامعہ دارالسلام اور صدر ترلوک پوری حلقہ جمعیۃ علماء ہند کے قاری محمد عمر نے کی۔ اس موقعے پر قاری محمد فاروق نے کہا کہ جب تک قوم تعلیم سے روشناس نہیں ہوگی اس وقت تک زمانے سے قدم ملا کر چلنے کی اہل نہیں ہوگی۔ مولانا شفیع الرحمٰن نے کہا کہ مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا، انھوں نے اپنے خطبات اور مضامین میں یہ بتایا کہ مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کے تصور کو عام کیے بغیر آزادی ممکن نہیں، مولانا آزاد قومی یکجہتی، مشترکہ تہذیب، مشترکہ قومیت، اور ہندو مسلم اتحاد کے حق میں تھے۔ آخر میں قاری محمد عمر نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ مولانا عابد قاسمی کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 مارچ 2019

ناصر کاظمی

آگرہ: اردو کے نامور شاعر ناصر کاظمی کی استعاراتی شاعری عصر حاضر کے نوجوان شعرا کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ ناصر کاظمی نے نہ صرف یہ کہ استعاراتی زبان کا کثرت کے ساتھ استعمال کیا بلکہ انھوں نے حزنیہ انداز بیان اختیار کر کے ایک نیا انداز شاعری ایجاد کیا۔ ان خیالات کا اظہار جناب کلام احمد نے بزم سخن نما کی جانب سے منعقد ایک ادبی نشست میں کیا۔ آج ناصر کاظمی کے یوم وفات کے موقعے پر بزم سخن نما کے دفتر میں منعقد ادبی نشست میں ناصر کاظمی کو پر جوش خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تقریر کرتے ہوئے علامہ احمر جلیسری نے بتایا کہ ناصر کاظمی کا انتقال 2 مارچ 1972 کو پاکستان میں ہوا تھا۔ وہ آٹھ دسمبر 1925 کو انبالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو شاعری کو کئی اہم کتابوں کا تحفہ عطا کیا۔ چھوٹی بحروں میں شاعری کا ان کا انداز اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ سہیل لکھنوی نے ان کی تخلیقی قوت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ناصر کاظمی نے، پہلی بارش، خشک

چشمے کے کنارے، چار دیوان اور سرمایہ غزل جیسی متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں جن میں ان کی شاعری کی خصوصیات صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ دل تاج محلی نے کہا کہ ناصر کاظمی اپنے عہد کی ایک نمائندہ آواز تھے۔ انھوں نے نوجوانوں کے مسائل اور ہند و پاک کی تقسیم کے مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 مارچ 2019

نیر قریشی گنگوہی

سہارنپور: بزرگ شاعر و ادیب اور سماجی خدمت گار احمد سعید عرف نیر قریشی کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد قصبہ گنگوہ کے مدرسہ فیض العلوم یاسینہ میں کیا گیا جس میں مرحوم نیر قریشی کے لیے ایصال ثواب کر کے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔ دریں اثنا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ماہنامہ جہاں نما کے مدیر صوفی ظہیر اختر نے کہا کہ نیر قریشی کا سیاست، سماج اور ادب سے گہرا رشتہ تھا۔ وہ ستھرے شعری ذوق کے حامل ایک ادب پرور انسان تھے۔ جامعہ اشرف العلوم رشیدی کے استاد مفتی محمد ساجد کھجناوری نے کہا کہ نیر قریشی کی شاعری سہل ممتنع کی مصداق ہے۔ وہ چھوٹے اور مختصر جملوں میں اپنا مدعا بیان کرنے کا فنی سلیقہ رکھتے تھے۔ نسیم انور ایوبی نے کہا کہ نیر قریشی گنگوہ کی ادبی اور شعری خانقاہ کے گدی نشین تھے۔ ان کی شرکت سے ادبی مجلسوں کو وقار ملتا تھا۔ نیر قریشی کے بڑے بیٹے اور ان کے ادبی و نسبی وارث عمران عظیم نے جذباتی لب ولہجہ میں کہا کہ نیر قریشی کی وفات سے مجھے دوہرا صدمہ جھیلنا پڑا ہے۔ وہ میرے مربی والد ہی نہیں تھے بلکہ استاد اور سب کچھ تھے۔ انھوں نے تقریباً نصف صدی تک شعر و ادب کے لیے تعمیری جد و جہد کی اور نصف درجن سے زائد قلمی سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ تعزیتی نشست کے صدر مولانا وجاہت محمد قریشی نے کہا کہ احمد سعید عرف نیر اپنے نام کی طرح خوبیوں کا بھی حسین مجموعہ تھے۔ وہ نیک سیرت، پاکیزہ طبیعت اور متواضع انسان تھے۔ ان کی شاعری بھی پاکیزہ افکار و احساسات کی ترجمان ہے جس سے سماج کی صالح بنیادوں کو استحکام ملتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 مارچ 2019

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فکر و فن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

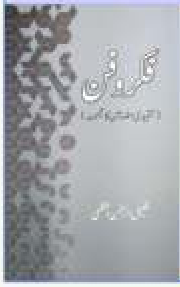

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 205

قیمت: 110 روپے

مقدمہ کلام آتش

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 134

قیمت: 90 روپے

حیدر جی کی کہہ مکرنیاں

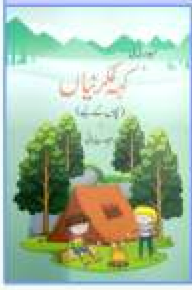

مصنف: حیدر بیابانی

صفحات: 37

قیمت: 15 روپے

منی کے گیت

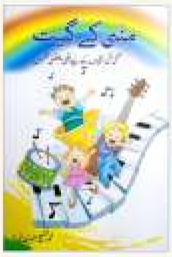

مصنف: محمد شفیع الدین نیر

صفحات: 50

قیمت: 20 روپے

چندا ماموں

مصنف: مظفر حنفی

صفحات: 21

قیمت: 30 روپے

راجندر منچندا بانی (مونوگراف)

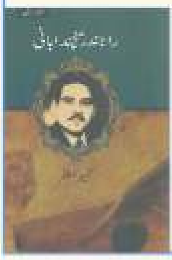

مصنف: عمیر منظر

صفحات: 122

قیمت: 76 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

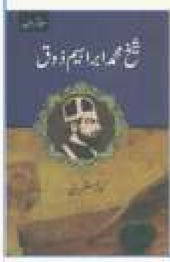

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 109

قیمت: 72 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

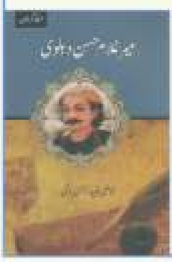

مصنف: عبید الرحمٰن ہاشمی

صفحات: 128

قیمت: 77 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, April-2019, Vol.21, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/03/2019**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

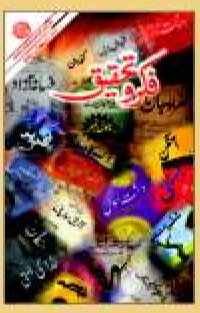

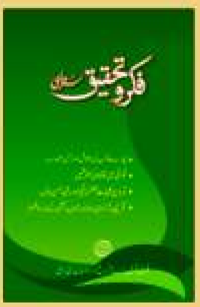

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025